ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی حیات اور نگارشات

مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو

جون 2021ء

مقالہ نگار

عبیدالرحمٰن

Reg. No. 15HUPH07

نگراں

ڈاکٹر عرشیہ جبین

اسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اُردو
اسکول آف ہیومانیٹیز
یونیورسٹی آف حیدرآباد
حیدرآباد 500046
تلنگانہ، انڈیا

DR M NASEEM AAZMI HAYATH AUR NIGARISHAT

A thesis submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

in

Urdu

Submitted by

OBAIDUR RAHMAN

Reg. No. 15HUPH07

Supervisor

Dr. Arshia Jabeen

Associate Professor

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046
Telangana, India

June-2021

Date: 17-06-2021

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled **"DR M NASEEM AAZMI HAYATH AUR NIGARISHAT"** submitted by **OBAIDUR RAHMAN** bearing Reg. No**. 15HUPH07** in partial fulfillment of the requirements for the award of Doctor of Philosophy in **URDU** in the School of Humanities is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for award of any degree or diploma. Part of this thesis has been.

A. Published in the following publications.

1. Dr. M. Naseem Azmi Ka Tanqeedi Sheyar (Irteaash-ISSN: 2320-2416)
2. Akbar Allahabadi Ki Tanziya Wa Mizahiya Shayari (Mahnama Telangana, Hyderabad-ISSN: 2456-7140)

B. Presented in the following Conferences.

1. "Ismat Chughtai Ki Reportaz Nigari" in Two-day National Seminar on "Rajinder Singh Bedi and Ismat Chughtai: in Perspective of Progressive writers' Movement" Conducted by Department of Urdu (HCU) on 8^{th} – 9^{th} February, 2017.
2. "Dr Syed Muhiuddin Quadri Zore-Ba haisiat Mahire Lisaniyat" in Two-day National Seminar on "Dr Syed Muhiuddin Quadri Zore: Writing, Criticism & Research" Conducted by Department of Urdu (HCU) on 13^{th} & 14^{th} March, 2018.

Further, the student was exempted from doing coursework (recommended by Doctoral Committee) on the basis of the following courses passed during his M.Phil program and the M.Phil degree was awarded.

SL No.	Course Code	Title	Credits	Grade	Pass/Fail
1	UR 701	Research Methodology	4.00	B+	Pass
2	UR702	Practical Criticism	4.00	A	Pass
3	UR721	Textual Criticism	4.00	A	Pass
4	UR780	Dissertation	12.00	B+	Pass

Supervisor **Head of the Department** **Dean School of Humanities**

DECLARATION

I, **OBAIDUR RAHMAN** hereby declare that this thesis entitled **"DR M NASEEM AAZMI HAYATH AUR NIGARISHAT"** submitted by me under the guidance and supervision of **Dr Arshia Jabeen** is bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shodhganga / INFLIBNET.

Date: 17-06-2021

Name: **OBAIDUR RAHMAN**

Signature of the Student

Reg. No.15HUPH07

مدیر اعلیٰ

ظہیر دانش عمری

مدیر

ابوبکر ابراہیم عمری

نائبین

سردار ساحل، شیخ اسماعیل افضل حیدرآبادی

کتابی سلسلہ

ارتعاش

4

ISSN:2320-2416

فہرست

۱: مضامین / مقالات / تبصرے

۱) یہ خلد بریں ارمانوں کی	مولانا حفیظ الرحمٰن اعظمی عمری	6
۲) امجد حیدر آبادی کی رباعی گوئی	ڈاکٹر محمد امین اللہ	9
۳) بیدی کا فن اور نفسیاتی عوامل	ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم	14
۴) جیلانی بانو کا ناول ''بارشِ سنگ''	ڈاکٹر محمد سمیع الدین	18
۵) کیفی اعظمی ایک فلمی نغمہ نگار	ڈاکٹر عشرت ناہید	24
۶) علامہ شاکر نائطی کی شاعری	کلیم اللہ	28
۷) خاکہ (مرقع)۔۔ہیئت اور ماہیئت	ڈاکٹر ستار ساحر	33
۸) پروفیسر ستار ساحر اور ان کی غزل	ڈاکٹر کے۔ امتیاز احمد	36
۹) ایاز رسول نازکی کی کالم نگاری	ارشاد آفاقی	38
۱۰) محمد حسین آزاد بحیثیت تذکرہ نگار	محمد سلیمان حجام	41
۱۱) اکیسویں صدی کی ادبی صحافت	عبدالحی	47
۱۲) منٹو اور تقسیم	محمد سرور لون	57
۱۳) دیپک کنول: ایک منفرد افسانہ نگار	امتیاز احمد	62
۱۴) کتاب ''منبر کی صدا'' ۔ تعارف اور تبصرہ	محمد فہیم الدین نادر عمری	65
۱۵) زلیخا حسین	شکیلہ کے پی	69
۱۶) معرفی گلستان ناز	محمد شفیق احمد	72
۱۷) مشتاق احمد یوسفی کی طنز و مزاح نگاری	امتیاز حسین شاہ	76
۱۸) ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کا تنقیدی شعار	عبیدالرحمٰن	80
۱۹) انفارمیشن تکنالوجی اور اردو۔ روزگار کے مواقع	ڈاکٹر محمد نثار احمد	85

ISSN 2456-7140

اگست 2018ء

ماہنامہ تلنگانہ حیدرآباد

قیمت : ماہانہ -/20 روپے

سالانہ : -/220 روپے

ہریتا ہارم کے ایک اور پر جوش مرحلہ کا آغاز

ماہنامہ **تلنگانہ** حیدرآباد

Vol-03 Issue-07 AUGUST .2018

جلد 3 شمارہ 07 اگست 2018ء

ارونڈ کمار، آئی اے ایس

کمشنر : محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ

ایڈیٹر

سید شاہ حبیب الدین قادری

ایم اے، ایم فل، پی جی ڈی جے

(موبائیل 9949351520)

قیمت فی شمارہ -/20 روپے / سالانہ اشتراک -/220 روپے

* معیاری اور غیر مطبوعہ تخلیقات روانہ کرنے کا پتہ:

ایڈیٹر، اردو ماہنامہ ''تلنگانہ'' سماچار بھون، فرسٹ فلور،

اے سی گارڈز، حیدرآباد 500028 فون 23399048 (Ext:122)

* اس شمارہ میں اہل قلم حضرات نے انفرادی طور پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے لازمی طور پر حکومت کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

* سالانہ خریداری کے لیے منی آرڈر مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ کیجیے:

اکاؤنٹس آفیسر دفتر محکمہ اطلاعات وتعلقاتِ عامہ،

فرسٹ فلور، سماچار بھون، اے سی گارڈز حیدرآباد - 500028

طباعت: شری بالاجی گرافکس، باغ لنگم پلی، حیدرآباد - 500044

اشاعت: کمشنر محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ، سماچار بھون، اے سی گارڈز، حیدرآباد - 28 سے شائع کیا۔

ای میل:

telanganaurdu@gmail.com

ویب سائٹ:

ipr.tg.nic.in

فہرست

اداریہ		4
وزیراعظم کا نیا 15 نکاتی پروگرام	سید عبداللہ قادری	5
یوم آزادی کا جشن	شاذیہ بیگم	8
ہندوستان کی آزادی کے چند متوالے	محمد ندیم محی الدین	10
عیدالاضحیٰ فضیلت واہمیت	محمد مخدوم صابر	13
سرپور کاغذمل کی دوبارہ کشادگی	عبدالحامد (منان)	17
تابوت	محمد ارشد	19
اتفاق	ڈاکٹر حامد بن علی حضرمی	22
دروازہ بند کردو	فاطمہ تاج	23
اخبارات میں طنز ومزاح کی روایت	ڈاکٹر اسمٰعیل خان	26
بچوں کے ادب میں خواتین کا حصہ	ڈاکٹر سیّد اسرارالحق سبیلی	32
غزل	شفیع اقبال	37
جاسوس دنکر کدم کی تحقیقات	ترجمہ: محمد کلیم محی الدین	38
اکبرالہ آبادی کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری	عبیدالرحمٰن	42
اردگرد اردو:	اویس احمد بٹ، عارفہ رخسانہ	46
ادبی کوئز	ڈاکٹر محمد انورالدین	54

☆☆☆

Edited,Printed and Published by **Syed Shah Habeebuddin Quadri** on behalf of Commissioner, Information and Public Relations Department (On behalf of Govt. of T.S.) Published at Samachar Bhavan, A.C. Guards, Hyd. Printed at Balaji Graphics, 1-8-1-/8/26, Cellar and IIIrd Floor, Housefed Bhavan, Bagh-e-Lingampally, Hyderabad-44.

UNIVERSITY OF HYDERABAD
SCHOOL OF HUMANITIES
DEPARTMENT OF URDU

Certificate

This is to certify that Prof. / Dr. / Mr. / Ms. Obaidur Rahman

Participated in the 2-Day National Seminar on Rajinder Singh Bedi and Ismat Chughtai : in Perspective of Progressive Writers' Movement

Date : 08th - 9th February 2017

Presented / ~~Participated~~ a Paper Entitled Ismat Chughtai Ki Reportaz Nigari

Dr. Arshia Jabeen
Seminar Coodinator

Prof. Muzaffer Ali Shahmiri
Head, Dept. of Urdu

URDU ASSOCIATION ★ Department of Urdu, UoH ★
Established in 1981

UNIVERSITY OF HYDERABAD
Department of Urdu

Dr. زور ZORE FOUNDATION

URDU ASSOCIATION

1st Ghalib Research Scholars National Seminar
Dr. Syed Mohiuddin Quadri Zore: Writing, Criticism & Research

CERTIFICATE

This is certify that Mr./Ms./Miss OBAIDUR RAHMAN *participated/presented*

a paper entitled "ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور - بہ حیثیت ماہر لسانیات" */presided*

over a technical session in National Seminar held on 13th to 14th March 2018.

Dr. Nishath Ahmed
Advisor

Obaidullah Haroon
President

Prof. Habeeb Nisar
Head

12؍جنوری 1958ء–17؍اکتوبر 2019ء

فہرست ابواب

پیش لفظ		05
باب اوّل:	مئوناتھ بھنجن کا تاریخی، معاشرتی اور تعلیمی پس منظر	09
باب دوم:	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: سوانح و شخصیت	19
باب سوم:	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بحیثیت شاعر	71
باب چہارم:	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تعلیمی خدمات	117
باب پنجم:	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تحقیقی و تنقیدی خدمات	211
باب ششم:	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی صحافتی خدمات اور ادبی گزٹ کا اشاریہ	273
اختتامیہ		336
کتابیات		345

پیش لفظ

پیش لفظ

سب سے پہلے میں اپنے خالق حقیقی مالک دو جہاں کی بارگاہ میں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یونیورسٹی آف حیدرآباد میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے اور مقالہ لکھنے کا موقع عنایت فرمایا۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اردو ادب میں ایک صحافی، ادیب و شاعر، محقق و ناقد، ماہر تعلیم اور مفکر تعلیم کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے تعلیم اور طریقۂ تعلیم کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، اس کی کمیوں اور خامیوں پر مضامین اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ شعر و شاعری سے اپنا رشتہ استوار رکھا تھا۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ ادب نکھار اور عالمی ادبی گزٹ ماہنامہ اور سالنامہ رسالہ بھی نکالا۔ ان جملہ خدمات کو دیکھتے ہوئے میں نے نسیم اعظمی پر پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کیا، اپنی نگراں وصدر شعبۂ اردو اور تمام اساتذہ کی منظوری کے بعد میرے تحقیقی مقالہ کا عنوان ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی حیات اور نگارشات'' طئے پایا۔

میں نے اپنی نگران کے مشورہ سے اس مقالہ کو چھ ابواب میں منقسم کیا ہے۔

باب اول ''مئو ناتھ بھنجن کا تاریخی، معاشرتی اور تعلیمی پس منظر'' کے عنوان کے تحت رکھا گیا ہے تاکہ نسیم اعظمی کے عہد و ماحول ہمارے سامنے آسکے اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دے سکے۔

باب دوم ''نسیم اعظمی: سوانح و شخصیت'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب کو دو ذیلی حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ حصہ (الف) میں نسیم اعظمی کی ولادت تعلیم و تربیت، ملازمت، شادی، اولاد، علمی و ادبی سرگرمیاں، ان کی تصانیف، انعامات و اعزازات اور ان کی وفات سے متعلق تفصیلات رقم کی گئی ہیں۔ حصہ (ب) ان کی شخصیت سے متعلق ہے جس میں ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب سوم ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بحیثیت شاعر'' کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں ان کے مجموعہ کلام ''میزانِ آگہی'' اور ''فیضانِ آگہی'' کے حوالہ سے ان کی شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھا باب ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تعلیمی خدمات'' پر محیط ہے۔ان کی اصل حیثیت ایک ماہر تعلیم کی ہے۔اس باب میں پہلے تعلیم کے معنی و مفہوم کی وضاحت پیش کرتے ہوئے تعلیم کی اقسام اور مقاصد کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔نسیم اعظمی کی تعلیمی خدمات کو سمجھنے کے لیے ہندوستان کے تعلیمی پس منظر کا احاطہ کرتے ہوئے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، سرسید احمد خاں، بدرالدین طیب جی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ساتھ ہی آزادی کے بعد مسلمانوں میں تعلیمی انحطاط اور تدارک پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور نسیم اعظمی کی تعلیم پر لکھی ہوئی تمام کتابوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ان کی تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب پنجم ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تحقیقی و تنقیدی خدمات'' کے عنوان کے تحت رکھا گیا ہے۔اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے حصے میں تحقیق کی اصطلاحات، تعریفات، مقاصد، طریق کار اور محقق کے اوصاف کو بیان کرتے ہوئے ان کی تحقیقی کتابوں کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں تنقید کی تعریف، اصطلاحات پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی تنقیدی کتابوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

باب ششم ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی صحافتی خدمات'' کے عنوان سے ہے۔یہ باب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں صحافت کے تعلق سے بات کرتے ہوئے ان کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے جب کہ دوسرے حصے میں اشاریہ کی تعریف اور اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے موصوف کا عالمی اردو مجلّہ ''ادبی گزٹ'' کا عمومی اشاریہ پیش کیا گیا ہے۔

آخر میں خلاصہ پیش کیا گیا ہے جو ''اختتامیہ'' کے عنوان سے ہے۔اس اختتامیہ میں ان تمام باتوں کو جو نسیم اعظمی کی شاعری اور نثر نگاری سے تعلق رکھتی ہیں ان کا احاطہ بڑے اختصار سے پیش کرتے ہوئے ان کے سماجی، تخلیقی اور ادبی مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔سب سے آخر میں کتابیات کے عنوان کے تحت ان کتابوں اور رسالوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے اس مقالہ کی تیاری میں استفادہ کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے میں اپنی نگراں ڈاکٹر عرشیہ جبیں صاحبہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مجھ ناچیز کے لیے ہمیشہ وقت نکالا۔ابواب کی ترتیب سے لے کر مقالہ کی تکمیل تک ، ہر قدم پر کمال محبت وشفقت اور توجہ کے ساتھ میرا تعاون کیا اور میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی فرمائیں،ان کا اپنا پن میرے لیے بہت قیمتی ہے۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر فضل اللہ مکرم صاحب اور جملہ اساتذۂ کرام کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے وقتاً فوقتاً میری رہنمائی کی اور مفید مشوروں سے نوازا۔

استاد محترم ڈاکٹر آفاق ندیم خان کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے ایم فل کے انٹرویو میں شرکت کے لیے میری ہر ممکنہ کوشش و مدد کی اور بھوپال سے یونیورسٹی آف حیدرآباد آنے اور فوراًلوٹ کر بھوپال میں بی ایڈ کے آخری پرچے میں شریک ہونے کا راستہ ہموار کیا۔انھیں کی حوصلہ افزائی کا ثمرہ ہے کہ میں آج اعلیٰ تعلیم کا مرحلہ طے کر پا رہا ہوں۔

میں اپنے تمام اساتذہ کرام کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے مخصوص طریقۂ تعلیم سے مجھ میں اردو زبان وادب سے دلچسپی پیدا کی اور اپنی نیک خواہشات سے بھی نوازا۔

ناسپاسی ہوگی اگر ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کا شکریہ ادا نہ کروں۔انھوں نے موضوع کے طے ہونے کے بعد مجھے انٹرویو دیا اور ممکنہ حد تک مدد فرمائی۔طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ آخری وقتوں میں میری مدد نہ کر سکے لیکن انھوں نے جتنا مواد دیا وہ پورے خلوص اور محبت سے دیا، میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، اللہ سے دعا ہے کہ وہ جزائے خیر دے اور جنت الفردوس میں انھیں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

میں اپنے والدین ، بھائیوں اور بہن کا احسان مند اور شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں اور قربانیوں سے میں یہاں تک پہنچا اور ان کی حوصلہ افزائی سے اپنے مقالہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ اپنے تمام افراد خاندان، رشتہ داروں اور دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں خاص کر ظہیر حسن ظہیر اور عدیلہ نسیم کا جن کی محبتوں،شفقتوں، دعاؤں اور ہمت افزائی کی بدولت میں اس منزل تک آسکا۔

آخر میں اپنی مرحومہ بیوی ''ثناء جبیں'' کا محبت دل سے شکریہ ادا کر رہا ہوں، اس وقت ہاتھوں میں رعشہ طاری ہو رہا ہے، سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کہوں تو کیا کہوں اور لکھوں تو کیا لکھوں، پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کے دس ماہ بعد وہ میرے نکاح میں آئی، نکاح میں آنے کے بعد حصول تعلیم کی اہمیت و افادیت کے تئیں میری حوصلہ افزائی کرتی رہی اور ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ حصول تعلیم کی مصروفیات کی وجہ سے نکاح کے بعد رخصتی نہ لے سکا تھا لیکن رخصتی کے دن متعین ہونے سے دس دن قبل میری پہلی ملاقات اس سے بنارس کے سبھم ہاسپٹل میں ہوئی جہاں ڈاکٹروں نے مجھ سے یہ کہا کہ بیٹا وہ تمہاری قسمت میں نہیں ہے کیوں کہ اس کے دونوں گردے فیل ہو چکے ہیں۔ ڈائیلسس کا مرحلہ تیرہ ماہ چلا، اس دوران میرا تحقیقی مقالہ التوا میں پڑا رہا۔ آخر کار وہ میرے مقالہ کے تکمیل سے پہلے ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئی۔ اللہ اس کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ (آمین)

عبیدالرحمٰن

ریسرچ اسکالر

یونیورسٹی آف حیدرآباد

جون 2021ء

باب اول

مئو ناتھ بھنجن کا تاریخی، معاشرتی اور تعلیمی پس منظر

مئوناتھ بھنجن کا تاریخی، معاشرتی اور تعلیمی پس منظر

مئوناتھ بھنجن مشرقی اتر پردیش کا مشہور اور قدیم ترین قصبہ تھا اور اب شہر ہے اس کو دستکاروں، محنت کشوں اور کاشت کاروں نے اپنا مسکن بنایا اور پارچہ بافی میں مئو کو بہت شہرت حاصل ہے اور یہاں کی عمومی صنعت پارچہ بافی ہی ہے اگر چہ دوسری چھوٹی چھوٹی اور بھی صنعتیں ہیں کیوں کہ شاہجہاں بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا کی جاگیر میں جب یہ علاقہ آیا تھا تو اس نے تقریباً 1629ء میں اپنے توشہ خانے اور اپنی پسند کے مخصوص کپڑے کی تیاری کے لیے کپڑے بننے کے کارخانے لگوائے تھے، چنانچہ حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے یہاں کے لوگوں نے پارچہ بافی میں کمال حاصل کیا اور اس کا خوب شہرہ ہوا۔ سید سلیمان ندوی اس کے بارے میں کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''یہ قصبہ شاہزادی جہاں آرا کی جاگیر تھا۔ اس کا نام جہاں آباد رکھا گیا۔ شاہزادی نے اپنے لیے کپڑے بننے والے بہترین بافندے کا ریگر جمع کیے اور جامع مسجد بنوائی۔'' 1

حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے کپڑے کی صنعت کو یہاں خوب مقبولیت رہی اور یہی وجہ ہے کہ بابائے قوم مہاتما گاندھی (موہن داس کرم چند گاندھی) تو اسے ہندوستان کا جاپان کہتے تھے جب کہ پہلے وزیر اعظم اور معمار قوم پنڈت جواہر لعل نہرو اسے ہندوستان کا مانچسٹر کہا کرتے تھے۔

ہندوستان کے مشہور مورخ مولانا ضیاء الدین برنی عہد خلجی میں اس کی صنعتی مرکزیت پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''علاء الدین خلجی (1296-1316) کے دور اقتدار میں سترہ ہزار (17000) کے قریب شاہی اور دستکاروں میں بافندگان کی تعداد

غالب تھی۔ مختلف پارچہ جات میں سوتی (کرپاس) کپڑا سب سے زیا
دہ سستا تھا۔ دہلی اور علی گڈھ کا تن زیب گردونواح غالباً مئو اعظم گڑھ کا
مشروع اور صلاحیہ اور شیریں نام کے کپڑے عام اور ہر دل عزیز
تھے۔'' 2

تاریخی اعتبار سے بھی مئو کو اہمیت حاصل ہے یہ بستی کافی قدیم ہے، کہا جاتا ہے کہ سید سالار مسعود غازیؒ 421ھ مطابق 1030ء میں تبلیغی مہم سے شروع ہوتا ہے، مجاہدین کا ایک تبلیغی دستہ یہاں آیا۔اس دستہ کے سالار شاہ ملک طاہر تھے وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ آئے اور یہیں بس گئے، اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرنے لگے۔ یہاں اسلام کی اشاعت میں انھیں کس طرح کے مصائب جھیلنے پڑے اس کا تاریخی طور پر تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مومن محی الدین لکھتے ہیں:

اس زمانے میں قصبہ ایک نٹ بھنجن کے قبضے میں تھا۔ جو بڑا ظالم اور
سرکش تھا۔ باشندگان قصبہ اس کے جبر وظلم سے نالاں تھے۔ملک طاہر کی
ملکوتی صفات اور دعوت وتبلیغ وارشاد اور اسلام کی عالمگیر تعلیم اخوت و
مساوات کے انسانی رویئے نے قصبہ کے باشندوں کی قلب ماہیئت
کردی اور آہستہ آہستہ لوگوں کے سینے اسلام کے لیے کھلنے لگے۔نتیجہ یہ
نکلا کہ نٹ بھنجن کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور شاہ ملک
طاہر سے متصادم ہوا انجام کار وہ ظالم اور سرکش اپنے حواریوں کے ساتھ
سرنگوں ہوا اور قصبہ پر شاہ ملک طاہر کا عمل دخل ہوگیا اور حاکم وقت نے
یہ قصبہ ان کی جاگیر میں دیدیا۔۔۔بہت جلدی یہ قصبہ مسلم اکثریت والا
بن گیا۔۔۔قصبہ کے مشرقی حصہ میں ملک طاہر بابا کا روضہ ہے۔۔۔
آپ ہی کے نام سے وہ محلّہ ملک طاہر پورہ اور روضہ کے نام سے موسوم و
معروف ہوا۔شاہ ملک طاہر کے بھائی ملک قاسم نام سے دوسرا محلّہ قاسم
پورہ موسوم ہے۔قاسم پورہ چھوٹے بڑے سات پوروں پر مشتمل
ہے۔اس لیے اسے قاسم پورہفت پورہ کہا جاتا ہے۔'' 3

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اپنی کتاب ''آثر انصاری حیات اور خدمات'' میں جامع انداز میں ضلع مئو کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''10/نومبر 1801ء مطابق 1214ھ کو نواب سعادت علی خاں اور برطانوی گورنر ویلزلی کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے چکلہ اعظم گڑھ مع اپنے پرگنہ جات کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ضلع گورکھپور میں شامل کر دیا گیا۔ 1820ء مطابق 1226ھ میں اس کا مغربی حصہ جونپور میں اور مشرقی حصہ غازیپور میں چلا گیا اور مئوناتھ بھنجن ضلع غازی پور کا حصہ بن گیا۔ 18/دسمبر 1832ء کو اعظم گڑھ مستقل ضلع قرار پایا۔ 1820ء میں اس کے جو علاقے جونپور اور غازیپور ضلعوں میں شامل کر دیے گئے تھے وہ بھی اسی ضلع اعظم گڈھ میں شامل کر دیے گئے ،اسی طرح 772ھ سے تقریباً پونے پانچ سالوں تک یہ ضلع کسی نہ کسی صورت میں مسلم فرمانرواؤں کے زیر اثر رہا۔ 1801ء سے 18020ء تک مئوناتھ بھنجن ضلع گورکھپور 1820ء سے 1823ء تک ضلع غازیپور 1823ء سے 1989ء تک ضلع اعظم گڑھ کا حصہ رہا۔ 1989ء میں جب مئو ضلع کا وجود ہوا تو مئوناتھ بھنجن ضلع مئو کا صدر مقام قرار پایا۔'' 4

''مئو: شہر ہنرواراں'' کے مصنف ڈاکٹر شکیل احمد نے ضلع مئو کا جغرافیائی تعارف ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''مئو شہر 19/نومبر 1988ء سے پہلے اعظم گڑھ ضلع کا حصہ اور محمد آباد گوہنہ تحصیل سے وابستہ تھا۔ علاقائی ممبر پارلیمنٹ اور سابق مرکزی وزیر کلپناتھ رائے کی جدوجہد کی بدولت 19/نومبر 1988ء سے یہ نئے ضلع کا صدر مقام بنا۔ شہر کا نام مئوناتھ بھنجن اور ضلع کا نام مئو ہے۔ یہاں کی پارلیمانی سیٹ گھوسی حلقہ کے نام سے کسی زمانے میں

کمیونسٹ سیاست کا مرکز تھی۔ مئوضلع میں چار تحصیل مئوصدر، محمد آباد گوہنہ، گھوسی اور مدھوبن ہیں۔ چار سیٹیں مئوصدر، گھوسی، مدھوبن اور محمد آباد گوہنہ ہیں۔ 9 ترقیاتی بلاک۔ 9 نیائے پنچایتیں 696 گرام پنچائیتیں اور 1644 گاؤں ہیں۔ ضلع کا رقبہ 1,71,459 ہیکٹر ہے۔ درجہ حرارت عموماً چھ ڈگری اور چوالیس ڈگری کے درمیان رہتا ہے۔ ضلع کی کل آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے۔ مئوشہر کی آبادی تقریباً ساڑھے تین لاکھ ہے جس میں اکثریت بنکر برادری کی ہے۔'' 5

مئو ایک ایسا خطہ ارضی ہے جہاں کثیر آبادی ہندو و مسلمان کی مشترکہ تہذیب وثقافت پر مشتمل ہے اور زمانہ قدیم سے جب کہ نفرت وعداوت کے بیج نہیں بوئے گئے تھے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک و شہیم ہونے اور ایک دوسرے کے کام آنے کا عام مزاج تھا، ہر ایک اپنے مذہبی معاملات میں بالکل آزاد اور شدت کے ساتھ اس پر عامل تھا۔ کسی کو کسی کے مذہبی امور کی وجہ سے کوئی عداوت ودشمنی نہیں تھی بلکہ ہر ایک اس کا پاس ولحاظ رکھتا تھا کہ دوسرا اپنے امور کو بحسن وخوبی انجام دے سکے۔

پھر مرور ایام کے ساتھ ساتھ حالات نے کروٹ لی اور فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے شیرازہ بکھر چکا ہے اور ہم آہنگی پارہ پارہ ہو چکی ہے۔

مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بنکروں (پارچہ باف) کی ہے جو اپنے ہاتھوں سے کپڑے تیار کرتے ہیں، اس طرح ہر گھر میں ''ہتھ کرگہ'' یعنی بغیر بجلی کی مدد سے کپڑے تیار کرنے کی مشین زمانہ ماضی میں پائی جاتی تھی (اور اب بجلی سے چلنے والے ''پاور لوم'' اس کی ترقی یافتہ شکل میں موجود ہیں)۔ اس طرح گھر پر روزی روٹی کا بندوبست ہو جانے کی وجہ سے اقتصادی اعتبار سے لوگ بڑے خوش حال تھے، عورتیں اور بچے سبھی اپنے کام میں مگن اور اپنی مخصوص زندگی پر قانع تھے۔ قدیم زمانے میں رزق کی طلب میں ادھر ادھر کی خاک چھاننے کا تصور بھی نہ تھا۔ لوگوں کے اندر دین داری و دیانت داری تھی، صرف اسلامی ماحول کے تناظر میں اتنی تعلیم سیکھنے کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی جس سے قرآن وغیرہ پڑھنا آسان ہو جائے اور دیگر ضروریات زندگی کے لیے تھوڑی بہت اردو اور ہندی بھی سیکھ لیتے تھے۔ عموماً اسی طرح کی مئو کی صورت حال

تھی، چند چھوٹے بڑے تاجر بھی تھے اور بعض گھرانے اس وقت کے تقاضے کے لحاظ سے جدید تعلیم سے آراستہ بھی تھے لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔

پھر حالات بدلے اور صنعت وحرفت پر زوال آنا شروع ہوگیا اور سابقہ خوشحالی دن بہ دن رخصت ہونے لگی، ادھر دوسری قومیں لکھنے پڑھنے میں لگی رہیں جس کی وجہ سے ترقی کرتی گئیں۔

مئو میں تعلیم کے تعلق سے مذہبی رجحان وہی رہا ہے جو عام جگہوں پر زمانہ قدیم سے رہا ہے چونکہ جب مذہب کی اصطلاح میں تعلیم کا لفظ مطلقاً بولا جاتا ہے تو اس سے مذہبی تعلیم یعنی قرآن وحدیث کی تعلیم مراد ہوا کرتی ہے حالاں کہ وہ تمام علوم ان دونوں بنیادی ماخذوں کو سمجھنے میں معاون بنیں وہ سب بھی مطلوب ومقصود ہیں، کیوں کہ یہ ظاہری بات ہے کہ مذہب اسلام قیامت تک کی انسانیت کے لیے راہنما ہے تو اسی طرح اس کی تعلیم بھی ابدی اور عالمی ہی ہونی چاہیے جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ موقع ومحل اور زمانہ کے لحاظ سے ان تمام مروجہ کو سیکھنا بھی ضروری ہے جو ان دونوں کے خادم کی حیثیت کے ہیں۔

مگر مذہبی رجحانات کے حاملین نے تعلیم کی اس وسعت ونظر انداز کردیا اور اس کو بہت ہی محدود دائرہ میں محصور کردیا، کچھ تو اس لیے کہ کچھ حالات ایسے بن جاتے ہیں کہ بعض چیزیں فی نفسیہ خراب نہیں ہوتیں لیکن موقع کی مناسبت سے خراب بن جایا کرتی ہیں اور اس وقت اس سے پرہیز کرنا اولیٰ وبہتر ہوتا ہے اور کچھ اس لیے بھی کہ وہ حضرات عموماً ایسے ماحول کے پروردہ ہوتے ہیں جہاں ان کی سوچ کا دائرہ محدود ہوتا ہے لہٰذا ایسے ہی لوگوں نے کچھ ایسی چیزیں پیش کیں جس سے یہ تقسیم سامنے آئی کہ تعلیم کی دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق دنیاوی امور سے ہے جب کہ دوسرے کا آخروی امور سے، اور آگے چل کر یہ سوچ اتنی پختہ ہوتی چلی گئی کہ دو مخالف ومتضاد نظریے سامنے آنے لگے جب کہ معاملہ ایسا نہیں بلکہ ہر طرح کے علوم کے سیکھنے کی شریعت اسلامیہ اجازت دیتی ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ شتر مہار کی طرح آزاد نہیں چھوڑتی بلکہ کچھ شرائط وقیود کے ساتھ اجازت دیتی ہے۔

بہر کیف یہاں مئو میں مذہبی رجحانات اور تعلیمی نظریہ علوم غیر شرعیہ کے لیے کوئی لائق ذکر نہیں اور نہ ہی اس کی طرف کوئی خاص توجہ دی گئی، کیوں کہ یہ خیال تھا کہ عصری تعلیم سیکھنے والا اپنی شرعی تشخص کو برقرار

نہیں رکھ پاتا اور غیر قوموں کے رنگ میں بالکل رنگ جاتا ہے جس کی بنا پر عصری علوم کے حصول کے حق میں علمائے کرام نہیں تھے۔

اس تغیر پذیر دنیا میں اب چوں کہ سر جھکا کر گزر جانے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ اب تو گردن اٹھا کر بے باکی اور جرأت سے پورے طور پر نسیط ہوکر گزرنے کی ضرورت ہے اور زمانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی حاجت ہے اس لیے فطری طور پر رجحان میں تبدیلی نظر آرہی ہے اور تیزی کے ساتھ یہ صورت حال بن رہی ہے کہ ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کو''۔ اور کافی حد تک اس کی طرف پیش رفت بھی ہوئی ہے اور بیداری اس حد تک پیدا ہوگئی ہے کہ کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں عصری تعلیم کے لیے بچوں کو مدرسوں کے علاوہ نرسری، ہائی اسکول اور انٹر کالج وغیرہ نہ ہوں۔

ہر چہار جانب عصری تعلیم کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی ہے۔ نیز بچوں کے اندر صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے بھی کافی پیش رفت ہوئی ہے کہ خارجی طور پر والدین ان کے لیے تعلیم کا بندوبست کر رہے ہیں اور دیگر محبان تعلیم نے اگرچہ روپئے کی یافت ہی کی غرض سے کوچنگ سینٹر کھول رکھا ہے جو مئو کی تعلیم کو مہمیز دینے میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ اسی طرح تعلیم کی راہ میں مبارک قدم اٹھائے جا رہے ہیں جو مستقبل کی تابناکی کے ضامن ہیں۔

پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ بچوں کو پڑھا لکھا کر کیا ہوگا؟ آخر ان کو اسی پیشہ میں لگنا ہے اور آبائی حرفہ کو اختیار کرنا ہے اسی وجہ سے عموماً لوگ علم پر جہل کو ترجیح دیتے تھے لیکن اب روز بروز تعلیم کے تئیں ترقی ہو رہی ہے اگرچہ دوسری قوموں کے مقابلے میں نہایت سست رفتاری کے ساتھ، مگر اس حقیقت سے ہر صاحب بصیرت واقف ہے کوتاہ بیں کو نظر آنا مشکل ہے کہ یہاں کے بچے ہندوستان کے مقابلہ جاتی امتحان میں نمایاں حیثیت سے کامیاب ہو رہے ہیں اور موقر عہدوں پر فائز ہیں۔

اب سے چند سال پہلے اس خطہ میں جہاں ڈھونڈھنے کے بعد چند گھرانے ایسے ملتے تھے کہ پڑھنے لکھنے کے واسطے اور علم کے حصول میں ان کے بچے گھر سے باہر کہیں جاتے تھے اور اب بڑی تعداد میں ایسے لوگ ملیں گے جو دور دراز کا سفر کر کے یا کہیں سکونت اختیار کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں لگے ہوئے

ہیں اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی نظر آ رہے ہیں اور اتنی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں کہ موسم اسی طرح ساز گار رہے اور ''بٹلہ ہاؤس'' کا عمل دہریا نہ جائے تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سابقہ کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے گی اور مستقبل قریب میں دیگر جگہوں کے باشندوں سے کسی بھی چیز میں کم نہیں رہیں گے کیوں کہ یہاں کے لوگوں کو قدرت نے ذہنی استطاعت بھی بخشی ہے، اور سمجھداری کا خاص ملکہ عطا کیا ہے، لوگوں کے اندر ترقی کرنے کا جوہر چھپا ہوا ہے۔ جس میدان میں بھی یہاں کے لوگوں نے قدم بڑھایا ہے اس میں کسی سے پیچھے نہیں رہے بلکہ اپنے حریفوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ صرف مواقع ملنے کی دیر تھی۔

ادھر چند سالوں سے تعلیم کے تعلق سے اہلیانِ مئو کا رجحان اتنا زیادہ بڑھا ہے کہ لڑکوں کو تو اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز بھیجنے کا سلسلہ شروع ہی ہو چکا ہے، لڑکیوں کو بھی بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا جا رہا ہے جب کہ اس کا تصور بھی نہیں تھا اور تعلیم نسواں پر یہاں کے لوگوں نے جو توجہ مبذول کی ہے وہ اور کہیں کم دیکھنے کو ملتی ہے کیوں کہ جن خطوں میں صنف نازک کے تئیں اگر بیداری تھی تو پہلے سے تھی اب کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی لیکن یہاں لائق ذکر رجحان بڑھا ہے اور تیزی سے لوگ اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلا رہے ہیں، یہاں کی لڑکیاں ملک کی بڑی جامعات میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور اہم اور لائق ذکر امتحانات میں بھی نمایاں انداز میں کامیابی حاصل کر رہی ہیں اور ملک کے کئی مؤقر اور اہم تعلیم گاہوں میں یہاں کے مرد حضرات کے ساتھ یہاں کی عورتیں بھی کسی نہ کسی عہدہ پر فائز ملیں گی۔

ہاں اتنا ضرور ہے کہ ابھی تک اس سرزمین کو وہ حضرات میسر نہیں ہو سکے ہیں جن کے ذریعہ سے خود یہاں بڑی تعلیم گاہ بن سکے اور کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جا سکے جس کی ہندوستان میں ایک حیثیت ہو۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے یہاں کے طالب علموں کو دوسری جگہوں کا رخ کرنا پڑتا ہے، اگر یہ ممکن نہیں کہ ہر طرح کے ادارے کھولے جائیں تو کم از کم جو ممکن ہو اسی کی طرف توجہ دی جائے اور حکومت سے درخواست کی جائے کہ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب دیکھ کر ایسے اعلیٰ تعلیمی ادارے کھولنے کی اجازت دے اور اس کے لیے سرمایہ بھی مرحمت فرمائے کہ جن کی وجہ سے فضاء علمی اور وسیع تر ہو، اور ایک بچہ جس کو معاشی حالات کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا دشوار ہے وہ بھی کم از کم علم کی دولت سے محروم نہ رہے اور بہت کچھ نہ

سہی کچھ تو اس کی تمنا پوری ہو سکے اور دامن طلب بالکل خالی نہ رہنے پائے۔

یہ تعلیمی شعور کا نتیجہ ہے کہ منفی سوچ رخصت ہو رہی ہے اور مثبت سوچ بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے حتیٰ کہ جو لوگ بالکل ناخواندہ ہیں اور ان کی معاشی حالت بہتر نہیں ہے وہ بھی اپنے بچوں کی تعلیم کے تئیں متفکر بلکہ مضطرب و بے چین نظر آرہے ہیں اور وہ چاہ رہے ہیں کہ کسی طرح ان کے بچے بھی پڑھ لیں، ترقی کریں تاکہ گھر کا ماحول بدلے بلکہ وہ اپنے مستقبل کو تابناک بنائیں تاکہ آنے والے ایام میں بہترین انسان ثابت ہوں کیوں کہ تعلیم انسان کو وقار عطا کرتی ہے اسی لیے انسان حیوانات پر افضلیت کا درجہ رکھتا ہے اور اشرفیت کی خلعت سے نوازا گیا ہے۔

ادھر وہ رجحانات و خیالات جو مذہبی اعتبار سے پہلے تھے کافی بدل چکے ہیں کیوں کہ بعض حالاتکی وجہ سے اس زمانے میں جدید تعلیم حاصل کرنا جو شجرۂ ممنوعہ سمجھا جارہا تھا اب ماہ طہور سمجھا جانے لگا اور خالص مذہبی خیالات کے حامل جو دنیاوی امور سے آنکھیں موند کر دیگر علوم کو حاصل کرنے سے عملاً یا قولاً روکتے تھے ان کی تعداد بھی کافی کم ہوگئی ہے اور پرانی سوچ بالکل ختم تو نہیں ہوئی لیکن اس میں وہ شدت نہ رہی جو پہلے تھی اور حالات نے مجبور کرنا شروع کر دیا کہ اپنے اندر تبدیلی لائی جائے کیوں کہ اگر اسی طرح خواب غفلت میں پڑے سوتے رہے تو وہ دن دور نہیں کہ ناخواندہ شخص صرف نوکر اور غلام کی زندگی جی سکے گا، محنت و مزدوری کے علاوہ اس کو چارہ نہیں رہے گا۔ اس لیے نئی نسل میں کافی بیداری آچکی ہے اور مذہبی سوچ کے حاملین کے اندر بھی سوچ کا زاویہ بدل گیا ہے۔ اب دین و دنیا کے سنگم کے عملاً قائل ہو رہے ہیں جب کہ پہلے صرف قولاً قائل تھے لیکن عملاً جدید علم کو ممنوع تصور کرتے تھے۔

مدارس میں بھی پہلے کے مقابلے میں نصاب کے اندر تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن ابھی بھی ان پر سابقہ خیالات ہی کی حکمرانی زیادہ ہے اور جیسی تبدیلی درکار ہے ویسی نہیں بلکہ اس میں کافی کمی ہے، یہ ضرور ہے کہ اپنے دینی تشخصیات کو ہمیں باقی رکھنا ہے لیکن جہاں گنجائش بلکہ ضرورت متلاشی ہے اور جس میں مذہبی اعتبار سے کسی طرح کا نقصان نہیں ان امور میں بہر کیف تبدیلی کی ضرورت زمانہ کا تقاضہ اور وقت کی پکار ہے۔

الغرض میو کا ماحول ہر حیثیت سے تغیر وتبدل سے دو چار ہے، دقیانوسیت کی رسی کافی کمزور ہو گئی ہے، مذہبی رجحان میں نمایاں فرق واقع ہوا ہے اور نظریہ تعلیم میں وسعت وفراخی پیدا ہوئی ہے اور جس نے یہاں کا ماحول آج سے دس بیس سال پہلے کا دیکھا ہو گا وہ آج بہت نمایاں فرق پائے گا۔تہذیب وثقافت میں اردو زبان وبیان میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے، عامیانہ طرز تخاطب سے نکل کر اب علمی انداز گفتگو بہت حد تک پائی جانے لگی ہے، اگر توجہ کا یہی گراف رہا تو آئندہ چل کر بجا طور پر میو فخر کرے گا کہ ہمارے یہاں قوم وملت کے قیمتی سرمائے موجود ہیں اور ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ ملک کو آگے بڑھانے میں ایسے افراد مہیا کر سکتے ہیں جن کی صلاحیت واہلیت مسلم ہے اور جو ملک کو دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بدوش کھڑا کر سکتے ہیں۔

*****

حوالے

1 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، آثر انصاری حیات اور خدمات، 2007ء۔ص23

2 ضیاءالدین برنی، بحوالہ مومن انصار برادری کی تہذیبی تاریخ (ڈاکٹر مومن محی الدین) مشمولہ آثر انصاری حیات اور خدمات، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی 2007ء۔ص24-23

3 ڈاکٹر مومن محی الدین، مومن انصار برادری کی تہذیبی تاریخ، مشمولہ آثر انصاری حیات اور خدمات، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، 2007ء۔ص18-17

4 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، آثر انصاری حیات اور خدمات، 2007ء۔ص16

5 ڈاکٹر شکیل احمد، مئو شہر ہنروراں۔ص15

باب دوم

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: سوانح و شخصیت

(۱) سوانحی حالات

(۲) شخصیت کے نقوش

سوانحی حالات

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کا تعلق اتر پردیش کے مشرقی ضلع مئوناتھ بھنجن سے ہے، مئوناتھ بھنجن جو پہلے اعظم گڑھ کا ایک زرخیز اور مردم خیز قصبہ تھا اور اب خود ایک ضلع کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے، یہاں کے باشندوں کا پیشہ ابتدا ہی سے پارچہ بافی رہا ہے۔ یہاں کے لوگ عمومی طور پر اپنے ذریعہ معاش میں الجھے رہتے تھے، اس لیے پڑھنے لکھنے کی طرف عام رجحان نہ تھا ہاں اتنا ضرور ہے کہ مذہبی رواداری اور مذہبی افکار کا شروع سے غلبہ تھا اس لیے اپنے بچوں کو ناظرہ قرآن اور بعض ابتدائی حیثیت کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ رکھتے تھے، البتہ کچھ متمول قسم کے لوگ اعلیٰ تعلیم دینے کے قائل تھے لیکن ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی، ان ہی وجوہات کی بناء پر لوگ ادھر کچھ دھیان ہی نہیں دیتے تھے کہ اپنے شجرۂ نسب کی حفاظت کرنی چاہیے کیوں کہ وہ اپنے میں مگن رہتے تھے اور دیگر برادران وطن کی طرح آباءواجداد کے تذکرہ سے دل کو بہلانے کے قائل نہ تھے، لہذا یہاں کی آبادی کا ایک معتدبہ حصہ ایسا ملتا ہے کہ ان کے شجرۂ نسب کا کچھ بھی پتا نہیں سوائے چند اجداد کے ناموں کے۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کا خاندان کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ ان کے شجرۂ نسب سے متعلق رقم کی رسائی نہ ہوسکی۔ خود انھیں اپنے اجداد سے متعلق زیادہ علم نہیں ہے۔ ان کے خاندان میں نسیم اعظمی ہی زیادہ تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے اپنی کاوشوں اور محنتوں کے ذریعہ علمی حلقوں میں وہ مقام حاصل کرلیا ہے کہ خود ان کی شخصیت پر جیتے جی لکھا گیا ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنے خاندان کا نام اپنی تخلیقی کاوشوں کے ذریعہ سے روشن کیا ہے۔

داد

نسیم اعظمی کے دادا کا نام خدا بخش تھا۔ قصبہ مئو میں اپنے زمانہ کے لحاظ سے یہاں کے رائج ''پارچہ بافی'' کے کام سے منسلک تھے اور اسی کام میں انھوں نے اپنی عمر تمام کی۔

والد

نسیم اعظمی کے والد کا نام عبدالعلیم ہے، وہ خدا بخش کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ان کی ساری تعلیم محض واجبی اور مذہبی تعلیم تک محدود تھی۔اپنی کتاب میزان آگہی میں شامل مضمون ''مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا'' میں نسیم اعظمی اپنے خاندان کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میرا خاندان اگر چہ شہر و محلے کے ممتاز خاندانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔لوگ عموماً تجارت پیشہ یا پارچہ جات پروڈکشن کے کام سے وابستہ ہیں۔میرے والد عبدالعلیم مرحوم اور والدہ بی بی قریشہ مرحومہ کی ساری تعلیم محض واجبی اور مذہبی تعلیم تک ہی محدود تھی''۔ 1

اگر چہ نسیم اعظمی کے والد کم تعلیم یافتہ تھے لیکن مذہبی معاملات میں بہت مضبوط شخصیت کے مالک تھے، ان کی شخصیت سچائی اور ایمانداری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔وہ کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ایماندار اور نیک انسان تھے۔جھوٹ سے سخت نفرت کرتے اور مذہب کا پاس ولحاظ رکھتے تھے۔ان کی سچائی اور راست گوئی سے متعلق نسیم اعظمی نے ایک واقعہ کے حوالہ سے بتایا کہ ان کے والد انھیں درجہ اول میں داخلہ کی غرض سے گئے تو ماسٹر صاحب نے عمر دو تین سال کم لکھانے کی بات کی جس پر ان کے والد بگڑ گئے اور صحیح تاریخ پیدائش لکھنے پر اصرار کیا۔کیوں کہ انھیں جھوٹی تاریخ پیدائش لکھوانا منظور نہیں تھا اسی واقعہ کا تذکرہ نسیم اعظمی اپنی کتاب میزان آگہی میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''داخلہ رجسٹر پر جب تاریخ پیدائش درج کرنے کی بات آئی تو ابا نے بتایا کہ 12/جنوری1958 ء۔ہیڈ ماسٹر صاحب نے میرے والد سے ازراہ ہمدردی کہا کہ اس میں دو تین سال کی تخفیف کر کے 1961ء کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا اور مستقبل میں خصوصاً سروس و ملازمت میں اس کا فائدہ ملے گا۔اتنا سننا تھا کہ ابا تن بدن سے بگڑ گئے اور کہا کہ ہمارے دینی مدارس میں بھی اب ہر کام کی شروعات جھوٹ سے کی جانے لگی؟ مجھے جھوٹ اور دروغ کی ملاوٹ منظور نہیں اس لیے جو در

اصل تاریخ پیدائش ہے وہی درج کی جائے‘‘۔ 2

آخری عمر میں نسیم اعظمی کے والد اچانک گر گئے تھے جس کی وجہ سے ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی ،تمام تر علاج و معالجہ کے باوجود بھی ٹھیک نہ ہو سکے اور اس طرح علالت کے سبب انھوں نے 27؍ دسمبر 1990ء میں وفات پائی۔

والدہ

نسیم اعظمی کی والدہ کا نام بی بی قریشہ تھا وہ مئوشہر کے نامور اور مشہور سوداگر جناب ثناءاللہ صاحب کی صاحبزادی تھیں۔بی بی قریشہ کی تعلیم اس زمانہ کے رواج کے مطابق محض مذہبی انداز میں ہوئی تھی۔نیہالی رشتہ سے نسیم اعظمی کو سوداگر خاندان کا نواسہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔نسیم اعظمی کے نانا جناب ثناء اللہ، سوداگر کے نام سے ہی جانے جاتے تھے۔بی بی قریشہ نے 12؍فروری 2008ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئیں اور نسیم اعظمی کے اجداد کے جوار میں سپرد خاک ہوئیں۔

بھائی اور بہن

عبدالعلیم اور بی بی قریشہ کی کل سات اولاد ہوئیں جس میں پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ان میں نسیم اعظمی سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔اس طرح اپنے بھائیوں بہنوں سے متعلق معلومات فراہم کراتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

> ’’ہم لوگ پانچ بھائی اشرف علی،عبدالعلی،شوکت علی،محمد علی اور محمد نسیم اور دو بہنیں فاطمہ خاتون اور آمنہ خاتون ہیں۔دو بھائی عبدالعلی اور شوکت علی کا انتقال ہو چکا ہے۔بڑے بھائی اشرف علی (وفات 27؍دسمبر 2010ء)اور بڑی بہن فاطمہ خاتون حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکی ہیں۔میں بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا ہوں‘‘۔ 3

اس وقت ان کے تینوں بھائی اور ایک بہن اور خود نسیم اعظمی بھی اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں صرف ایک بہن ہی بقید حیات ہیں۔

نسیم اعظمی کی ولادت اور بچپن

اتر پردیش کا مشرقی ضلع مئوناتھ بھنجن جو پہلے اعظم گڑھ کا ہی حصہ تھا اور 1989ء میں خود مختار ضلع بنا۔ اعظم گڑھ جو صدیوں سے ایک اہم ادبی وثقافتی مرکز رہا ہے اور علامہ شبلی نعمانی جیسی بلند قامت شخصیت کی عظمت اور علم وفن کی دولت نے اسے بقائے دوام بخشا۔ ضلع اعظم گڑھ کی اہمیت نہ صرف اس کے صدر مقام ہونے پر تھی بلکہ اس ضلع کے گردونواح میں بکھرے ہوئے علم وفضل کے ان مراکز کی وجہ سے بھی ہے جو سارے ضلع کے اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اعظم گڑھ میں سید اختر حسین رضوی، کیفی اعظمی، مبارکپور میں قاضی اطہر مبارکپوری، محمد آباد گوہنہ میں سید عبدالعلی، مئوناتھ بھنجن میں ابوالماثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، محمد ابوبکر آثر انصاری قابل ذکر ہیں۔ غرض مئو اور اعظم گڑھ علماء، فضلاء، حکماء، صوفیاء، ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کی وجہ سے مشہور ہے۔

اعظم گڑھ کے قصبہ مئو کے مغربی علاقہ محلّہ ڈومن پورہ (کساری) میں عبدالعلیم اور بی بی قریشہ کے گھر 12/جنوری 1958ء کو ایک لڑکے کی ولادت ہوئی، اس نومولود کا نام محمد نسیم رکھا گیا۔ تعلیمی سرٹیفیکٹ اور سرکاری کاغذات میں یہی نام اور تاریخ پیدائش درج ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں اکثر ادباء وشعراء کی تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں مختلف اقوال ملتے رہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں اتنی سہولیات مہیا نہ تھیں اور نہ ہی اتنے بیدار مغز لوگ تھے کہ اپنے بچوں کی پیدائش کے بعد سرکاری اصول وضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے پیدائشی سرٹیفیکٹ بنواتے۔ زیادہ تر اسی تاریخ پر اکتفا کیا جاتا تھا جو ان کے والدین مدارس میں داخلہ کے وقت درج کرا دیتے تھے، ڈاکٹر رفیق اشفاق اپنے مضمون ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: حیات اور ادبی سفر'' میں نسیم اعظمی کی صحیح پیدائش کے بارے میں یوں تصدیق کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب کی پیدائش شہر مئوناتھ بھنجن کے مغربی علاقہ ڈومن پورہ کساری میں 12/جنوری 1958ء کو ہوئی۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اکثر اختلاف پایا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے جو آئندہ ان

کی حیات اور کارناموں پر تحقیق کرنے والے اسکالروں کے لیے
سہولت کا باعث ہوگا۔'' 4

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش میں اختلاف رائے نہیں ہے لیکن ''عبرت مچھلی شہری'' اپنے مضمون ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخص وعکس'' میں ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق شبہ ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''موصوف کی تاریخ پیدائش کا تعین واضح نہیں ہے اور اس پر گفتگو کرنا
خطرے سے خالی نہیں کیوں کہ آگے چل کر محققین اردو کا موضوع بحث
بن سکتی ہے''۔ 5

عبرت مچھلی شہری اپنے اسی مضمون میں آگے مذکورہ بالا تاریخ پیدائش کو تسلیم بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی نسیم اعظمی کو مولانا ابوالکلام آزاد کا جانشین بھی گردانتے ہیں:

''ان کی والدہ کے قول کے مطابق ان کی ولادت با سعادت مولانا
ابوالکلام آزاد کی وفات کے ڈیڑھ ماہ پیشتر ہوئی تھی۔ چونکہ ماں اپنی
اولاد سے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہے اس لیے انھیں کے قول کو
قابل اعتبار تسلیم کر لیتے ہیں۔'' 6

واضح رہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال 22 رفروری 1958ء کو ہوا تھا۔ تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں نسیم اعظمی، مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال ہی کی تاریخ کے حوالہ سے اپنے پہلے شعری مجموعہ ''میزان آگہی'' میں ''مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا۔۔۔'' میں لکھتے ہیں:

''میں کب پیدا ہوا یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اماں بتاتی تھیں کہ جس سال
مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ہوا تھا اسی سال ان کے انتقال سے تقریباً
ڈیڑھ ماہ پہلے میں اس دنیا میں وارد ہوا تھا۔ میری بڑی امی رقیہ (مائی)
اور کافیہ بھی یہی کہتی تھیں مگر میری پھوپھی کہتی تھیں کہ جس سال کے موسم
گرماں میں ہمارا پختہ مکان بنا تھا اسی سال کے موسم سرما میں میری
پیدائش ہوئی تھی''۔ 7

مذکورہ اقتباسات اور موصوف کے بیان کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ محمد نسیم اعظمی کی ولادت 12/ جنوری 1958ء قصبہ مئو ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے محلّہ ڈومن پورہ کساری میں اپنے آبائی مکان پر ہوئی۔ان کے والد نے محمد نسیم نام رکھا۔

ان کی ولادت ایک ایسے مسلم گھرانہ میں ہوئی جو اپنے اسلاف کے کارناموں کی وجہ سے کوئی بہت مشہور نہیں تھا،لیکن بعض دفعہ اخلاف،اسلاف کے لیے نیک نامی کا سبب ہوتے ہیں نسیم اعظمی بھی کچھ ایسے واقع ہوئے ہیں کہ انھوں نے اپنے ادبی وعلمی کارناموں سے اپنے خاندان کا نام روشن کیا۔

ان کا اصل نام محمد نسیم ہے،محمد کو ایم سے بدل کر علاقائی نسبت اعظمی کا اضافہ انھوں نے خود کیا اور اپنے کو ایم نسیم اعظمی لکھنے لگے۔مزید علمی محنت وکاوش نے ڈاکٹر کے لفظ کو جز و اسم بنا دیا اور اب ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ایس ایم عباس اپنے مضمون ''ایم نسیم اعظمی (خاکہ)'' میں رقم طراز ہیں:

> ''محمد نسیم صاحب کے نام سے بھی ایک جہت ہے۔محمد کو ایم سے بدل دیا اور اعظمی لکھنا اپنا پیدائشی حق نہیں بھولتے سچی بات تو یہی ہے کہ وہ اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اس وقت مئو ضلع کی سرحد،جغرافیہ اور تاریخ کچھ بھی وجود میں نہیں آئے تھے۔البتہ مئو ناتھ بھنجن کا نام پہلے نورانی تیل پھر ماہنامہ ''ادب نکھار'' کے حوالہ سے دور دراز علاقوں میں پہنچ چکا تھا''۔ 8

نسیم اعظمی کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا لیکن ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے زیادہ شہرت پائی۔صرف تعلیم سے متعلق ان کی تصنیف کردہ اب تک سات کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔مئو ناتھ بھنجن اور نسیم اعظمی پر روشنی ڈالتے ہوئے ظہیر حسن ظہیؔر نے اپنے مضمون ''ایک عہد شناس شخصیت ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی'' میں لکھتے ہیں:

> ''دنیا کے نقشے میں ہزاروں ملک اور شہر اپنا وجود رکھتے ہیں۔کسی بھی شہر یا ملک کی شناخت اس ملک اور شہر میں رہنے والے ان افراد سے ہوتی

ہے جو اپنے خاندان، سماج اور ملک وقوم کے لیے کچھ نمایاں کارنامے
انجام دیتے ہیں۔ مئوناتھ بھنجن کی شناخت بھی اس شہر میں رہنے والے
انھیں افراد سے قائم ہے۔ جنھوں نے علم وادب کی شمع کو روشن کر رکھا
ہے۔ مئوناتھ بھنجن اگر چہ ایک صنعتی شہر ہے لیکن اس شہر کو اس وجہ سے
اختصاص حاصل ہے کہ یہ شہر کبھی بھی علمی وادبی اعتبار سے بانجھ نہیں رہا
ہے ہر عہد اور ہر زمانے میں اس شہر میں صاحب فضل وکمال پیدا ہوتے
رہے ہیں۔ اسی شہر کے ایک محلّہ ڈومن پورہ میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی
صاحب نے آنکھیں کھولیں''۔ 9

نسیم اعظمی کو بچپن ہی سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کا بہت شوق تھا اور ان کے والدین کی خواہش بھی تھی کہ میرا سب سے چھوٹا بچہ لکھ پڑھ کر نہ صرف والدین اور خاندان کا نام روشن کرے بلکہ شہر وقوم کا بھی نام روشن ہو۔ ان کے والد کی زبان سے یہ لفظ اس وقت نکلا تھا جب درجہ اول میں ان کے داخلہ کے وقت تاریخ پیدائش کے تعلق سے ہیڈ ماسٹر صاحب سے ناراضگی پیش آئی تھی (جس کا تذکرہ گزر چکا ہے)۔ خدا کا کچھ ایسا کرنا کہ وہ قبولیت کی گھڑی تھی، لہذا آگے چل کر اس بچہ نے جس کے والد صاحب نے اپنی آنکھوں میں مستقبل کا خواب سجایا تھا اس کو شرمندۂ تعبیر کیا اور والد صاحب کی وہ خواہش پوری ہوئی جس کے وہ متمنی تھے، لیکن اس بچہ کے پروان چڑھنے کے احوال وکوائف کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس ترقی کی منزل پر پہنچنے میں خود اس بچہ کی محنت ولگن اور جدوجہد کو بہت بڑا دخل رہا ہے کیوں کہ یہ بچہ نہ تو ایسے مالدار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا کہ علمی لیاقت پیدا کرنے کے لیے جتنے ذرائع درکار ہوتے ہیں وہ بآسانی میسر ہو جائیں اور نہ ہی خاندان کے افراد ایسے تھے کہ اس بچہ کی خوب رہنمائی کر سکیں بلکہ اس بچہ کو خود اپنے زور بازو سے کام لینا تھا اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنی تھی، وہ میزان آگہی میں لکھتے ہیں:

''میرے والدین کی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں اور ان کا
اور خاندان وشہر کا نام روشن کروں مگر معاشی پریشانیوں اور گھریلو
مجبوریوں کی بنا پر میری جیسی اور جس انداز کی تعلیم ہونی چاہیے تھی نہیں

ہوسکی۔ میری تمام تر تعلیم میری اپنی دلچسپی اور بے ترتیبی کا نتیجہ ہے کیوں
کہ میرے گھر خاندان میں نہ تو کوئی تعلیم یافتہ تھا اور نہ ہی میرے تعلیمی
معاملے میں کبھی کسی نے کسی قسم کی رہنمائی ہی کی جس سے میری تعلیم خود
رو پودے کی طرح ہوسکی۔ اس کی تراش، خراش اور سجانے اور سنورنے
کے لیے جس قسم کی سرپرستی اور رہنمائی کی ضرورت تھی وہ مجھے نصیب
نہیں ہوسکی چنانچہ اب میرا پختہ یقین ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیمی
رہنمائی اور کیریئر گائڈنس بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ تعلیم کیوں کہ
بغیر رہنمائی کے تعلیم عموماً طلباء کے مستقبل کو گومگو کی کیفیت سے ہمکنار کر
دیتی ہے جس سے تعلیم سے بیزاری پیدا ہوتی ہے اور بے روزگاری کو
بڑھاوا ملتا ہے اور طلباء تعلیم کے اصل جوہر سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔
بہرحال میں اپنے والدین کی خواہش کے مطابق کسی سودمند اور باوقار
منصب تک تو نہیں پہنچ سکا مگر میں نے درس و تدریس کا جو تخلیقی کام
سنبھالا ہے اور ایک ذمہ دار شہری اور قلم کار کی حیثیت سے اپنے قلم کے
وقار کو جس طرح باقی رکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہی سب سے اہم
اور بڑا منصب ہے جو قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ ہے جس پر میں
راضی بھی ہوں اور شاکر بھی''۔ 10؎

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف کی ساری تعلیم ان کی ذاتی لگن اور محنت کی بنا پر ہی پوری ہوئیں، ان کی رہنمائی یا تعلیم کے تئیں بیداری کے لیے ان کا کوئی رہنما نہیں تھا لیکن وہ ہمیشہ نئے طالب علموں کی رہنمائی کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

مشاغل

نسیم اعظمی کی شخصیت اپنی مصروفیات میں بھی آئندہ نسلوں کے لیے ایک پیغام رکھتی ہیں اور ان کی صحیح سمت میں رہنمائی کرتی ہے مثلاً ان کی مصروفیات میں طلبہ کی رہنمائی شامل ہے۔ جو طلباء معاشی اعتبار سے کمزور اور اعلیٰ تعلیم کے حصول سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان کی مناسبت اور برمحل ایسی رہنمائی کرتے ہیں کہ ان کا

جذبہ شوق دوآتشہ ہوجاتا ہے اوران کا احساس کمتری، حوصلہ اور پیش قدمی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

اسی طرح آزاد صحافت بھی ان کا پسندیدہ شغل رہا ہے۔ انھوں نے اپنی کم عمری ہی سے اس میدان میں طبع آزمائی شروع کردی تھی اوراس پختہ عمر میں اس راہ میں ایسا قدم جمالیا ہے کہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آزاد صحافت سے ان کا لگاؤ اور تعلق ایسے ہی ہے جیسے دیگر اہم کاموں سے ہوتا ہے۔

ان کو بچپن ہی سے کھیل کود سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، کبھی کبھی اپنے دوستوں کے ہمراہ فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ درجہ پنجم کی طالب علمی کے ہی دور میں جامعہ مفتاح العلوم کی شاخ ڈومن پورہ (کساری) کے ایک کمرے کی دو الماریوں میں عرصہ سے بند پڑی ''انصار لائبریری'' اور جناب عبدالمجید کے یہاں بند پڑی ''آزاد لائبریری'' کی کتابوں کو اپنے کچھ محسن دوستوں کے ساتھ یکجا کرکے ''انصار لائبریری'' کے ہی نام سے اسے ازسرنو زندہ کیا اور یہیں سے انھیں کتابوں کے مطالعہ کی عادت پڑی۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''انصار لائبریری کے زمانے میں ہی مجھے کتابوں کے مطالعہ کی جو عادت پڑی تو آج تک ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' کا حال ہے''۔ 11

الغرض درس و تدریس اور آزاد صحافت سے نسیم اعظمی کا خاص لگاؤ ہے۔ ان کی مصروفیات اور مشاغل میں سب سے اہم طلباء کی صحیح سمت رہنمائی کرنا ہوتا تھا خاص کر ان مسلمان طلباء جو اپنی مفلسی کی وجہ سے تعلیم چھوڑنے یا آگے کی تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں ان کی وہ دل کھول کر سرپرستی کرتے تھے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتے تھے۔

تعلیم وتربیت

ماہرین نفسیات کے مطابق پیدائش سے تین سال کی عمر تک کے بچوں کی تعلیم اس کے خاندان میں ہوتی ہے اور اس مرحلہ کا نصاب بھی خاندان اور خاندان کے ماحول تک ہی محدود رہتا ہے، کیوں کہ اس عمر کے بچوں کی ذہنی نشو ونما بہت تیز رفتاری سے ہوتی ہے اور اپنے گرد ونواح کے ماحول کو خوب اخذ کرتے ہیں، اسی لیے غالباً مسلم گھرانوں میں سب سے پہلے بچوں کی تعلیم وتربیت کا بندوبست اپنے ہی خاندان میں کیا جاتا

ہے اور بچوں کی پہلی تعلیم جو مذہبی نصاب کے تئیں قرآن شریف سے ہی شروع کی جاتی ہے تا کہ بچہ پختہ مسلمان بنے پھر آگے چل کر وہ کچھ پڑھے لکھے لیکن اپنی حقیقت کو نہ بھولے، لہذا اسی تناظر میں نسیم اعظمی کی پہلی تعلیم بھی قاعدہ بغدادی سے ہی گھر پر شروع ہوئی۔

نسیم اعظمی عہد طفولیت سے ہی کافی ذہین، طباع، بلند حوصلہ اور محنت کش واقع ہوئے تھے۔ مکتب میں اپنے ہم سبق ساتھیوں پر انھیں ہمیشہ سبقت حاصل رہی۔ ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ کی عمر تقریباً پانچ سال تھی تو ان کی والدہ نے قاعدہ بغدادی پڑھانا شروع کیا اور انھوں نے ایک ہفتہ میں نہ صرف یہ کہ قاعدہ بغدادی ختم کر لیا تھا بلکہ اسے زبانی یاد بھی کر لیا تھا۔

چونکہ ان کے والدین کی ساری تعلیم محض واجبی اور مذہبی تعلیم تک محدود تھی، اسی وجہ سے ان کی والدہ نے سب سے پہلے قاعدہ بغدادی ہی سے ان کی تعلیم کی ابتدا کرائی۔ قاعدہ بغدادی کے بعد آپ ''یسرنا القرآن'' اپنے خاندانی رشتہ کی دو بہنوں زاہدہ و زیب النساء سے پڑھنا شروع کیا جو ان کے بڑے ابو جناب عبدالعظیم کی دختر تھیں۔ اس کو دو ماہ کے اندر نہ صرف ختم کیا بلکہ حفظ بھی کر لیا۔ ڈاکٹر محبوب راہی اپنے مضمون ''ایم نسیم اعظمی کی عمیق و بسیط علمی و ادبی خدمات کا کثیر الجہات منظر نامہ'' میں اس واقعہ کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''استعجاب انگیز مسرت کا احساس ہوتا ہے کہ 12رجنوری 1958ء کو اس دنیائے آب وگل کی فضاؤں کو اپنے وجود کی خوشبو سے مہکانے والے نسیم اعظمی نے پانچ سال کی قلیل ترین عمر میں ایک ہفتے کے اندر بغدادی قاعدہ اور دو ماہ کے اندر یسرنا القرآن نہ صرف پڑھ لیا بلکہ تمام تر حفظ بھی کر لیا۔ اپنی اس فطری ذہانت اور طبعی فراست کے پر لگا کر اس ہونہار بروا نے جب علم وشعور کے آفاق میں اڑانیں بھرنے کے لیے پر تولے یکے بعد دیگرے کئی بلندیاں اس کی پروازوں کے آگے گرد تھیں''۔ 12

قرآن شریف پڑھنے کے لیے انھیں ماسٹر عبدالرؤف گرافر کے نابینا لڑکے حافظ عبدالقدوس

صاحب کے یہاں بٹھایا گیا جس کا آغاز عم پارہ سے ہوا۔ایک سال کے اندر عم پارہ ختم کر کے اس کی چھوٹی بڑی سورتیں زبانی یاد کرلیں اور ''الٓمّ'' بھی ختم کرلیا تھا،اسی دوران ان کے والد صاحب نے مدرسہ دارالعلوم کی شاخ جوان کے گھر کے قریب ہی مرزاہادی پورہ میں واقع ہے اوران کے ماموں رحمت اللہ سوداگر کے مکان کے بالکل قریب تھی،درجہ اول میں ان کا داخلہ کرایا۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ بچوں کی پرورش میں والدین کا نمایاں کردار ہوتا ہے۔والدین کی صحیح تربیت بچوں کے روشن مستقبل میں مزید چار چاند لگاتے ہیں۔

مدرسہ دارالعلوم کی اس شاخ میں انھوں نے درجہ اول میں دو سال پڑھا، حالانکہ اپنے درجہ میں کامیاب ہوئے تھے،ایسا اس لیے ہوا کہ بغیر قرآن ختم کیے آگے نہیں بڑھایا جاتا تھا۔تھوڑا بہت قرآن پاک ناظرہ باقی رہ گیا تھا،اور پھر قرآن پاک ختم کرنے کے بعد ہی درجہ دوم میں داخل کیا گیا۔رفتہ رفتہ ترقی کرتے گئے اور پرائمری (درجہ پنجم) کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔پھر مدرسہ دارالعلوم (مئو) گئے۔یہاں سے درجہ ششم وہشتم پاس کرلینے کے بعد 1973ء میں عربی فارسی بورڈ الہ آباد کا منشی کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا جب کہ اس سال پورے اتر پردیش میں صرف دو ہی امیدوار فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوئے تھے۔

مدرسہ دارالعلوم مئو میں جب وہ زیر تعلیم تھے،اس وقت وہاں کے اساتذۂ کرام میں ڈاکٹر انیس ادیبؔ، منشی حفیظ الرحمٰن ایمنؔ، منشی ممتاز احمد خاص قابل ذکر ہیں جو اپنے اپنے فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔انھوں نے ان تمام اساتذہ سے کسب فیض حاصل کیا ہے۔

1973ء میں منشی کے امتحان میں کامیابی کے بعد مدرسہ دارالعلوم (مئو) کے ہی شعبۂ عربی میں داخلہ لیا مگر چند ماہ بعد عربی تعلیم کو ترک کر کے ڈی۔اے۔وی انٹر کالج (مئو) کے درجہ نہم میں سائنس سائڈ سے داخلہ لیا۔داخلہ لینے کے بعد جو دشواری پیش آئی وہ یہ کہ اب تک سارے مضامین اردو میڈیم میں پڑھے تھے اور یہاں اب تعلیم کا میڈیم ہندی تھا،شروع شروع میں انھیں کو سنسکرت آمیز ہندی اصطلاحوں کو سمجھنے میں کافی دشواری لاحق ہوئی،اسی دشواری نے انھیں آگے چل کر تعلیمی معیار کو بڑھاوا دینے والے رجحان میں معاونت کی کیوں کہ انھیں پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ طلباء کی کم از کم انٹر میڈیٹ تک کی تعلیم کا میڈیم ان کی

مادری زبان ہونی چاہیے۔ کیوں کہ میڈیم کی تعلیم مادری زبان نہ ہونے کے سبب طلباءنہ تو صحیح طور پر سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہی اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کر پاتے ہیں۔اس خیال کا اظہار انھوں نے اسی زمانے میں اپنے استادمحترم جناب ''پی۔این۔رائے'' اور ''مگنوں سنگھ'' سے بھی کیا، اساتذہ نے دبے لفظوں میں ان کے خیال کی تائید بھی کی تھی لیکن ہندوستان کے ہندی میڈیم میں چوں کہ ہندی کو بڑھاوا دینا ہوتا ہے اس لیے ممکن نہیں کہ ان کے خیال کی تثویب کی جاتی، حالانکہ ہندی میں دراصل اردو کے ہی الفاظ زیادہ تر عوام استعمال کرتی، بولتی اور سمجھتی ہے لیکن صرف رسم الخط ہندی ہوتا ہے۔

سائنس سائڈ سے انھوں نے ہائی اسکول کے امتحان میں شرکت بھی کی لیکن خدا کو منظور نہ تھا کہ آپ ریگولر ہائی اسکول کا امتحان پاس کریں۔ ہوا یوں کہ جس دن سائنس کا پرچہ تھا عین اسی دن اچانک انھیں بخار آ گیا،اس کے باوجود انھوں نے امتحان میں شرکت کی، جب ہائی اسکول کا نتیجہ آیا تو سائنس کے پرچہ میں سپلی منٹری تھی،انھوں نے سپلی منٹری کے امتحان میں شرکت نہیں کی بلکہ اگلے سال پرائیوٹ طور پر ہائی اسکول کے امتحان میں شریک ہوکر کامیابی حاصل کی۔وہ لکھتے ہیں:

> ''نویں کے بعد دسویں درجہ میں گیا اور ہائی اسکول کے امتحان میں شریک ہوا مگر سائنس کے پرچہ کے دن مجھے اچانک بخار آ گیا۔کسی طرح امتحان دے کر گھر پہنچا دوسرے روز امتحان میں بھی حالت غیر رہی اور جب ہائی اسکول کا نتیجہ آیا تو سائنس کے پرچے میں سپلی منٹری تھی۔میں نے سپلی منٹری کے امتحان میں شرکت نہیں کی اور اگلے سال پرائیوٹ طور پر ہائی اسکول کے امتحان میں شریک ہوکر کسی طرح پاس ہوا''۔ 13؎

ان کی تعلیم کا سلسلہ اس وقت منقطع ہو گیا تھا جب انھوں نے عربی فارسی بورڈ الہ آباد کا امتحان ''کامل'' پاس کیا،لیکن ذاتی مطالعہ کی بنا پر اپنے آپ کو تعلیم سے الگ نہیں کیا بلکہ پرئیوٹ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور بنارس ہندو یونیورسٹی سینٹرل اسکول (B.H.U) کی ایوننگ کلاس میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ یہاں پر مشہور و معروف شخصیات سے تعلقات کا شرف حاصل ہوا۔اپنے اس داخلہ کے توسط سے وہ خود لکھتے ہیں:

''میرے داخلے میں جناب نجم الدین انصاری نے خاص تعاون
کیا اور انھیں کے توسط سے جناب ڈاکٹر حکم چند نیّر، ڈاکٹر حنیف نقوی،
امرت لال عشرت اور ڈاکٹر قمر جہاں اور دوسرے اساتذہ سے تعلقات
ہوئے اور میرا بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ اردو فارسی میں آنا جانا
شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر علیم مسرور سے بھی تعلقات پیدا ہوگئے''۔ 14

نسیم اعظمی ایم۔اے کرنے کی غرض سے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ کی درخواست دی جو منظور بھی ہوئی۔ داخلہ کے بعد ہاسٹل کا مسئلہ تھا، کیوں کہ پرانے طالب علموں سے جو برسوں سے ہاسٹل کے کمروں پر قبضہ کیے ہوئے تھے، ہاسٹل خالی کرایا جا رہا تھا مگر نئے طالب علموں کو ابھی الاٹ نہیں کیا جا رہا تھا۔ دس پندرہ دنوں تک سرسید ہال کی لائبریری میں اور پھر ڈاکٹر مسیح الرحمٰن صاحب کے ہاں انھوں نے وقت گزارا۔ ہاسٹل کے احوال اور ایم۔اے پاس کرنے کے تعلق سے نسیم اعظمی خود لکھتے ہیں:

''غالباً سید حامد صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا۔ پرانے طالب
علموں سے جو برسوں سے ہاسٹل کے کمروں پر قبضہ کیے ہوئے تھے
ہاسٹل خالی کرایا جا رہا تھا۔ مگر نئے طالب علموں کو ابھی الاٹ نہیں کیا
جا رہا تھا۔ میں دس پندرہ دنوں تک سرسید ہال کی لائبریری میں پڑا رہا
انھیں دنوں ڈاکٹر مسیح الرحمٰن صاحب لکچرار شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ اپنے
ریسرچ کے سلسلے میں مع اہل وعیال علی گڑھ میں کرائے کے مکان میں
مقیم تھے انھیں جب پتہ چلا تو انھوں نے جناب مصباح بھائی کے توسط
سے مجھے اپنے گھر بلا لیا لیکن تین ہفتہ کے بعد بھی جب ہاسٹل کا مسئلہ حل
نہیں ہوا تو میں گھبرا کر گھر چلا آیا اور اگلے سال حلیم مسلم کالج کانپور کے
توسط سے کانپور یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) کے امتحان میں شریک
ہوا اور درمیان میں ایک سال کی گیپنگ کے بعد ایم۔اے فائنل کے
امتحان میں شریک ہوکر فرسٹ ڈویژن میں ایم۔اے پاس کیا اور پھر
حسب معمول اپنے رسالہ اور پریس کے کام میں مصروف ہوگیا۔'' 15

بی۔اے کے دوران ہی ان کے تعلقات ڈاکٹر حکم چند نیر سے بہت گہرے ہو چکے تھے۔ڈاکٹر حکم چند نیر کی مردم شناس نظروں نے جوہر قابل کو اسی وقت سے پہچان لیا تھا،اس لیے انھوں نے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کی ہدایت دی۔ان کی ہدایت کے مطابق پی۔ایچ۔ڈی ریسرچ کے لیے درخواست ''بنارس ہندو یونیورسٹی''(B.H.U) دی۔سیٹ صرف ایک اور امیدوار پانچ تھے۔بہر حال ان کی درخواست مع موضوع ''اردو تنقید آزادی کے بعد'' منظور ہوگئی اور انٹر یو کے بعد رجسٹریشن کا مرحلہ بھی سر ہوگیا۔کاغذی طور پر نگراں پروفیسر ''حنیف نقوی'' تھے مگر سر پرستی ڈاکٹر حکم چند نیر کی زیادہ تھی۔

یہ دنیا کا ازلی دستور رہا ہے کہ انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے نامساعد حالات آہی جاتے ہیں کہ جن کی بنا پر اسے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے،اور مستقبل کے ارادوں کو پس پشت ڈالنے پر وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ایسا ہی کچھ نسیم اعظمی کے ساتھ بھی ہوا۔ریسرچ کے دوران ان کے والد صاحب اچانک گر گئے جس کے سبب کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔تمام تر علاج ومعالجہ کے باوجود ٹھیک نہ ہو پائے اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی،اس سے نسیم اعظمی ذہنی اور معاشی طور پر بہت پریشان ہوئے،کافی دنوں تک ریسرچ کا کام بھی متاثر رہا۔اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

> ''ابا کے انتقال کے بعد گھریلو پریشانیوں کے سبب میرے ریسرچ کا کام نامکمل رہ گیا جب کہ نیر صاحب چاہتے تھے کہ میں ریسرچ کے ساتھ ساتھ ان کے علمی ادبی کاموں میں ہاتھ بٹاؤں تاکہ آئندہ وہ مجھے کہیں ایڈجسٹ کرا سکیں مگر ایسا شاید میری قسمت میں نہیں تھا۔'' 16

1995ء میں انھوں نے یو جی سی نیٹ کا امتحان پاس کیا۔اس زمانہ میں منفی نمبرنگ (مائنس مارکنگ) کے سبب کامیابی کافی مشکل تھی۔اسی سال ''اثر انصاری حیات اور خدمات'' کے موضوع پر ریسرچ کر کے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے حصول کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا انھیں خیال آیا،حسن اتفاق تھا کہ وہ بقید حیات تھے،چنانچہ اس بات کا تذکرہ ان سے اور ڈاکٹر منور انجم سے کیا۔دونوں حضرات نے ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔

پی۔ایچ۔ڈی کے لیے حسب ضابطہ پروانچل یونیورسٹی جونپور میں رجسٹریشن کی درخواست دی جو

منظور ہوگئی۔ ڈاکٹر منور انجم اور ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی کی اشتراکی نگرانی میں شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سینٹر سے پی۔ایچ۔ڈی کے ریسرچ کے کام میں لگ گئے اور ڈھائی سال کے اندر اپنا کام بھی مکمل کرلیا، مگر یونیورسٹی عملے کی ضابطے کی کاروائیوں میں تاخیر کے سبب انھیں کو 2000ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔

ان کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ''آثر انصاری حیات اور خدمات'' 2007ء میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی (حکومت اتر پردیش) کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی اور آثر انصاری صاحب کی خواہش تھی کہ مقالہ جلد از جلد شائع ہو جائے مگر ایسا ان کی قسمت میں نہ تھا کیوں کہ دونوں حضرات کے رحلت فرما جانے کے بعد اس مقالہ کو شائع ہونے کا موقع ملا مگر دیر آید درست آید کا مصداق بنا کیوں کہ علمی وادبی حلقوں سے انھیں داد تحسین ملی اور اس طرح رفتہ رفتہ انھوں نے علم وادب کے قدر دانوں میں اپنا ایک مقام بنالیا۔

ملازمت

حراء ایجوکیشنل اینڈ کلچر سوسائٹی کے زیر انتظام جمال پورہ (مئو) میں جناب وکیل احمد صاحب کے احاطہ میں نسیم اعظمی کی زیر نگرانی حراء پبلک اسکول کا بھی قیام ہوا۔ ان کے طریقہ تعلیم کے سبب ایک سال کے قلیل مدتی تعلیم وتدریسی خدمات کے نتیجہ میں شہر کا ممتاز اسکول شمار کیا جانے لگا۔ سوسائٹی کا باقاعدہ رجسٹریشن بھی ہوگیا تھا کہ اچانک ملازمت کے سلسلہ میں انھیں کو نومبر 1996ء میں جونپور جانا پڑا، پھر اپنی تدریسی خدمات کے سلسلہ میں انھیں وہیں سکونت اختیار کرنی پڑی اور اس طرح وہ وہیں تشنہ گان علم کی پیاس بجھانے میں لگے رہے لوگ ان کی تدریسی خدمات سے خوب فیضیاب بھی ہوئے۔ طبیعت کی ناسازی کے سبب 2017ء میں قبل از وقت وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ملازمت سے قبل ایک چھوٹے گھریلو قسم کے کاروبار سے وابستہ رہے جس میں ان کا ''نکھار پریس'' خاص طور سے مشہور تھا جو تجارتی طباعت کا کام کرتا تھا، اس کے علاوہ ماہنامہ ادبی نکھار شائع ہوتا تھا اور علمی وادبی کتابوں کی اشاعت کا کام بھی ہوتا تھا۔

1980ء سے 1995ء کے دوران ہندوستان بھر کے تقریباً چونسٹھ علمی وادبی اور شعوری کتابیں نکھار پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوئیں اور ہندوستان کی کئی اکیڈمیوں نے بطور ادبی پبلیشر انھیں انعام سے بھی نوازا۔ پریس کا کاروبار کافی مصروفیت والا تھا اور اس مصروفیت کے باعث نسیم اعظمی جو تحریری کام کرنا چاہتے تھے وہ کر نہیں پا رہے تھے، ان کے بیشتر دوست احباب اردو ٹیچر اور اردو مترجم کی حیثیت سے سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے تھے۔

نسیم اعظمی ملازمت کے قائل نہیں تھے اسی درمیان جونپور کے ایک اسکول میں ٹیچر کی اسامی نکلی، ان کے دوستوں نے بطور ڈاک درخواست بھجوائی۔ انٹر یو کی تاریخ آئی اور انٹر یو میں کامیاب بھی ہو گئے، بالآخر دوستوں کے اصرار پر انھوں نے تدریسی خدمات کا آغاز کیا۔ 25/نومبر 1996ء سے ''مدرسہ رفیق الاسلام'' گورا بادشاہ پور جونپور میں بحیثیت نائب مدرس عالیہ کے خدمات انجام دے رہے تھے، اسی اثناء میں انھوں نے اپنا تحریری کام بھی جاری رکھا اور ان کی اس طرح سولہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

2010ء سے 2016ء تک انھوں نے عالمی اردو مجلّہ ''ادبی گزٹ'' کی اشاعت میں بھی معاونت کی اور اب 2017ء سے ان کی نگرانی و سرپرستی میں ان کی بیٹی ڈاکٹر عدیلہ نسیم اور ان کے ہر دالعزیز شاگرد ظہیر حسن ظہیرؔ سہ ماہی ''تخلیق و تحقیق'' کی اشاعت کر رہے ہیں جو ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ایک ممتاز حیثیت کا حامل اردو رسالہ تصور کیا جاتا ہے اور جسے ہندوستان کے اور بیرون ملک کے نئے پرانے اردو قلم کاروں کا تعاون بھی حاصل ہے۔

نکاح و شادی

مئو ناتھ بھنجن میں شادی بیاہ مسلمانوں کے یہاں نہایت سادگی سے کی جاتی ہے، عموماً بارات وغیرہ کا رسم نہیں ہے اور دیگر بہت ساری چیزیں جو دوسرے علاقوں میں اس موقع پر نظر آتی ہیں وہ چیزیں یہاں نظر نہیں آتیں۔ ''مئو شہر ہنرواں'' کے مصنف ڈاکٹر شکیل احمد اس دور کی شادی بیاہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مئو ناتھ بھنجن میں شادی کی تقریب بارات کے ذریعہ انجام پائے یا
> بغیر بارات کے۔ لڑکے والوں کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں

ہوتا۔حالانکہ لڑکی والے اس موقع پر اپنی بساط کے مطابق بیٹی کو سامان دیتے ہیں۔شادی بارات کے ذریعہ مکمل ہو یا بغیر بارات کے ہر دو صورت میں لڑکے والے کی طرف سے دوسرے شہروں کے مسلمانوں کی طرح یہاں سامان دینے، کھانے یا بارات ٹھرانے سے متعلق کوئی مطالبہ نہیں ہوتا۔'' 17؎

دوسری جگہ ولیمہ تیار کرنے اور سماجی تعاون کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولیمہ اور شادی کی تقریب مئوناتھ بھنجن کے معاشرے میں اجتماعی تعاون کی عمدہ مثال ہے۔شادی کا اہتمام بڑے پیمانے پر ہو یا مختصر پیمانے پر ہر دو صورت میں پڑوس محلّہ اور عزیز دار تقریب کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔صرف روٹی پکانے والے اجرت لیتے ہیں۔اس کے علاوہ تقریب میں اجرت پر کوئی اور کام نہیں ہوتا کھانا بنانے والے بھی اعزازی خدمت پیش کرتے ہیں۔مہمانوں کی ضیافت کا پورا انتظام سنبھالنے والے ذمہ داری کے ساتھ کام کرتے ہیں۔عموماً ولیمہ دوپہر میں ہوتا ہے۔مگر ایک روز پہلے شام سے ہی تقریب کا آغاز ہوجاتا ہے۔اگلی صبح کا ناشتہ گوشت اور روٹی کا ہوتا ہے۔دوپہر میں ولیمہ اور اجتماعی دعوت ہوتی ہے جس میں سینکڑوں لوگ مدعو ہوتے ہیں جو گوشت روٹی چاول پر مشتمل ہوتی ہے۔

مئو میں شادی گھر اور ہوٹل میں شادی کی تقریب نہیں ہوتی۔اس مقصد سے یہاں کوئی انتظام بھی نہیں ہے جو خوش آئند بات ہے جس کے یہاں تقریب ہوتی ہے اگر اس کے پاس کشادہ جگہ موجود ہے تو ولیمہ کا انتظام وہیں پر کیا جاتا ہے۔اگر جگہ کی کمی ہے تو پڑوس کے گھروں میں سے حسب ضرورت انتخاب کرکے مدعوئین کے کھانے کا وہیں انتظام کیا جاتا ہے۔'' 18؎

نسیم اعظمی کا نکاح بھی سادگی سے گھر پر ''رضوانہ خاتون'' بنت صغیر احمد سے 13/جون 1981ء

کو ہوا۔ مئو کے رواج کے مطابق شادی بیاہ کے انتظامات ہوئے۔ان کی سسرال مئوناتھ بھنجن کے ہی علاقہ محلّہ پٹھان ٹولہ میں واقع ہے۔ابوالماثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اسی علاقہ سے تعلق رکھتے تھے جن کی شخصیت علمی حلقہ میں محتاج تعارف نہیں، وہ فن حدیث شریف میں یکتائے روزگار تھے اور اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

رضوانہ خاتون پڑھی لکھی اور زمیندار گھرانہ سے تعلق رکھنے والی خاتون ہیں۔ان کے والد صغیر احمد کا شمار مئوناتھ بھنجن کے زمیندار گھرانوں میں ہوتا تھا،ان کے بھائی محمد عرفان اور محمد اجمل تجارت کے میدان میں اہلیان مئو میں بہت مشہور ومعروف ہیں۔پاورلوم بی۔ٹی۔آئی کے نام سے ہی آپ لوگ جانے وپہچانے جاتے ہیں۔

ازدواجی زندگی

نسیم اعظمی کی ازدواجی زندگی بڑی معتدل رہی ہے،ان کا کنبہ بھی بہت مختصر ہے جو میاں بیوی اور ایک بیٹی پر مشتمل ہے۔نسیم اعظمی اور ان کی شریک حیات رضوانہ خاتون کے تعلقات بڑے خوشگوار ہیں۔

رضوانہ خاتون (بیوی) گھر پر مئو میں ہی رہتی ہیں خود نسیم اعظمی ضلع جونپور میں مدرس تھے اور ہفتے کی چھٹی اور دیگر چھٹیوں میں گھر آتے جاتے تھے اور ان کی لڑکی بنارس ہندو یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی، کنبے کے تین افراد تین جگہوں پر ہونے کے باوجود چھٹی میں ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔

رضوانہ خاتون ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں مگر گھریلو زندگی بشر کرتی ہیں جس سے دونوں کی ازدواجی زندگی بڑی پرسکون رہی ہے۔

اولاد

اللہ نے انھیں چار اولادیں دیں جن میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔مگر اللہ کو کچھ یوں منظور ہوا کہ تین کو عہد طفلی میں ہی اپنے پاس بلا لیا،اب صرف ان کی ایک بیٹی ''عدیلہ نسیم'' بقید حیات ہے، جو اس وقت بنارس ہندو یونیورسٹی سے ''قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری'' کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کر چکی ہیں۔اپنے گھریلو پس منظر کا ذکر نسیم اعظمی کچھ یوں کرتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے مجھے چار اولاد عطا کیں دولڑکے اور دولڑکیاں مگر دولڑکوں اور ایک لڑکی کو عہد طفلی میں ہی اپنا پیارا بنا لیا اب صرف میری ایک اولاد عدیلہ نسیم رہ گئی ہے جو ایم۔اے کر چکی ہے اور ہم میاں بیوی کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہے شاید خدا کی یہی مرضی تھی'' مرضئ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔'' 19ے

ادبی سفر کا آغاز

1973ء کے آس پاس نسیم اعظمی نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ان دنوں شہر کے بنکروں کی حالت خراب تھی،کاروبار مندی کا شکار تھا،ہندو پاک جنگ (بنگلہ دیش) کی وجہ سے پناہ گزینوں کی کثرت ہوگئی تھی جس کے سبب ملک معاشی بحران سے دوچار تھا،انھیں حالات سے متاثر ہوکر اہل قلم حضرات کہانی لکھ رہے تھے۔نسیم اعظمی نے بھی بنکروں کی زبوں حالی سے متاثر اپنا پہلا افسانہ لکھا (جس کا عنوان معلوم نہ ہوسکا) جو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے اخبار''حیات'' میں شائع ہوا۔جس کے متعلق وہ خود رقم طراز ہیں:

''بنکروں کی زبوں حالی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا چنانچہ انھیں حالات سے متاثر ہوکر کہانی پڑھتے پڑھتے میں نے افسانہ لکھنے کی کوشش کی اور زندگی کا پہلا افسانہ لکھا (عنوان یاد نہیں)۔ایک دن اتوار کی شام دریائے ٹونس کے کنارے ریلوے پل (لال پل) کے نیچے جہاں میرے علاوہ جناب آثر انصاری مولوی عطاء الرحمٰن (مرحوم) اور مولوی عزیزالرحمٰن وغیرہ موجود تھے میں نے اپنے افسانہ لکھنے کا مژدہ سنایا۔ مذکورہ حضرات نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے افسانہ سنانے کی فرمائش کی میں پہلے ہی سے اپنی اس پہلی نثری تخلیق سنانے کے لیے بے چین تھا چنانچہ پورا افسانہ پڑھ کر سنایا،آثر انصاری نے اس میں بعض تبدیلیوں کا مشورہ دیا جو فوری طور پر کردی گئی۔اس کے بعد انھوں نے ہدایت کی کہ دوسطروں کے درمیان مناسب جگہ چھوڑ کر اور صفحہ کے ایک طرف

> صاف صاف لکھ کر یہ افسانہ جناب پرانے مختار لائبریرین کو دیدینا میں
> ان سے کہدوں گا وہ کسی اخبار یا رسالے میں شائع کرادیں۔''

آثر انصاری کی ہدایت پر انھوں نے عمل کیا لیکن جب ان کی پہلی نثری تخلیق شائع ہوئی تو تخلیق کار کا نام کچھ اور تھا جو دانشتہ کیا گیا تھا۔نسیم اعظمی کو اس واقعہ سے بے حد دکھ پہنچا پھر اس کے بعد انھوں نے کہانی لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔اسی واقعہ کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے ان کی ہدایت کے مطابق افسانہ صاف صاف تحریر کر کے آثر صاحب کے حوالے سے موصوف کے سپرد کر دیا۔کئی ہفتوں بعد مذکورہ افسانہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ہفت روزہ اخبار''حیات'' میں شائع ہوا مگر افسانہ نگار کا نام یم نسیم اعظمی کے بجائے نسیم مختار طبع تھا۔میں نے آثر صاحب سے شکایت کی انھوں نے مختار صاحب سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ ایسا دانشتہ کیا گیا ہے۔آثر صاحب کو بھی افسوس ہوا اور میں اس واقعہ سے ایسا دل برداشتہ ہوا کہ پھر کبھی کوئی کہانی نہیں لکھی۔''

اس واقعہ کے بعد انھوں نے افسانہ نگاری کا ارادہ ترک کر دیا اور پھر مختلف اخباروں میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھتے رہے۔1975ء میں خود اپنا رسالہ ادب نکھار کا اجراء کیا اس کے اداریے اور دوسرے مضامین بھی لکھتے رہے، ان کا یہ رسالہ 1989ء میں ماہنامہ سے ہفت روزہ بن گیا اور دوسال کے بعد 1991ء میں بعض حالات کی وجہ سے بند ہو گیا،اس کے بعد نسیم اعظمی سماجی ،تدریسی و تصنیفی کاموں میں لگ گئے۔

حراء ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی ،حراء پبلک اسکول کی طرف توجہ دینے کے بعد پھر ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال پر گہرائی سے مطالعے میں لگ گئے اور مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنا شروع کیا۔2001ء سے انھوں نے باقاعدہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر مضمون لکھے جو اس وقت کے اخباروں و رسالوں میں چھپتے رہے۔

تعلیم پر ان کی پہلی کتاب ’’تعلیمی تجزیے‘‘ کے نام سے شائع ہوئی۔اس طرح یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا اور وہ تعلیم ،شاعری، تنقید اور ادب کے مختلف موضوعات پر بدستور لکھتے رہے۔ 2010ء میں عالمی ادبی گزٹ نکالا جس کے سات ضخیم شمارے شائع ہو چکے ہیں۔آج کل اپنی نگرانی میں سہ ماہی تخلیق و تحقیق کی اشاعت میں سرگرم ہیں اور اب تک ان کی سولہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔مسلمانوں کی تعلیم کے مختلف موضوعات پر بہت سے مضامین اور مختلف قسم کی کتابوں پر تقریباً سو تبصرے تحریر کر چکے ہیں،ان کا تخلیقی و تحریری سفر بدستور وفات تک جاری رہا اور کئی کتابیں ابھی بھی اشاعت کی منتظر ہیں۔

ان کی کتابوں کی فہرست تاریخی ترتیب سے درج ذیل ہے:

آثر انصاری فکر و فن کے آئینے میں	1998ء
نوائے سروش	2001ء
تعلیمی تجزیے	2002ء
تعلیمی جہات	2006ء
آثر انصاری حیات اور خدمات	2007ء
مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات	2008ء
نقد سخن	2010ء
میزان آگہی	2011ء
تعلیم اور تعلیمی افکار	2011ء
آثر انصاری پر چند تحریریں	2011ء
تعلیمی نکات	2013ء
تعلیمی اشارات	2014ء
اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ	2015ء
راجا رام موہن رائے اور ان کے تحریکی و تعلیمی کارنامے	2016ء

فیضانِ آگہی	2016ء
اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزیہ	2017ء
نقد ریزے	(زیرِ طبع)
عکس و آئینہ (تبصروں پر مشتمل مجموعہ)	(زیرِ طبع)
نظیر اکبر آبادی شخصیت و شاعری کے چند پہلو	(زیرِ طبع)

نسیم اعظمی کی کتابوں کے انتسابات

نسیم اعظمی نے اپنی پہلی تصنیف ''اثر انصاری فکر و فن کے آئینے میں'' کو اپنے والدین کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کیا ہے:

> ''والد محترم جناب عبدالعلیم (مرحوم) اور والدہ محترمہ بی بی قریشہ کے نام، جن کی محبت و شفقت نے بے پناہ مشقتوں کے باوجود نعمت علم سے روشناس کیا۔''

دوسری کتاب ''نوائے سروش'' کا انتساب ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''اثر انصاری کے دادا مولانا سلطان احمدؒ بانی دار العلوم مئو کے نام جن کی کوششوں سے محنت کش بنکروں کی اس بستی میں علم و آگہی کا چراغ روشن ہوا اور پھر چراغ سے چراغ جلانے کی عظیم روایت قائم ہوئی۔''

تیسری تصنیف ''تعلیمی تجزیے'' کا انتساب الحاج شبیر احمد ایڈوکیٹ کے نام ہے۔ جو ٹریڈ ٹیکس وانکم ٹیکس افسر تھے۔ چوتھی کتاب ''تعلیمی جہات'' کو اپنے والد محترم جناب عبدالعلی (مرحوم) کے نام ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''ابا مرحوم کے نام''

پانچویں کتاب ''اثر انصاری حیات و خدمات'' کو اپنے اشتراکی نگراں ڈاکٹر اشفاق احمد (مرحوم) اور ڈاکٹر منور انجم کے نام منسوب کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات اپنے اپنے کالج میں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔

چھٹی کتاب ''مولانا قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات'' کو علم دوست اور ادب نواز حاجی امتیاز احمد کے نام معنون کیا جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری اکیڈمک سینٹر کے سکریٹری تھے۔

ساتویں کتاب ''نقد سخن'' کو اپنی شریک حیات رضوانہ کے نام معنون کیا ہے۔

آٹھویں تصنیف '' میزان آگہی'' جو نسیمؔ اعظمی کا پہلا شعری مجموعہ ہے، اس کا انتساب مشہور و معروف شاعر و استاد الحاج ابوبکر اثرؔ انصاری کے نام اپنے اشعار کے ساتھ کیا ہے:

الحاج اثرؔ انصاری مرحوم کے نام

زباں میں کس قدر قند و شکر تھی
اثرؔ کی بات کتنی با اثر تھی
نسیمؔ غم زدہ سے کوئی پوچھے
کہ اس کی ذات کتنی معتبر تھی

نویں کتاب ''تعلیم اور تعلیمی افکار'' کو اپنی بیٹی عدیلہ نسیم کے نام معنون کیا ہے۔ دسویں کتاب ''اثرؔ انصاری پر چند تحریریں'' کا انتساب علم دوست اور ادب نواز شخصیت جناب ریاض شیخ (سوامنی) پونے کے نام ہے۔

گیارہویں کتاب ''تعلیمی نکات'' کو اپنے ہر دلعزیز اور چہیتے شاگرد کے نام معنون کیا ہے جس نے قدم قدم پر بیٹے کی خلاء کو پر کرنے میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ چھوڑی، انتساب بایں الفاظ ہے:

''عزیزی ظہیر حسن ظہیرؔ کے نام

آسمان آگہی پر بھی چلے سکہ ترا
اور زمین علم و فن سے بھی ترا رشتہ رہے

ایم نسیمؔ اعظمی

بارہویں کتاب ''تعلیمی اشارات'' کو اپنے استاد محترم جناب ڈاکٹر انیس ادیبؔ کے نام معنون کیا ہے اور ساتھ ہی علامہ اقبالؔ کے اس شعر سے اپنے استاد کی شخصیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

نگہ بلند، سخن دل نواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

تیرہویں کتاب ''اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ'' کو اپنے بڑے بھائی حاجی اشرف علی (مرحوم) کے نام منسوب کیا ہے اور ساتھ میں یہ شعر بھی نذر کیا ہے۔

نگارشات کی حجت تمام کرتا ہوں
قلم برادر اشرف کے نام کرتا ہوں

چودہویں کتاب ''راجا رام موہن رائے اور ان کے تحریکی و تعلیمی کارنامے'' کا انتساب طالب علموں کے نام ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''عہد حاضر کے ان تمام نوجوانوں اور طالب علموں کے نام جو زندگی و معاشرت کے کسی بھی شعبے میں مصلحت اندیشوں، گروپ بندیوں، اور دیگر منفی سہارے کے بغیر محض اپنی صلاحیتوں اہلیتوں اور محنتوں کی بدولت اپنی منفرد اور ممتاز شناخت بنانے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔''

پندرہویں کتاب ''فیضان آگہی'' کا انتساب مئو شہر کے مشہور شاعر ماہر عبدالحی (مرحوم) کے نام ہے۔ نسیم اعظمی نے ان کی طرف اپنا ایک شعر بھی منسوب کیا ہے۔

فکر اس کی ہمالیہ کی طرح
آدمی تھا تو منحنی جیسا

سولہویں کتاب ''اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزیہ'' کو اپنے مرحوم بچوں کے نام منسوب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جو خوردسالی میں ہی داغ مفارقت دے گئے جن کی یادیں ہی اب میرا سرمایہ ہیں۔''

سماجی وفلاحی خدمات

1984ء میں مئو کے اندر فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تھا جس کی وجہ سے کافی تباہی و بربادی

ہوئی،سکون وچین کے غارت ہونے کے ساتھ ساتھ وسائل و ذرائع حیات بھی برباد ہوگئے تھے اس میں نسیم اعظمی نے فیض الحسن ابن ریاض احمد ابن عبداللہ، بقا اعظمی، ماسٹر عبدالجبار وغیرہ کو لے کر بڑے پیمانہ میں ریلیف جمع کرنے کا کام کیا اور مئو کے گردونواح کے علاقوں میں جو لوگ تباہ و برباد ہوگئے تھے ان کی باد آبادکاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اسی طرح 1992ء میں بابری مسجد کی شہادت کے زمانے میں مئو میں جو فساد ہوا اس وقت نسیم اعظمی ضلع پتر کار سمیتی کے جنرل سکریٹری تھے۔انھیں کرفیو پاس دیا گیا تھا، انھوں نے گھوم گھوم کر شہر میں امن وامان قائم کرنے کی کوششیں کیں وہیں مختلف اسپتالوں میں جا کر تیمارداریاں بھی کی اور ضرورت کی چیزیں بھی پہنچائیں۔اس کے علاوہ بھی انھوں نے شہر میں ہونے والے چھوٹے بڑے فلاحی کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے ہم عمر لوگوں کی رہنمائی بھی آخری عمر تک کرتے رہے۔

انھوں نے بہت پہلے انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی تحصیل سطح کی شاخ قائم کی۔ڈاکٹر دویندر ناتھ پانڈے صدر اور نسیم اعظمی اس کے سکریٹری مقرر کیے گئے۔اسی زمانہ میں کانگریس کا ایک بہت بڑا اجلاس تمسا ندی اس پار ادری روڈ پر منعقد ہوا تھا جس میں ''ہیموتی نند بہوگنا'' بحیثیت وزیراعلیٰ اتر پردیش اور ''نرائن تیواری'' بحیثیت وزیر مالیات اتر پردیش شریک ہوئے تھے۔نسیم اعظمی کی سربراہی میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا گیا اور مولانا حبیب الرحمٰن نعمانی اور وصی احمد نعمانی کے توسط سے ہیموتی نند بہوگنا سے تعلقات قائم ہوئے جو ان کی زندگی تک قائم رہے۔اسی قسم کے خوشگوار تعلقات نرائن تیواری اور ان کی بیوی سے بھی رہے جو اس زمانے میں سی۔ایم۔او تھیں۔

علمی،ادبی،ثقافتی اور صحافتی سرگرمیاں

درجہ پنجم کی طالب علمی کے زمانے میں ہی انصار لائبریری اور آزاد لائبریری جو عرصہ سے بند تھیں اس کی کتابیں یکجا کر کے انصار لائبریری ہی کے نام سے از سر نو زندہ کیا، یہ لائبریری دیکھتے ہی دیکھتے قرب وجوار کے طالب علموں اور مطالعہ کے شائقین کا مرکز بن گئی،لیکن کچھ سالوں بعد لائبریری کے ذمہ دار نوجوانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تو آپ اور آپ کے دوست مولانا حسام الدین صاحب (استاد مدرسہ تعلیم الدین مئو) نے لائبریری سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ان دونوں حضرات کے الگ ہو جانے کے بعد لائبریری

میں زوال آنا شروع ہوا اور یہ لائبریری ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔

صحافت نگاری کے میدان میں نسیم اعظمی نے اس وقت قدم رکھا تھا جب ان کی عمر صرف سترہ برس کی تھی۔ چونکہ دوران تعلیم نصابی کتب کے علاوہ اپنے ذوق وشوق کے مطابق جی بھر کر علمی وادبی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا بھی اپنے آپ کو عادی بنالیا تھا جس کی وجہ سے ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں ہی ''نکھار'' نامی ایک قلمی ماہنامہ 1975ء میں نکالنا شروع کر دیا جو تین شماروں تک قلمی رسالہ رہا۔

10/ اکتوبر 1975ء میں جامعہ عالیہ عربیہ کے ہال میں مولوی عبدالباقی (ایم-ایل-اے) کے ہاتھوں اس رسالہ کی رسم اجراء ادا کی گئی اور دوسال تک یہ رسالہ ''نکھار'' کے نام سے ہی نکلتا رہا۔

1977ء میں یہ رسالہ رجسٹرڈ ہوا لیکن ''نکھار'' کے بجائے ''ادب نکھار'' ہوگیا، یہ ماہنامہ رسالہ 1989ء سے ''ہفت روزہ ادب نکھار'' ہوا، پھر 1991ء میں ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گیا۔ آثر انصاری صاحب اس کے مدیر اعزازی تھے۔

1975ء سے 1991ء تک نسیم اعظمی نے ''نکھار پبلی کیشنگ'' اور ''نکھار ادبی ایوارڈ'' کی نظامت بحسن خوبی انجام دیں۔ نکھار پبلی کیشنگ کے زیر اہتمام کئی معیاری کتابوں کی اشاعت ہوتی رہی۔ نکھار ادبی ایوارڈ بھی ان کی ادبی شخصیت کی غمازی کا ضامن ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''نکھار ادبی ایوارڈ بھی ایک روشن کرن کی طرح موصوف کی ادبی شخصیت کی ایک مخصوص جہت کے نکھار میں اضافہ کرتا ہے۔ ایک گولڈ میڈل کی شکل میں پہلا نکھار ادبی ایوارڈ آثر انصاری کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ 1982ء میں دوسرا ایوارڈ معروف افسانہ نگار شاکر کریمی کو ان کے وطن بیتیا (بہار) میں انعقاد پذیر کل ہند مشاعرے میں بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہو کر ایم نسیم اعظمی نے خود اپنے ہاتھوں تفویض کیا۔ 1983ء میں تیسرا ایوارڈ عبید قمر کو ان کے افسانوی مجموعہ ''آخری کش'' پر پٹنہ میں گورنر بہار اخلاق الرحمٰن قدوائی کے ہاتھوں دیا گیا۔''

ادارہ ''ادب نکھار'' کے زیر اہتمام فروری 1981ء میں انھوں نے آثر انصاری کی کتابوں کی رسم

اجراء کے سلسلہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد کیا، جس میں کرشن موہن، وامق جونپوری، انجم عرفانی، والی آسی متعدد نامور شعراء نے شرکت کی۔ مگر یہ مشاعرہ شعراء وسامعین کی موجودگی کے باوجود کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکا، کیوں کہ مئوناتھ بھنجن کی یہ ایک اپنی پرانی روایت رہی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا، بڑے سے بڑا مشاعرہ ہو یہاں کی عوام تن، من، دھن کے ساتھ شریک ہوتی ہے اور اسے پھر شور شرابہ وہنگامہ کے نذر کر دیتی ہے۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا انعقاد کیا ہوا مشاعرہ تھا۔ اس کے بعد مشاعروں کے ذریعہ اردو کی خدمت کا دوبارہ ارادہ پھر کبھی نہیں کیا۔

1990ء کے آس پاس سید حامد (وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کی تحریک شروع کی۔ سید حامد اور پروفیسر عتیق احمد صدیقی اور ان کا تعلیمی کارواں کئی بار مئو ان سے ملنے آیا۔ اسی تعلیمی تحریک سے متاثر ہوکر مقامی طور پر تعلیمی بیداری کی اس مہم میں انھوں نے اپنے طور پر کوششیں شروع کیں اور اس کے کوشاں رہے کہ قوم میں تعلیمی بیداری پیدا ہو، تاکہ ملت ترقی کی منزلیں طے کر سکے اور دیگر ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بہ شانہ چل سکے۔

1991ء میں مولانا محفوظ الرحمٰن مفتاحی کی سرپرستی ونگرانی میں ایک تعلیمی اور ثقافتی تنظیم اور ادارہ کے قیام کا منصوبہ تیار کیا اور اس سلسلہ میں تعلیمی کوششیں بھی شروع کر دی مگر ابھی تنظیم کی باقاعدہ تشکیل نہیں ہو پائی تھی کہ 6/دسمبر 1992ء کا شرمناک اور جاں سوز سانحہ بابری مسجد کی شہادت کا رونما ہوا اور سارا کا سارا منصوبہ التواء میں پڑ گیا۔ 1993ء کے وسط میں اس سلسلہ میں پھر سعی وکوشش شروع کی اور مولانا محفوظ الرحمٰن مفتاحی کی نگرانی اور ان کی کنویز شپ میں حراء ایجوکیشنل اینڈ سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔

2007ء سے برابر ڈاکٹر مختار احمد انصاری اکیڈمک سینٹر کی صدارت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں اور تا حال اس عہدے کو زینت بخشے ہوئے ہیں۔

اسی طرح 2010ء میں نسیم اعظمی کو آثر انصاری اکیڈمی کے نائب صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا اور وہ اپنی عمر کی آخری منزل تک اس عہدے پر فائز رہے۔

2010ء میں انھیں کو اردو ادب کے تعلق سے ایک مجلّہ کی شکل میں اردو کی خدمت کرنے کا خیال

آیا لہذا انھوں نے عالمی اردو مجلّہ ''ادبی گزٹ'' شائع کرنے کا عزم بالجزم کرلیا اور اسی سال سے اس کی ادارت کرتے ہوئے اس مجلّہ کو اردو حلقہ میں اس قدر مقبول کیا کہ وہ ہندوستان کے ہر بڑے اور مشہور اداروں اور لائبریریوں کی میز پر نظر آتا رہا۔

2017ء سے ان کی نگرانی میں سہ ماہی عالمی، علمی ادبی اور تحقیقی اردو جریدہ ''تخلیق و تحقیق'' شائع ہوا۔ جو عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ کے بند ہونے کے بعد شروع ہوا۔ جب تک وہ زندہ رہے ان کی سرپرستی میں یہ رسالہ نکلتا رہا اور آج بھی وہ رسالہ جاری ہے۔

اخبار و رسائل کی ایڈیٹنگ و انٹرویز

1975ء سے 1989ء تک ماہنامہ'' ادب نکھار'' کی ادارت کی اور اسے ملک گیر شہریت عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1989ء سے 1991ء تک ہفت روزہ ''ادب نکھار'' کی ادارت فرمائی اور ادب، تعلیم، تہذیب اور ثقافت کے مختلف موضوعات پر موقع و محل کے مطابق موثر اداریہ تحریر کیے۔

ادب نکھار کی اشاعت کے دوران مختلف شاعروں، ادیبوں، ماہرین علم و فن اور سماجی و سیاسی شخصیتوں سے انٹریو بھی لیے جو ادب نکھار اور دوسرے اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی تحریریں صاف، سادہ اور سلیس رہتی ہیں جس سے پڑھنے والوں کو افہام و تفہیم میں دشواری نہیں ہوتی۔

ریڈیو پروگراموں میں شرکت

نسیم اعظمی نے آل انڈیا ریڈیو گورکھپور کے مختلف پروگراموں میں شرکت کی اور ادب و تعلیم کے موضوع پر اپنے مضامین پیش کیے۔

ادبی جلسوں میں شرکت

نسیم اعظمی گذشتہ تیس سالوں میں شہر مئوناتھ بھنجن اور قرب و جوار کے علمی و ادبی مجلسوں میں متعدد بار شریک ہو چکے ہیں اور مختلف موضوعات پر تقریریں بھی کی ہیں، گذشتہ دس پندرہ سالوں سے وہ عام طور پر اسکول، مدارس اور دیگر تعلیمی اداروں میں بحیثیت مہمان خصوصی یا اعزازی مسلسل شرکت کر چکے ہیں اور

ہندوستان کے مسلم اقلیت کے تعلیمی مسائل پر بڑی اچھی اور معلوماتی گفتگو اور تقریریں بھی کیں۔

تعلیم میں تعلیمی اداروں کے کردار، سرپرستوں کی ذمہ داریاں، اساتذہ کی کوششیں اور معاشرہ کے ماحول پر ان کی گہری نظر رہتی ہے اور اسی معاملے میں وہ اپنی تقریروں میں بڑی اہم باتیں بتاتے ہیں۔ مختلف عمر کے طالب علموں کے لیے، ان کے تعلیمی مزاج، ان کی نفسیات اور ان کے اخذ کرنے کی اہلیت کے بارے میں وہ بڑی ماہرانہ گفتگو کرتے ہیں۔ مختلف مسابقاتی امتحانوں میں مسلم بچے کس طرح کامیاب ہونگے اور انھیں اس کے لیے کیا کیا جتن کرنے ہونگے اس بارے میں بھی وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں معلومات فراہم کرتے ہیں اور عملی طور پر ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

تعلیمی اداروں سے وابستگی

نسیم اعظمی بنیادی طور پر ایک استاد ہیں اور تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر ان کی گہری نظر ہے۔ تعلیم سے متعلق ان کے اکثر مضامین اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے متاثر ہوکر مختلف مسلم اقلیتوں کے تعلیمی ادارے انھیں مختلف موقعوں پر مدعو کرتے رہے اور وہ ان میں شریک بھی ہوتے رہے۔ انھوں نے خود بیسویں صدی کے آخری دور میں حراء پبلک اسکول قائم کرکے چھوٹے بچوں پر نئے تعلیمی تجربہ کی کوشش بھی کی، قرب و جوار کے متعدد ادارے ان کو اپنے یہاں وابستہ کرنے کی دعوت بھی دی لیکن انھوں نے کسی کی باقاعدہ وابستگی قبول نہیں کی۔ مئو کے مدارس میں اہم مدرسہ دارالعلوم شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مجلس عمومی کے وہ ممبر بھی رہے ہیں۔

اس طرح مختلف تعلیمی ادارے ان کی وابستگی کے خواہاں ہوتے تھے لیکن وہ تعلیمی اداروں سے وابستگی سے زیادہ تعلیم اور تعلیمی اداروں کی اصلاح اور حالات وتقاضہ کے مطابق انھیں زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ مختلف تعلیمی ادارے مختلف موقعوں پر انھیں مدعو کرتے رہے ہیں اور وہ تعلیم کے مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار بھی ان موقعوں پر کر چکے ہیں لیکن ان اداروں سے باقاعدہ وابستگی سے گریز کرتے تھے، کیوں کہ وابستگی کے بعد عموماً آدمی کو مصلحت سے کام لینا پڑتا ہے اور کھل کر اظہار رائے سے گریز کرنا پڑتا ہے اور یہ چیز ان کی طبیعت سے ہم آہنگ نہیں تھی کیوں کہ وہ فطرتاً حق گو اور بیباک

واقع ہوئے ہیں۔

کانفرنسوں اور سیمیناروں میں مباحث وشرکت

ہندوستان کے مختلف سرکاری و نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے ہونے والے علاقائی نیشنل اور انٹرنیشنل مختلف سیمیناروں اور کانفرنسوں میں اگر چہ وہ شرکت کم کرتے تھے لیکن اس سے بالکل الگ بھی نہیں رہتے تھے۔انھوں نے اتر پردیش، بہار اور دہلی وغیرہ کے مختلف سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی اور کئی ادبی مذاکروں میں حصہ بھی لیا ہے اور اپنی دوٹوک اور مدلل باتوں سے لوگوں کو متاثر بھی کیا ہے جن میں بطور مثال چند سیمیناروں کی تفصیل درج ذیل ہے:

1- 8/اکتوبر 2004ء کل ہند تعلیمی سیمینار بہار شریف

2- 27-28/فروری 2008ء نیشنل ٹیسٹنگ سروس انڈیا (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

3- 24-25/اکتوبر 2009ء دارالمصنفین اعظم گڑھ

4- 19-20 فروری 2017ء شبلی کالج اعظم گڑھ

5- 14/مئی 2017ء قوت تعلیم انٹرنیشنل سیمینار اعظم گڑھ

6- 27/مارچ 2008ء میں فخر الدین میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش وغیرہ سیمیناروں میں شرکت بھی کی اور بحث ومباحثہ میں حصہ بھی لیا۔اس کے علاوہ کئی اور سیمیناروں، کانفرنسوں اور علمی وادبی مذاکروں میں شریک بھی ہوئے اور حصہ بھی لیا جن کی باقاعدہ تفصیل موصول نہ ہوسکی۔

سیر وسیاحت

نسیم اعظمی کو بچپن ہی سے گھومنے پھرنے کا شوق تھا،مختلف شہروں وہاں کی عمارتوں مسلمانوں کی تاریخی باقیات سے انھیں شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے۔پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے جونپور جو ایک تاریخی جگہ رہی ہے اور جہاں کی شرقی سلطنت کی شاندار تاریخ رہی اور جسے شیراز ہند بھی کہا گیا انھوں نے پہلی بار وہاں کا سفر کیا اور کئی روز رہ کر وہاں کی عمارتوں کو دیکھا اور وہاں کی تاریخ پڑھنے کی کوشش کی۔طالب علمی کے زمانے میں بنارس، رام نگر، گورکھپور اور لکھنؤ کا سفر کیا۔

1977ء میں دلی، بہار، بنگال اور ہریانہ کے مختلف علاقوں کا سفر کیا۔وہاں کے بارے میں جانکاری حاصل کی اور ادبی و علمی لوگوں سے تعلقات پیدا کیے۔اس کے بعد سفر و سیاحت عادت سی بن گئی۔ حتیٰ کہ کشمیر سے کنیا کماری تک کے بیشتر قصبوں اور شہروں کی سیر و سیاحت کی۔ 1977ء تا 1990ء تقریباً چودہ سالوں تک وہ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں گھومتے رہے اور رسالہ ''ادب نکھار'' کی توسیع و اشاعت میں سرگرم عمل رہے۔ان اسفار کا فائدہ یہ ہوا کہ رسالہ ہندوستان کا ایک اہم ادبی رسالہ بن گیا اور اردو قلم کاروں کی توجہ کا مرکز بھی۔

حلقہ احباب

نسیم اعظمی کا حلقہ احباب بہت وسیع ہے،اس میں آپ سے دلی تعلق رکھنے والے بھی ہیں اور کسب و فیض اٹھانے والے بھی اور وہ لوگ بھی جن کا تعلق ابھی چند ملاقاتوں کے بعد استوار ہوا ہے لیکن اخلاق کریمہ کی وجہ سے وہ حلقہ احباب میں ضم ہوکر دیرینہ تعلق والے معلوم ہوتے ہیں۔اس طرح ان کے جاننے والوں میں ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والے بہت سارے لوگ شامل ہیں۔

ان کی شخصیت بڑی پرکشش ہے اس لیے ان کے جاننے اور ماننے والوں کی ہندوستان بھر میں اور بیرون ملک میں اچھی خاصی تعداد ہے۔ان کے اپنے بزرگ ادباء، شعراء اور دانشوروں سے بھی بہت اچھے مراسم رہے ہیں۔وہ ان کے احباب میں تو نہیں آتے لیکن ایسے لوگ جن سے ان کی قربت رہی ہے اور جو لوگ ان کے ساتھ انتہائی مشفقانہ برتاؤ کیا کرتے تھے،ان میں اکثر لوگ اس دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں لیکن ان کے تذکرے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے نامور ادباء و شعراء سے مراسم بھی رکھتے تھے اور ان میں مقبول و ہر دالعزیز بھی تھے جن میں چند نام بطور مثال پیش ہیں:

جناب الحاج محمد ابوبکر آثر انصاری ، پروفیسر عنوان چستی۔ پروفیسر حکم چند نیر، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر امرت لال عشرت، پروفسر عبدالحق، پروفیسر فضل امام، پروفیسر مظفر حنفی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کرشن موہن، کمار پاشی، رام پرکاش راہی، پروفیسر محمود الٰہی سالک لکھنوی، رضا نقوی واہی، پروفیسر اسلم آزاد، پروفیسر عبدالمغنی، میجر علی حماد عباسی، ملک زادہ منظور، رام لعل، سرون کمار ورما، سید حامد (چانسلر)،

جوگندر پال، عابد سہیل، پروفیسر مغنی تبسم، سعید فریدی، ناظم جعفری، اسلم سہیل جونپوری، پروفیسر پی۔سی۔ وشوکرما، پروفیسر لال جی سنگھ، بشیر پردیپ، وامق جونپوری، پروفیسر مناظر ہرگانوی، پروفیسر عبدالغفار انصاری، ظہیر غازی پوری، پروفیسر صاحب علی، یوسف ناظم، ڈاکٹر حسن الدین احمد، ڈاکٹر علی جواد زیدی، پروفیسر علقمہ شبلی، منور رانا، شاکر کریمی، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر اختر بستوی، ڈاکٹر انیس ادیب، مولوی عطاء الرحمٰن، محمد اکرم، حبیب اللہ چیئرمین، اقبال احمد انصاری، اظہر انصاری، اشہر رام نگری، ڈاکٹر علیم مسرور، پروفیسر مولابخش، ڈاکٹر منور انجم، پروفیسر سلامت علی سلامت، جیلانی بانو، عابد رضا بیدار، پروفیسر یعقوب یاور، مولانا مجیب اللہ ندوی، قاضی اطہر مبارک پوری، مولانا ضیاءالدین اصلاحی وغیرہ۔

احباب کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا اس میں کئی انتقال کر گئے اور بہت سارے لوگ ابھی حیات ہیں جن میں چند اہم نام اس طرح ہیں:

بقاء اعظمی (مرحوم)، وکیل احمد، ماسٹر معراج، خورشید اختر، حاجی ظہر احمد، حاجی امتیاز احمد، انیس الرحمٰن، پروفیسر انور ظہیر انصاری، انیس انصاری ریٹائر (I A S) پریتال سنگھ بیتاب، آنند لہر، شرافت حسین، ایس۔ایم۔عباس، عرفان احمد، حاجی نثار احمد جونپوری، ابوذر انصاری، عبرت مچھلی شہری، پروفیسر عتیق الرحمٰن، مفتی انور علی، مولانا احمد اللہ، مولانا محفوظ الرحمٰن، منشی نیاز احمد، مولوی شمشاد احمد شاعر مفتاحی، ڈاکٹر شمشاد عنبر آفاقی، مولانا عزیز الرحمٰن حمیدی، اسلم ایڈوکیٹ، اظہر سلیم، گمان انصاری، محفوظ الرحمٰن عادل، ماہر عبدالحی، سردار شفیق، ڈاکٹر وکیل اشہر، سعید اللہ سعد، مبارک جونپوری، ڈاکٹر امتیاز احمد، محمد طیب پالکی (چیئرمین)، وسیم حیدر ہاشمی، اشتیاق سعید، اسیم جونپوری، ڈاکٹر عبدالقیوم شمشی، ڈاکٹر شکیل احمد، ڈاکٹر شباب الدین، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، ڈاکٹر شفیق اعظمی، حکیم وسیم احمد اعظمی، کلیم اشہر قدیر، نیاز جے راجپوری، اسعد بدایونی، شارق عدیل، عطا عابدی، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، سلطان اختر، ڈاکٹر جمیل دوشی، عبدالغنی شیخ (لداخ)، ڈاکٹر مخمور کاکوروی، عرفان زنگی پوری، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، کلیم شفاعت اصلاحی، ڈاکٹر محبوب راہی، ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی، ڈاکٹر شریف احمد قریشی، پروفیسر حمید احمد سہروردی، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، ڈاکٹر علیم صبا نویدی، پروفیسر احمد سجاد، طارق شمیم، شاد عباسی، وصی احمد نعمانی ایڈوکیٹ، حقانی القاسمی، پروفیسر علی احمد فاطمی،

تسکین زیدی، ڈاکٹر انیس مسرور، پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر محمد افراہیم، پروفیسر سید حسن عباس، ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر شفیق ندوی، طفیل انصاری، ڈاکٹر معصوم شرقی، ریاض شیخ سوامنی، ڈاکٹر بخیار نواز، ڈاکٹر راہی (حیدر آباد)، مشرف حسین محضر، عبد المتین جامی، ڈاکٹر غضنفر اقبال، م۔ لئیق انصاری وغیرہ۔

اعتراف خدمات وانعامات

تعلیمی میدان میں ترقی کرنے اور اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے نوجوان نسل خاص طور سے پریشان وسرگرداں رہتی ہے کہ وہ کون سی راہ اپنائے اور کون سی ڈگر پر چل کر آگے بڑھے کہ زمانہ کے دوش بدوش چل سکے بلکہ اپنے ہم عصروں پر فائق ہو سکے۔ نسیم اعظمی نے اس مسئلہ کو بڑی حسن اسلوبی کے ساتھ سلجھایا ہے اور ایسے طریقے بتائے ہیں جو مشعل راہ بلکہ راہ بر ثابت ہوتے ہیں۔ لہذا انھوں نے ''تعلیمی جہات'' کے نام سے جو کتاب لکھی وہ اپنے موضوع میں بڑی ہمہ گیر ہے۔ ان کی اس خدمت کے اعتراف میں ''بہار اردو اکادمی'' نے انھیں انعام سے نوازا ہے۔ اسی طرح ''تعلیم اور تعلیمی افکار'' اور ''تعلیمی جہات'' نامی کتابیں بھی ان کی تعلیمی نگاہ کی عکاسی کرتی ہیں ان کی ان خدمات کو سراہتے ہوئے ''اتر پردیش اردو اکادمی'' نے بھی انھیں انعام واکرام سے سرفراز فرمایا ہے۔

آثر انصاری صاحب کی حیات وخدمات پر انھوں نے اپنے پی۔ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ پیش کیا جس کا نام ''آثر انصاری حیات اور خدمات'' ہے اتر پردیش اردو اکادمی نے اس تحقیقی مقالہ پر انھیں انعام سے نوازا ہے۔

نسیم اعظمی کو ان کی علمی، ادبی و تعلیمی خدمات کے اعتراف کے طور پر مختلف اردو اکادمیوں، اداروں اور سوسائٹیوں نے انھیں جن مختلف اعزاز وانعامات سے نوازا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

1- بہار اردو اکادمی (حسن عسکری ایوارڈ) 2006ء

2- اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ (آثر انصاری حیات اور خدمات) 2007ء

3- اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ (تعلیم اور تعلیمی افکار) 2011ء

4-بہار اردو اکادمی (پروفیسر عبدالمغنی ایوارڈ) 2015ء

5-اتر پردیش اردو اکادمی (تعلیمی اشارات) 2015ء

6- آذرا کادمی علی گڑھ کا سپاس نامہ اور ''امین ادب'' کا خطاب۔2015ء

7- قلم کار ویلفیئر سوسائٹی (مئوناتھ بھنجن) کا ''تہنیت نامہ'' 2015ء

8-بہار اردو اکادمی (اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ) 2016ء

9- علمی، ملی، ثقافتی اور ممتاز کارکردگی سے متعلق محکمۂ اقلیتی فلاح و بہبود، وقف حکومت اتر پردیش کی سند امتیاز برائے ''راجیہ ادھیا پک پروسکار''۔2015-14ء

10- سند توصیف ''بزم حفیظ جونپوری'' 2019ء

وفات

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی عام لوگوں کی طرح صحت مند رہا کرتے تھے۔2016ء میں پہلی مرتبہ انھیں گردے میں تکلیف محسوس ہوئی اور داکٹروں سے رجوع کیا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ایس۔جی۔پی۔جی۔آئی لکھنؤ کے ڈاکٹروں کی تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ داہینے گردے پر کینسر کا اثر ہے۔ڈاکٹروں کی صلاح پر انھیں گردہ نکلوانا پڑا۔ایک گردہ کے نکل جانے کے بعد کچھ دنوں تک وہ ٹھیک رہے۔علاج و معالجہ چلتا رہا۔رفتہ رفتہ پھر مرض بڑھتا گیا تو ان کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں علاج کی غرض آنا جانا شروع ہوا۔علی گڑھ میں اپنے چہیتے شاگرد ظہیر حسن ظہیر جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہے تھے انھیں کے یہاں قیام کرتے تھے۔

علاج کے سلسلہ سے اپنی شریک حیات رضوانہ خاتون اور بیٹی عدیلہ نسیم کے ہمراہ 9/اکتوبر 2019ء کو مئو سے علی گڑھ روانہ ہوئے۔17/اکتوبر 2019ء بروز جمعرات دوپہر کے کھانے کے کچھ دیر بعد اپنی بیوی اور بیٹی سے حیدر آباد ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی اور اپنے بھتیجے مولانا شمیم صاحب جو وہیں مقیم ہیں ان کے یہاں ٹھرنے کی بات کی۔اس وقت ان کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ابھی بات پوری بھی نہیں ہو پائی تھی کہ اچانک سینے میں درد اٹھنے لگی تو انھیں فوراً لیٹا دیا گیا۔کچھ ہی منٹوں کے بعد سہ پہر چار بجکر بیس

منٹ کے قریب اس دارفنا سے دار بقا کی طرف رحلت فرما گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعون۔

اس آخری وقت کے بارے میں ان کی بیوی رضوانہ خاتون کہتی ہیں:

''دوپہر کے کھانے کے بعد ان کی طبیعت ٹھیک تھی، عدیلہ اور مجھ سے حیدرآباد جانے کی خواہش ظاہر کی اور وہاں کچھ دن اپنے بھتیجے مولانا شمیم جو وہیں مقیم ہیں ان کے یہاں رہنے کی بات کی۔ ابھی بات کر ہی رہے تھے کہ سینے میں درد اٹھنے لگی تو فوراً عدیلہ کی مدد سے انھیں لیٹا دیا اور سینے کو سہلانے لگی۔ کچھ ہی منٹوں کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔''

نسیم اعظمی کی وفات کے بارے میں ان کے ہر دالعزیز شاگرد ظہیر حسن ظہیر اپنے مضمون ''ذرا سی دیر میں برسوں کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں'' میں لکھتے ہیں:

''انسانی زندگی میں سانحات کا رونما ہونا تو عام بات ہے لیکن کچھ سانح ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے ذہن و دل پر نقش ہوجاتے ہیں اور تاحیات وقت کے سرد و گرم حالات کے باوجود ذہن و دل سے محو نہیں ہوتے اور جس کی یاد برسوں تک تازہ رہتی ہے۔ ایسے ہی ایک عظیم سانحے سے 17 اکتوبر 2019ء کو ہم سب دوچار ہوئے۔ ایک طرف چمن سرسید میں سرسید علیہ الرحمہ کی پیدائش کا جشن منانے کی تیاری زوروں پر تھی اور شام کا انتظار شدت سے ہو رہا تھا کہ پورے چمن کو برقی قمقموں سے روشن کیا جائے اور دوسری طرف سرزمین سرسید پر ہی انھیں کا ہم خیال ایک شخص سہ پہر کے وقت موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا اور چند گھنٹے کی جد و جہد کے بعد اردو زبان و ادب کا ایک بے لوث خادم، علمی، ادبی دنیا کی ایک محترم و معتبر شخصیت ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اپنے ہزاروں چاہنے والوں کو چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہوگئے (اناللہ وانا الیہ راجعون)۔''

علی گڑھ سے ان کے جسد خاکی کو 18؍اکتوبر 2019ء بروز جمعہ صبح نو بجے کے قریب مئوناتھ بھنجن (ڈومن پورہ کساری) ان کے آبائی گھر لایا گیا اور جمعہ کی نماز کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی اور (امام گنج موڑ کے پاس) اپنے اجداد کے جوار میں سپرد خاک ہوئے۔

*****

حوالے

1 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، میزان آگہی، 2011ء۔ص43
2 ایضاً۔ص30-29
3 ایضاً۔ص43
4 رفیق اشفاق، ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: حیات اور ادبی سفر'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسین ظہیر، 2015ء۔ص76
5 عبرت مچھلی شہری ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخص وعکس'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص64-63
6 ایضاً۔ص64
7 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، میزان آگہی، 2011ء۔ص29
8 ایس ایم عباس ''ایم نسیم اعظمی (خاکہ)'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ ص41
9 ظہیر حسن ظہیر، ''ایک عہد شناس شخصیت ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص90-89
10 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، میزان آگہی، 2011ء۔ص44-43
11 ایضاً۔ص31
12 ڈاکٹر محبوب راہی ''ایم نسیم اعظمی کی عمیق و بسیط علمی و ادبی خدمات کا کثیر الجہات منظر نامہ'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص30
13 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، میزان آگہی، 2011ء۔ص36
14 ایضاً۔ص36

15 ایضاً۔ص 36-37

16 ایضاً۔ص 37

17 ڈاکٹر شکیل احمد، مئو شہر ہنروراں۔ص 205

18 ایضاً۔ص 210

19 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، میزان آگہی، 2011ء۔ص 43

20 ایضاً۔ص 33

21 ایضاً۔ص 33-34

22 ڈاکٹر محبوب راہی ''ایم نسیم اعظمی کی عمیق و بسیط علمی و ادبی خدمات کا کثیر الجہات منظر نامہ'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص 33

23 رضوانہ خاتون، شخصی انٹریو، ڈومن پورہ کساری مئو، 6/فروری 2021ء

24 ظہیر حسن ظہیر، ''ذرا سی دیر میں برسوں کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں'' مشمولہ، ماہنامہ، اردو دنیا (دہلی) دسمبر 2019ء ص 33

*****

شخصیت کے نقوش

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کا شمار ان چند مخصوص شخصیات میں ہوتا ہے جن کے اندر مختلف کمالات اور خوبیاں ہوتی ہیں جو کسی ایک فن پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ مزید کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ ایک شاعر، ادیب، محقق، تنقید نگار، معلم، مفکر، اور صحافی تھے۔ جس طرح علم وادب کے مختلف شعبوں میں وہ دستگاہ رکھتے ہیں اسی طرح ملنسار، منکسر المزاج، نرم گفتار اور دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ مولانا ارشاد خلیل معروفی ان کے اوصاف و شخصی خوبیوں کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بحیثیت انسان بلند مقام پر فائز ہیں، آپ نہایت ملنسار، منکسر المزاج، متواضع اور خوش خصال ہیں، نرم خو، نرم گفتار، بہی خواہ اور دل دردمند رکھنے والے انسان ہیں، حوصلہ افزائی اور دوسروں کو آگے بڑھانا آپ کے نمایاں جوہر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ریسرچ اسکالرز، تعلیمی سفر میں رہنمائی کے طالبین اور لکھنے پڑھنے سے تعلق رکھنے والوں کا ہجوم ورجوع آپ کے پاس رہتا ہے مختصراً یہ کہ:
>
> ؎ ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
> فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق
>
> کا کے مصداق ہیں۔'' 1؎

حلیہ

نسیم اعظمی کا حلیہ کچھ اس طرح ہے درمیانہ قد، رنگ گندمی، بدن چھریرا، آنکھیں نہ بڑی میں شمار ہونگی نہ چھوٹی میں بلکہ معتدل، چہرہ کلین شیو، پیشانی اوسط، آواز مدھم مگر موقع ومحل کے لحاظ سے اس میں زیر وبم ہوتا رہتا ہے، لکھنے پڑھنے کے وقت عینک کا استعمال کرتے ہیں۔

نسیم اعظمی مشرقی یوپی کے خمیر کا جیتا جاگتا نمونہ تھے، وہ نہ تو اتنے دیدہ زیب تھے کہ دوسرے

خطۂ ارض کے باشندے معلوم ہوتے تھے اور نہ ہی ایسے تھے کہ ان کے بارے میں کلام کرنا مشکل ہو بلکہ ایک درمیانی شکل و شباہت کے آدمی تھے، ان کے متعلق عبرت مچھلی شہری نے اپنے مضمون ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخص و عکس'' میں ان کے حلیہ کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''درمیانہ قد، سر پہ چھوٹے چھوٹے بال، چہرہ گول، رنگ گندمی، آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئیں، مجموعی طور پر شکل و شباہت زیادہ دیدہ زیب نہیں لیکن ایام جوانی میں خوبصورت نہ سہی قبول صورت ضرور رہے ہوں گے۔'' 2ؔ

معمولات

راقم الحروف کو اپنے اس مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں بار بار نسیم اعظمی کے دولت خانہ پر جانے کا اتفاق ہوا اور ان کے ساتھ دیر تک بیٹھ کر گفتگو کرنے کا موقع بھی ملا، ان کو وقت کی بہت قدر کرنے والا پایا، ادھر ادھر بیٹھ کر وقت ضائع کرتے نہیں دیکھا، اپنے لکھنے پڑھنے سے مطلب لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اتنی پابندی اوقات کے باوجود جب بھی کسی موضوع پر گفتگو کرنا ہوا تو بڑی خوش دلی کے ساتھ اپنا وقت فارغ کر کے اطمینان بخش جواب دیا اور ضرورت پڑنے پر مواد بھی فراہم کیا۔ انھوں نے اپنے گھر کے کتب خانہ کو واقعی کتب خانہ بنایا ہوا تھا، ساری کتابوں پر اندراج عام نمبرات ڈال رکھا تھا تا کہ کسی کتاب کی تلاش میں زیادہ وقت ضائع نہ ہو۔

ان کی بیٹی اپنے والد محترم کے معمولات زندگی اور عادات و اطوار کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی ہیں:

> ''میرے والد (ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی) کی عادتوں میں ان کی مستقل مزاجی ان کی زندگی کا سب سے اہم حصہ ہے۔ عجلت پسندی ان کی عادت نہیں وہ ہر کام اطمینان و سکون اور وقت پر کرنے کے عادی ہیں۔ سحر خیزی ان کا معمول ہے۔ پڑھنے لکھنے اور مطالعہ کا شوق چین کی نیند سونے نہیں دیتا۔ سوائے گل و منجن کے وہ کسی بھی اشیاء کا استعمال نہیں کرتے۔
> بچپن سے لے کر آج تک میری یادداشت جہاں تک کام کرتی ہے میں

نے ہمیشہ اپنے ابو کو سونے کے پہلے پڑھتے ہوئے دیکھا اور سو کر اٹھنے کے بعد بھی انھیں مطالعہ میں غرق ہی پایا۔ وعدہ خلافی کے وہ سخت مخالف ہیں۔اس شعر کے وہ عمل پیرا ہیں۔ ؎

ہم کسی کو زبان دے دینگے

تو نبھانے میں اپنی جان دے دینگے۔'' 3

نسیم اعظمی کو مطالعہ کا شوق تھا وہ مستقل مزاجی سے مطالعہ کرتے تھے اور سحر خیزی ان کی عادت تھی۔ دیر رات تک مطالعہ کرنے سے گریز کرتے رہتے تھے۔

غذا

نسیم اعظمی بڑی معتدل زندگی گزارتے ہیں، کھانے پہننے میں بھی بڑے سادے واقع ہوئے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر شکیل احمد لکھتے ہیں:

''نسیم بھائی بہت سادہ زندگی گزارتے ہیں، پان سگریٹ جیسا کوئی شوق نہیں پالتے''۔ 4

ان کی غذا ہلکی پھلکی رہتی ہے، کھانے میں روٹی، چاول، گوشت وغیرہ سب کچھ ذوق سے کھاتے ہیں، وہ کھانے نقص نہیں نکالتے، ان کی بیٹی عدیلہ نسیم اپنے والد کی غذا کے بارے میں بتاتی ہیں:

''میرے ابو کھانے کے کبھی بڑے شوقین تھے اور ان کی والدہ یعنی میری دادی اچھے اچھے پکوان پکانے میں قرب و جوار میں مشہور تھیں، ان کے میکے کے لوگ کھانے کے کافی شوقین تھے اس لیے دادی کو بھی طرح طرح کے اچھے کھانے پکانے کھلانے اور کھانے کا شوق تھا اور وہی مزاج ابو کا بھی ہے۔ابو سادہ اور غیر سادہ دونوں قسم کے کھانے پسند کرتے ہیں وہ عام طور سے کھائے جانے والے مشرقی اتر پردیش کے تمام قسم کے رائج کھانوں کو بخوشی و رغبت کھاتے ہیں اور کوئی مخصوص پکوان ان کی خاص پسند نہیں ہے، کھانوں میں خوش ذائقی، خوش رنگت اور غذائیت

کے طالب رہتے ہیں''۔ 5

ان کی صاحبزادی بتاتی ہیں:

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے انھیں ہر طرح کی مٹھائیوں کا شوقین پایا ہے خصوصاً کھانا کھانے کے بعد میٹھا ضرور لیتے ہیں۔ جاڑے کے دنوں میں گاجر کا حلوہ کھانا روز کا معمول ہے۔ پھلوں میں ہر قسم کے پھل پسند ہیں لیکن غالبؔ کی طرح پھلوں کا راجا آم بے حد مرغوب ہے۔ پورے سیزن میں بلا ناغہ آم ان کے دسترخوان کی زینت ہوتا ہے۔ چائے کے وہ بے حد شوقین ہیں دو چار گھنٹے پر چائے کی چسکیاں لیتے ہیں۔'' 6

انھیں میٹھا بہت پسند تھا اور بارہا ان کے ساتھ مجھے کھانے کا سابقہ بھی پڑا، وہ خود میٹھا کھاتے وقت اس کے کھانے کی تلقین بھی بارہا کیا کرتے تھے۔

لباس

نسیم اعظمی طبیعتاً نفاست پسند واقع ہوئے ہیں، سادگی کے ساتھ نفیس وعمدہ لباس پہننا پسند کرتے تھے۔ یوں تو وہ پینٹ، شرٹ اور جوتا وغیرہ پہنتے ہیں لیکن کرتا، پاجامہ کا بھی خاص ذوق رکھتے تھے اور سفید رنگ کے لباس کو ترجیح دیتے تھے، گھر پر لنگی استعمال کرتے تھے۔ کسی تقریب میں جب جاتے تھے تو حسب حال عمدہ لباس زیب تن کر کے جاتے تھے، کبھی تو سفید کرتا اور پاجامہ اور گرمیوں میں ماڑی ڈال کر اور ٹھنڈی میں صدری کا استعمال بھی کرتے تھے۔ عموماً وہی لباس منتخب کرتے جو خود ان کو پسند ہوتا تھا۔ عدیلہ نسیم اپنے والد کے لباس کے بارے میں بتاتی ہیں:

''میرے والد (ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی) بے انتہا نفاست پسند انسان ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لباس انسان کی شخصیت نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ معمولی سے معمولی لباس بھی سلیقے سے پہنا جائے تو اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔ میرے والد صاحب مشرقی لباس میں کرتا

پائجامہ اور مغربی لباس میں پینٹ شرٹ کے شوقین ہیں۔گرمیوں میں
عموماً ہاف شرٹ پہنتے ہیں۔جاڑے کے دنوں میں عمدہ کوٹ پہننا پسند
کرتے ہیں۔وہ سادہ اور نفیس کپڑوں کے شوقین ہیں۔'' 7

ان کے دوست ڈاکٹر شکیل احمد نے ان کے لباس کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

''لباس کے معاملہ میں بڑی حد تک اپنی خاص پسند رکھتے
ہیں۔پینٹ،شرٹ،کرتا پاجامہ،چپل،جوتا سبھی کچھ اپنی پسند کا استعمال
کرتے ہیں۔'' 8

سلیقہ مندی

انسان کے اچھے رہن سہن اور عادت و اطوار سے انسان کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔نسیم اعظمی سلیقہ منداور نفاست پسند واقع ہوئے تھے یہی وجہ ہے کہ سلیقہ مندی اور نفاست ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔مندعد یلہ نسیم اس ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''میرے ابو معمولی سے معمولی کام کو بھی سلیقے اور نفاست سے کرنے
کے عادی ہیں اور مجھے اس کی تلقین بھی کرتے رہتے ہیں،اور یہ بھی بار ہا
کہتے ہیں کہ سلیقہ مندی ہی انسان کی شناخت قائم کرنے میں نمایاں
رول ادا کرتا ہے۔وہ اپنی تمام چیزیں خود رکھنا پسند کرتے ہیں۔پڑھنے،
لکھنے اور پہننے اوڑھنے والی ہر چیز ان کی سلیقہ مندی کی مثال ہوتی
ہے۔''۔9

گفتگو کا انداز

نسیم اعظمی خاموش مزاج اور لغویات سے پرہیز کرنے والے انسان تھے۔انھیں بیکار کی باتوں میں الجھنے اور لا حاصل گفتگو کرنے کی بالکل عادت نہیں تھی،لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ گفتگو کے مقام پر بھی بے جا سنجیدگی دکھلاتے تھے بلکہ وہ موقع کی نزاکت کا خیال رکھتے تھے اور موقع کی مناسبت سے گفتگو کرتے تھے۔اس ضمن میں ایس۔ایم عباس لکھتے ہیں:

''ایم نسیم اعظمی قدرکم گو ہیں لیکن موقع پڑے تو خوب بولتے ہیں۔کوئی علمی مسئلہ ہو،مخصوص موضوع ہو،ادبی رموز ونکات کی باتیں ہوں یا پھر نقد وتبصرہ کی بات چلے تو ایک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔'' 10ؔ

نسیم اعظمی کی گفتگو میں اپنائیت ہوتی ہے،ہر خواص و عام سے بڑی محبت سے ملتے ہیں۔خورشید اختر ان کی گفتگو کی اپنائیت اور محبت وشفقت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب انتہائی خوش مزاج ،ملنسار اور با اخلاق انسان ہیں۔علم دوست حضرات کو بہت عزت دیتے ہیں۔ہر خواص و عام سے اتنی محبت سے ملتے ہیں کہ ان کی گفتگو میں اتنی اپنائیت ہوتی ہے کہ پہلی بار بھی ملنے والا شخص محسوس کرتا ہے جیسے برسوں سے شناساں ہیں۔'' 11ؔ

عدیلہ نسیم اپنے والد کی نرم گفتاری،خوش اخلاقی اور ملنساری کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''میرے والد محترم (ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی) خوش طبع اور نرم گفتار ہیں۔وہ ہر کسی سے خوش گوار یسے ملتے ہیں۔اور اپنی گفتگو سے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان سے ان کے دوست احباب اور شاگرد وغیرہ خوش اخلاقی اور ملنساری کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔گفتگو کا انداز معتدل ہے ان کی آواز ہمیشہ میانہ روی ہے۔زیادہ تر ان کی گفتگو عالمانہ ہوتی ہے۔ادھر ادھر کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ادبی یا تعلیمی موضوع ان کے بحث ومباحث کا حصہ رہتا ہے۔ہمیشہ حساس و بشاس نظر آتے ہیں۔'' 12ؔ

نسیم اعظمی کو دیکھ کر پہلی بار یہ اندازہ ہوتا تھا کہ بہت ہی کم گو اور بوقت ضرورت وحاجت کلام کرنے والے ہیں۔وہ دوران تدریس میں بھی طلبہ پر رعب ودبدبہ قائم کرنے کے لیے بے جا ڈانٹتے ڈپٹتے نہیں تھے بلکہ ان کا رعب ان کی شخصیت سے ہی قائم رہتا ہے۔کیوں کہ انھیں پتہ تھا کہ ڈانٹ ڈپٹ کا اثر وقتی اور عارضی ہوتا ہے جب کہ شخصی سنجیدگی سے قائم کیا ہوا رعب دیرپا اور زود اثر ہوتا ہے۔

حسن سلوک ومہمان نوازی

عموماً دیکھنے کو ملتا ہے کہ جو بڑا اور صاحب حیثیت ہوتا ہے وہ عام اور معمولی لوگوں پر اتنی توجہ نہیں دیتا جتنی کہ دیگر اصحاب اقتدار وحیثیت پر دیتا ہے، خاص طور پر جو اس کے شاگرد یا شاگرد نما نوخیز ہو لیکن نسیم اعظمی اس عمومیت سے باہر نکل کر کچھ خصوصی اوصاف رکھتے تھے۔ وہ ہر نواردوں سے ویسے ہی ملتے تھے جیسا کہ کسی ذی حیثیت سے ملنا ہوتا تھا اور اس کی باتوں کو بڑے دھیان سے سنتے تھے، ان کے گھر پر ملاقات ہو تو مہمان نوازی بھی خوب کرتے تھے۔

ان کے حسن سلوک وخاطر تواضع کے بارے میں خورشید اختر انصاری کہتے ہیں:

> ''خاکسار نے بحیثیت دوست ڈاکٹر صاحب کو انتہائی مخلص اور نرم گفتار پایا۔ وہ اپنے دوستوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ بہت عزت دیتے ہیں اور اپنی بے پناہ علمی مشغولیت کے باوجود دوستوں کے لیے ضرور وقت نکالتے ہیں اور خوش دلی سے خوب خاطر تواضع کرتے ہیں۔'' 13؎

گمانؔ انصاری (جو نسیمؔ اعظمی کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں) نے ان کی رواداری اور حسن سلوک کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اساتذہ ہوں یا شاگرد ان سب سے رواداری کا سلوک کرتے ہیں۔ عام زندگی میں بھی محبت ہی محبت تقسیم کرتے نظر آتے ہیں ان کے نزدیک چھوٹے بڑے اور خاص وعام کی اصطلاح اس لیے مشکوک ہے کہ وہ مذہبی نقطۂ نظر سے صلح کل کے پاسدار ہیں۔'' 14؎

خودداروقلندرانہ طبیعت

نسیمؔ اعظمی خوددار طبیعت کے انسان تھے۔ وہ ہمیشہ قوم وملت کے نفع کو مقدم رکھتے تھے، اگر کسی وقت انھیں ایسا موقع ہاتھ آیا کہ اس وقت اپنے عہدہ ومنصب سے فائدہ اٹھا کر ذاتی منفعت حاصل کرلیں تو ان کی خوددار طبیعت نے اس کو گوارا نہیں کیا اور اپنی سنجیدہ طبیعت اور صحیح سوچ کی وجہ سے وقتی نفع کو بالائے طاق رکھ کر انھوں نے وہی کیا جس میں ان کی ذات پر حرف نہ آئے اور قوم کے ساتھ دھوکہ نہ ہو۔

جونپور میں اپنی ملازمت کے دور میں ایک بار پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے چونکہ عالیہ گریڈ کے استاد تھے۔اس لیےاس عہدہ کے مستحق بھی تھےلیکن جب انھوں نے اس عہدہ پر فائز رہتے ہوئے سیاہ وسفید کرنے کے بہت سارے مواقع کو دیکھا تو طبیعت میں اباء پیدا ہوا اور اس عہدہ سے صرف اسی لیے استعفیٰ دے دیا کہ کوئی غلط کام انجام نہ دینا پڑے، کہا جاتا ہے کہ کلی طور پر وہ ہی اس عہدہ کے مستحق تھے۔

نظریاتی تعصّبات سے بالاتر شخصیت

نسیم اعظمی سے بہت سارے طلبہ وطالبات کے مرجع تھے کہ علمی مشورہ کے لیے وہ ان کی طرف رجوع کرتے رہتے اور بلا کسی تفریق کے اور علاقائی وصوبائی تعصب سے بالاتر ہوکر ان کی رہنمائی کیا کرتے ،وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ہمارے مسلک کا ہے یا نہیں بلکہ وہ صرف یہ دیکھتے کہ اس وقت یہ طالب ہوکر آیا ہے اور اس کو رہنمائی کی ضرورت ہے لہذا بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا تعاون کرتے۔اس ضمن میں اسلم ایڈوکیٹ کہتے ہیں:

> ’’میں نے ان کے چہرے پر غصہ یا نخوت کا رنگ کبھی نہیں دیکھا۔اپنے ہوں یا بیگانے سب سے وہ محبت سے پیش آتے ہیں۔خاص طور پر طلبہ کی بہت قدر اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ان سے تعلیم کے بارے میں باتیں کرتے ہیں اور مفید مشورے بھی دیتے ہیں۔یہ ان کی وسیع النظری کی دلیل ہے۔‘‘ 15؎

صبر وتحمل

نسیم اعظمی صابر اور متحمل مزاج انسان تھے۔ان کی زندگی میں کئی مرتبہ اتار چڑھاؤ آیا اور غم وحزن کے مواقع آئے لیکن انھوں نے ان سب کا صبر وتحمل سے سامنا کیا اور زبان پر حرف شکایت نہ آنے دیا،ان کے یہاں چار اولادیں پیدا ہوئیں ان میں سے تین داغ مفارقت دے گئیں،کوئی ایک سال تک قید حیات رہا تو کسی نے دو سال زندگی گزار کر جدائی اختیار کی ،لیکن انھوں نے کبھی ان کے غم فراق کو بیان نہیں کیا اور نہ ہی اس کی وجہ سے اپنے کاموں میں کمی آنے دی بلکہ ان سب کو فیصلہ ایزدی سمجھ کر صبر کیا۔

عدیلہ نسیم اپنے ابو کے صبر وتحمل کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''میرے ابو کی فطرت میں صبر وتحمل کا مادہ پایا جاتا ہے۔ میں نے بچپن سے ان کو دیکھا ہے کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں شکوہ زبان پر نہیں لاتے بلکہ وہ مشیت ایزدی پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ حالات کا صبر وتحمل کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور صبر وضبط کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں۔ ان کی زبان کبھی حرف شکایت گراں بار نہیں ہوتی ہے۔'' 16

طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے بہت ساری بیماریوں کا انھوں نے سامنا کیا۔ گردہ میں کینسر ہو جانے کی وجہ سے گردہ کو نکلوانا بھی پڑا لیکن اس پر بھی صبر کیا اور اپنی بساط بھر اس کا علاج معالجہ کرایا۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا لہذا انسان کو ان حالات سے دو چار ہو کر اسی میں ڈوبا رہنا اور اپنے کاموں کو متاثر کر دینا بے وقوفی مانتے تھے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا اس لیے انسان کو ہار نہیں ماننا چاہیے بلکہ کام کرتے رہنا چاہیے اور ہر فیصلہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔

نسیم اعظمی کی شخصیت کے بارے میں معاصرین، دوست واحباب کے تاثرات

نسیم اعظمی کی ذات وشخصیت ہمہ جہت اور گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے، ان کے شاگردوں نے استاد کی حیثیت سے، بڑوں نے فرمانبردار چھوٹے کی حیثیت سے، معاصرین نے دوست کی حیثیت سے ان کو خوب قریب سے دیکھا اور پرکھا اور سبھوں نے ان کی تعریف وتوصیف کی ہے کیوں کہ انھوں نے ہر ایک کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا، ہر کسی کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے، اس لیے مختلف حیثیتوں سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا جا رہا ہے۔

مئو ناتھ بھنجن کے استاد الشعراء گمان انصاری نسیم اعظمی کی سادگی، حسن اخلاق اور حسن سلوک کی تعریف کرتے کہا:

''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نہایت منکسر المزاج انسان ہیں۔ طبیعت میں

انتہائی درجہ سادگی ہے اور سب سے از حد اخلاق سے ملتے ہیں۔ باوجود ایک معتبر و نامور شاعر اور نثر نگار کے طبیعت میں نام و نمود کا شائبہ بھی نہیں ہے۔'' 17؎

اسلم ایڈوکیٹ نسیم اعظمی کے اخلاق، محبت اور رواداری کے بارے میں کہتے ہیں:

''میں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجھک محسوس نہیں کرتا کہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ایسے بلند پایہ قلم کار ہیں جنھوں نے اپنے نئے اسلوب، نئے انداز فکر اور منفرد رنگ و آہنگ سے اپنی تخلیقات کو عصری تقاضوں کا ترجمان بنایا ہے۔ ان کا شمار آج کے اعلیٰ مرتبت ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ علم و ادب کے میدان میں انھوں نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ مئو کا نام عالمی سطح پر روشن کیا ہے۔ وہ جتنے اچھے ادیب و شاعر ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ ان کے سینے میں ایک دردمند دل ہے۔ اخلاق، محبت اور رواداری ان کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ داکٹر ایم نسیم اعظمی کا مقام ایک استاذ کی حیثیت سے بھی ضرب المثل ہے۔'' 18؎

ذکی احمد ایڈوکیٹ ان کی اردو خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب ایک ادیب، شاعر، صحافی، نقاد اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں اپنی اہمیت منوا چکے ہیں۔ اردو ادب ان کی خدمات سے ہمیشہ استفادہ کرتا رہے گا۔ اردو ادب میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی جیسا باکمال بہت مشکل سے ملتا ہے۔'' 19؎

ڈاکٹر نسیم اعظمی دوسروں کی خاص کر طلبہ کی مدد بہت کرتے تھے، اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شکیل احمد کہتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب دوسروں اور خاص طور پر طلبہ کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اپنے علم اور اپنے تعلقات سے آپ نے دوسروں کو بھی فیض پہنچانے کا سلسلہ برسوں سے جاری کر رکھا ہے۔ لکھنے پڑھنے والوں کے

بہت کام آتے ہیں۔ یہ خوبی بہت کم لوگوں میں ملتی ہے۔'' 20ے

محفوظ الرحمٰن عادل ان کی سادہ طبیعت، مشفقانہ اور ناصحانہ گفتگو کے بارے میں کہتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب انتہائی نیک، سادہ طبیعت، خوددار اور ملنسار انسان ہیں ان کے پاس بیٹھ کر میں نے کبھی یہ نہیں محسوس کیا کہ میں ایک بلند پایہ ادیب اور تقریباً ڈیڑھ درجن کتابوں کے خالق کے پاس بیٹھا ہوں۔ ان کی مشفقانہ اور ناصحانہ گفتگو سے مجھے بڑا حوصلہ ملا۔'' 21ے

ماسٹر نیاز احمد مفتاحی نے نسیم اعظمی کے اخلاق، کردار اور تعلقات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا:

''ان کا اخلاق بڑا اچھا ہے۔ اپنے سے بڑے لوگوں کا ادب ولحاظ کرتے ہیں اور چھوٹوں کے ساتھ ان کا رویہ مشفقانہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں سے ان کے تعلقات بنے رہتے ہیں۔ ان کا کردار بہت اچھا ہے۔ لوگوں سے تعلقات بے لوث ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے چاہنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے۔ وہ ایک اچھے انسان ہیں۔ انسانیت اور محبت سے ان کا بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر ہم لوگوں کے تعلقات دوستانہ ہیں۔'' 22ے

مولانا ارشاد خلیل معروفی ان کے مزاج، حرص اور صلہ وستائش پر گفتگو کرتے ہوئے واضح انداز میں بتایا:

''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب کا مزاج میرے اعتبار سے خالص علمی ہے، آپ نے اپنے مزاج واحساسات کے ابلاغ وترسیل میں کے لیے نثر ونظم دونوں کو ذریعہ بنایا، اا آپ علمی فیضان کو عام کرنے کے حریص ہیں اور اس بات میں پورا یقین رکھتے ہیں کہ قوم کی ترقی اعلیٰ تعلیم میں مہارت وامتیاز حاصل کرنے ہی سے ہوسکتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ صلہ وستائش کی تمنا سے بے پرواہ ہو کر قوم کے نونہالوں کی تعلیمی جہات میں

طرح طرح سے رہنمائی کررہے ہیں۔'' 23ے

مولانا احمد اللہ صاحب (استاد حدیث دارالعلوم مئو) نے ان کی خاموش طبیعت کے حوالہ سے کہتے ہیں:

''اخلاق کریمانہ ہے، لوگوں سے ہنس مکھ چہرے سے ملاقاتیں کرتے ہیں ہاں ذرا خاموش طبع ہیں شاید ہر دم کسی نہ کسی موضوع پر سوچتے رہتے ہیں مگر ملاقات کے بعد بالکل خوشگوار ہوجاتے ہیں۔'' 24ے

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ایک مخلص انسان تھے وہ سب سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے جلتے تھے۔ لوگوں کے لیے جذبہ ایثار و قربانی رکھتے تھے۔ طلبہ کی رہنمائی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ وہ حسن سلوک، حسن اخلاق اور ملنسار واقع ہوئے تھے۔

بحیثیت استاد

نسیم اعظمی کی شخصیت صرف ایک نقاد، صحافی، ادیب اور ماہر تعلیم ہونے ہی میں نمایاں نہیں ہے بلکہ ان تمام کے ساتھ ساتھ بطور استاد کے بھی بہت ممتاز تھے، ان سے شرف تلمذ جس کو ملا ہے اس نے برملا اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی شخصیت علم کے میدان میں خاموش انداز میں اثر انداز رہی ہے جس کسی نے کوئی علمی مشورہ ان سے طلب کیا اس کی بھرپور مدد کی ہے اور حتی الامکان اس کا تعاون کیا ہے۔ اسی لیے مختلف مکتبۂ فکر کے لوگوں نے ان سے کسب فیض کیا ہے اور انھوں نے ہر کسی کی ہر نوعیت سے رہنمائی فرمائی ہے۔

*****

حوالے

1 مولانا ارشاد خلیل معروفی، شخصی انٹریو، الجامعۃ الاسلامیۃ ہاجرہ للبنات پورہ معروف، ر دسمبر 2016

2 عبرت مچھلی شہری ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخص و عکس'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص63

3 عدیلہ نسیم، شخصی انٹریو، ڈومن پورہ کساری مئو، 28/ اکتوبر 2016ء

4 ڈاکٹر شکیل احمد ''نسیم بھائی'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015۔ص61

5 عدیلہ نسیم، شخصی انٹریو، ڈومن پورہ کساری مئو، 28/ اکتوبر 2016ء

6 ایضاً۔28/ اکتوبر 2016ء

7 ایضاً۔28/ اکتوبر 2016ء

8 ڈاکٹر شکیل احمد ''نسیم بھائی'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015۔ص62-61

9 عدیلہ نسیم، شخصی انٹریو، ڈومن پورہ کساری مئو، 28/ اکتوبر 2016ء

10 ایس ایم عباس ''ایم نسیم اعظمی (خاکہ)'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ ص43

11 خورشید اختر انصاری، شخصی انٹریو، کلیان ساگر مئو 27/ دسمبر 2016ء

12 عدیلہ نسیم، شخصی انٹریو، ڈومن پورہ کساری مئو، 28/ اکتوبر 2016ء

13 خورشید اختر انصاری، شخصی انٹریو، کلیان ساگر مئو، 27/ دسمبر 2016ء

14 گمان انصاری، شخصی انٹریو، پٹھان ٹولہ مئو، 27/ مارچ 2017ء

15 اسلم ایڈوکیٹ، مغل پورہ مئو، 4/ جنوری 2017ء

16 عدیلہ نسیم، شخصی انٹریو، ڈومن پورہ کساری مئو، 28/اکتوبر 2016ء

17 گمان انصاری، شخصی انٹریو، پٹھان ٹولہ مئو، 27/مارچ 2017ء

18 اسلم ایڈوکیٹ، مغل پورہ مئو، 4/جنوری 2017ء

19 ذکی احمد ایڈوکیٹ، پہاڑ پورہ (نئ عیدگاہ) مئو، 5/جنوری 2017ء

20 ڈاکٹر شکیل احمد، شخصی انٹریو، ڈومن پورہ مئو، 7/نومبر 2016ء

21 محفوظ الرحمٰن عادلؔ، شخصی انٹریو، گھاسی پورہ مئو، 22/دسمبر 2016ء

22 ماسٹر نیاز احمد مفتاحی، مصطفیٰ آباد مئو، 19/نومبر 2016ء

23 مولانا ارشاد خلیل معروفی، شخصی انٹریو، الجامعۃ الاسلامیۃ ہاجرہ للبنات پورہ معروف، /دسمبر 2016

24 مولانا احمد اللہ صاحب قاسمی، ندوی، شخصی انٹریو، مدرسہ دارالعلوم مئو، 1/نومبر 2016ء

*****

باب: سوم

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بحیثیت شاعر

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بحیثیت شاعر

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی تعلیمی میدان میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے تنقید و تحقیق ،صحافت اور شاعری سے بھی اپنا رشتہ استوار کر رکھا ہے۔اصناف سخن کی سب سے مشہور ومعروف و ہر دل عزیز صنف غزل سے ان کو والہانہ لگاؤ رہا ہے،لیکن انھوں نے اصناف سخن ونثر میں تسلسل کو برقرار نہیں رکھا،جس کی وجہ سے ان کے گہر بار قلم سے نثر کو جتنی جلا ملی اتنی اصناف سخن کو نہ مل سکی۔

نسیم اعظمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ۔غزل کے رموز و نکات پر اچھی دسترس رکھتے ہیں۔انھوں نے جو کچھ لکھا اور لکھ رہے ہیں اس میں جذبے کی شدت ، گہری معنویت اور فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ کا بیان بھی شامل ہے۔ان کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت ان کے شعری وفنی شعور کا احساس ہوتا ہے ساتھ ہی عصری حسیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

نسیم اعظمی کے اب تک دو مجموعۂ کلام منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ’’میزان آگہی‘‘ اور ’’فیضان آگہی‘‘۔ میزان آگہی پہلا شعری مجموعہ ہے جو 2011ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ کا انتساب انھوں نے آثر انصاری کے نام کیا ہے۔پیش لفظ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے تحریر کیا ہے جو ماہر شبلیات کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔علاوہ ازیں ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ کا مضمون ’’ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی حقیقت نگاری ‘‘ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا مضمون ’’ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بحیثیت شاعر‘‘ اور ڈاکٹر احمد برقیؔ کا منظوم تاثر بھی اس کتاب میں شامل ہے۔نسیم اعظمی نے بھی اپنے ماضی اور حال کو تفصیل کے ساتھ ’’مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا‘‘ کے عنوان میں لکھا ہے، جو سترہ صفحات پر محیط ہے۔’’میزان آگہی‘‘ میں ایک حمد ایک نعت اور ایک سو اڑسٹھ غزلیں شامل ہیں۔

دوسرا شعری مجموعہ ''فیضان آ گہی'' ہے جو 2016ء میں منظر عام پر آیا ہے۔اس شعری مجموعہ کا انتساب مئو کے مشہور شاعر ''ظفر احمد ماہؔر عبدالحی'' کے نام کیا ہے(ڈاکٹر ایم نسیؔم اعظمی نے اپنے پہلے شعری مجموعہ کا نام انھیں کے ایما پر ''میزان آ گہی'' رکھا تھا) پیش لفظ نسیؔم اعظمی کا ہے اور تقریظ ''اشعر رام نگری'' نے ''ڈاکٹر ایم نسیؔم اعظمی کی شخصیت اور شاعری'' کے عنوان سے سپرد قرطاس کیا ہے۔اس مجموعہ کلام میں صرف غزلیں ہی ہیں، جن کی تعداد ایک سو ستاون ہے۔

نسیؔم اعظمی کے شعری سفر کا آغاز 1972ء سے ہوا۔مئو ناتھ بھنجن کی ایک بزم کی طرف سے مصرع طرح کا'' آ اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں'' (ناصر کاظمی) کا اعلان ہوا تو ان کے دل میں بھی شعر کہنے کی خواہش جاگی ،اس کے بعد انھوں نے چند شعر لکھ کر ناصؔر انصاری کو دکھایا، ان کی ایما پر آثؔر انصاری سے اصلاح لی اور اس طرح ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔انھوں نے اپنے شعری سفر کے آغاز و احوال کو یوں قلمبند کیا ہے:

> ''میرا خیال تھا کہ شعر و شاعری الہامی چیز ہے۔یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کے اندر قدرتی طور پر اس کی صلاحیت ہوتی ہے مگر اچانک کسی بزم کی طرف سے مصرع طرح کا اعلان میرے کانوں تک پہنچا مصرع طرح تھا'' آ اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں'' (ناصر کاظمی) میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں بھی کوشش کروں چنانچہ میں نے بھی پہلی بار چند الٹے سیدھے مصرعے جوڑ کے بطور مشورہ ناصؔر انصاری صاحب کو سنائے انھوں نے بعض ترمیم و تنسیخ کے بعد کہا کہ بہتر ہوتا کہ ''فضؔا ابن فیضی یا آثؔر انصاری میں سے کسی کو دکھا لیتے''۔میں نے آثؔر انصاری کو دکھایا تو انھوں نے کہا کہ ''اچھے شعر ہیں ایسا نہیں لگتا کہ کسی نے پہلی بار کہے ہوں'' میں نے بتایا کہ میں نے ناصؔر انصاری کو سنائے تو انھوں نے بعض ترمیم و تنسیخ اور اصلاح کے بعد کہا تھا کہ فضؔا صاحب یا آثؔر صاحب میں سے کسی کو دکھا لینا اس لیے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔میری اس صاف گوئی پر

انھوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ چند دنوں بعد کوڑی بلڈنگ (روضہ) پر
شعری نشست منعقد ہوئی میں نے یہی اپنی طرحی غزل سنائی حاضرین
شعراء نے بطور حوصلہ افزائی داد بھی دی۔ مذکورہ غزل کا ایک شعر اور پھر
اس کے بعد کی غزل کا ایک اور شعر جو آج بھی میرے حافظے میں محفوظ رہ
گیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔ ے

عریاں پڑی ہے راہ میں اک بے وطن کی لاش
گرد و غبار راہ کی چادر ہی لے چلیں

***

محرومیوں کی خاک سے روز ازل نسیم
جب کچھ نہ بن سکا تو میرا دل بنا دیا''۔ 1

نسیم اعظمی کے شعری ذوق کو نکھارنے میں ان کے استاد محترم الحاج ابوبکر آثر انصاری کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ انھوں نے ان کے علاوہ اور کئی بڑی شخصیات سے بھی کسب فیض کیا ہے جن میں ڈاکٹر انیس ادیبؔ (مرحوم)، مولانا عطاء الرحمٰن (مرحوم)، ظفر احمد ماہرؔ عبدالحی (مرحوم) اور گمانؔ انصاری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

فروری 1981ء میں نسیم اعظمی نے ایک آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کیا۔ ہندوستان کے مشہور و معروف شعراء نے شرکت کی جن میں ''کرشن موہن''، ''وامق جونپوری''، ''انجم عرفانی'' اور ''والی آسی'' کے نام قابل ذکر ہیں۔ مگر یہ مشاعرہ سامعین و شعراء کی موجودگی کے باوجود کامیاب نہ ہوسکا۔ جس سے دلبر داشتہ ہو کر نسیم اعظمی نے مشاعرے منعقد کر کے اردو کی خدمت کا دوبارہ کبھی ارادہ نہیں کیا۔

1982ء میں شاکر کریمی کے وطن بتیا (بہار) میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ جس میں پہلی مرتبہ نسیم اعظمی بحیثیت مہمان خصوصی ''کیف بھوپالی''، ''ڈاکٹر انیس ادیبؔ'' اور بقاء اعظمی کے ہمراہ شریک ہوئے۔ یہ مشاعرہ انتہائی کامیاب رہا۔ اس کے بعد 83-1982ء میں ابوعبید عبدہٗ اعظمی کی ایما پر چورسنڈ (جونپور) کے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں پھر بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ غازی پور کے ایک

آل انڈیا مشاعرہ میں بھی انھیں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ جونپور کی ملازمت سے پہلے وہ اپنی غزلوں کی حفاظت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے جس کے سبب متعدد مشاعروں میں پڑھی گئی ان کی غزلیں زمانہ کے ہاتھوں برباد ہوگئیں۔

نسیم اعظمی کی تمام تصنیفات کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شاعری کو ثانوی درجہ میں رکھ کر اس کی عمارت تیار کی ہے اور گاہے بگاہے اصناف شاعری کی سب سے مقبول ترین صنف غزل پر طبع آزمائی کی۔ ان کی زیادہ تر غزلیں ملک و بیرون ملک کے مختلف اور معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں۔ موصوف کی غزلوں میں مطالعہ کی گہرائی، خوبصورت پیکر تراشی، شگفتہ اسلوب اور نئی تراکیب ولفظیات وغیرہ کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ احسن امام احسن نے گاہے بگاہے کی گئی شاعری اور اس کے فنی لوازم پر کچھ یوں بات رقم کی ہے:

> ''نسیم اعظمی صاحب نے شاعری بھی گاہے بگاہے کی ہے جس میں علم و فن کا شعور جھلکتا ہے، مطالعہ کی گہرائی ہوئی ہے اور اپنی شاعری کو نئی تراکیب ولفظیات سے بھی آراستہ کرتے ہیں۔ تجربے کی دھوپ میں تپ کر قلم کو لفظوں کی گرمی عطا کرتے ہیں، شگفتہ اسلوب اور خوبصورت پیکر تراشی کرتے ہیں اور عمدہ اشعار نکال لیتے ہیں ٹھیک اسی طرح کی خوبصورتی سے اپنی نثری صلاحیت بھی قرطاس پر انڈیل دیتے ہیں۔'' 2

نسیم اعظمی خود وقتاً فوقتاً کی گئی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ادبی ذوق کی تسکین کے لیے یا تبدیلئی ذائقہ کے لیے ادب وشاعری اور دیگر موضوعات پر گاہے بگاہے لکھتا رہتا ہوں اور کبھی کبھی مصرعوں پر مصرع رکھ کر غزل کی عمارت بھی کھڑی کرتا رہتا ہوں پھر بھی مجھے ماہر تعلیم، ادیب، نقاد اور شاعر ہونے کا قطعی دعویٰ نہیں ہے ہاں لفظوں کو جوڑ کر مرکب بنانے کے عمل سے اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنی بات تحریر کرنے کے طریقے سے قدر واقف ضرور ہوں اور میری اس معمولی واقفیت کو قارئین جو چاہیں نام دے دیتے ہیں۔'' 3

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا، عورت سے متعلق باتیں کرنا یا عشق و محبت کی باتیں کرنا ہے۔ فیروز الغات میں اس کے معنی یوں درج ہے:

''(۱) عورتوں سے باتیں کرنا۔ عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کرنا (۲) نظم کی ایک صنف جس میں عشق و محبت کا ذکر ہوتا ہے۔'' 4

غزل عربی قصیدہ کے حصہ تشبیب سے ماخوذ ہے۔ عربی شعراء قصیدہ کے حصہ تشبیب میں اپنی بیوی سے محبت یا کسی عورت سے محبت کے متعلق اپنی دلی کیفیات کو پیش کیا کرتے تھے۔ جس میں حسن و عشق کی رعنائیاں، ہجر و وصال کے واقعات، غم و خوشی کے لمحات، بہار و خزاں کے اوقات کا تذکرہ پر لطف اور دلچسپ انداز میں بیان کرتے تھے۔

اردو غزل بھی فارسی کی رہین منت ہے کیوں کہ اردو شاعری کی بیشتر اصناف کا رشتہ فارسی سے جا ملتا ہے۔ تیسری صدی ہجری میں عباسی دور کے وقت جب ایران عربی تسلط سے آزاد ہوا تو یہاں کے شعراء نے اپنے قصیدہ سے تشبیب کو جدا کر کے ایک الگ صنف کی بنیاد رکھی اور اسے غزل کا نام دیا۔ جب رفتہ رفتہ کچھ پختگی آتی گئی تو غزل میں مختلف قسم کے خیالات و جذبات کے لیے اس میں مختلف علامتیں وضع کی گئیں مثلاً ساقی و پیمانہ، قفس و آشیانہ، گل و بلبل وغیرہ کے تذکرے۔ ان علامتوں کو اس وجہ سے وضع کیا گیا تا کہ براہ راست اور سیدھے سادے انداز بیان سے بچا جا سکے۔ ہندوستان، میں جب غزل کی یہ روایت اردو شعراء کے سامنے آئی تو یہاں کے اردو شعراء نے صنف غزل کو وہیں سے شروع کیا جہاں تک فارسی غزل گو شعراء نے اسے پہنچایا تھا۔

اردو کی تمام اصناف شاعری میں غزل کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ مقام و مرتبہ کسی اور صنف شاعری کو حاصل نہ ہو سکا، کیوں کہ اسلوب و انداز بیان کی ہمہ جہتی اور مضامین و موضوعات کی ہمہ رنگی نے غزل کو جس قدر مقبولیت خاص و عام سے سرفراز کیا ہے وہ صرف اور صرف غزل کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس سے غزل کی صنف محض کلاسیکی یا روایتی صنف شاعری نہ رہ کر بلکہ ہماری ثقافتی و تمدنی زندگی کا محور بھی بن گئی ہے۔

جب ہم اردو زبان وادب کا ذکر کرتے ہیں یا اپنی زبان وتہذیب کو بیان کرتے ہیں، یا مشرق و مغرب کی شاعری کی ورق گردانی کرتے ہیں یا تنقید ولٹریچر پر باتیں کرتے ہیں تو درمیان میں غزل کا ذکر آنا ناگزیر ہے کیوں کہ اس کے بغیر بات نہ ختم ہوتی ہے اور نہ مکمل ہو پاتی ہے۔اسی لیے اب غزل اردو زبان کی ایک صنف شاعری نہ ہوکر برصغیر ہندو پاک کے ایک مشترکہ کلچر کی ایک تنہا نمائندہ صنف کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور اسی حیثیت سے اپنی شناخت بھی رکھتی ہے۔غزل کی مقبولیت پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''غزل ایک زندہ وتابندہ صنف شاعری ہے۔اس کی پراگندگی اور انتشار عیب نہیں بلکہ اس کا مخصوص حسن ہے۔ یہ ایک ایسی صنف سخن ہے جو اپنے آغاز سے ہی سدا داخلی طور پر تبدیلیوں سے دو چار رہی ہے۔کیوں کہ اس میں ہر دور اور ہر زمانے سے ہم آہنگ ہو جانے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔غزل نہ صرف اردو یا مشرق کی سب سے مقبول شاعری ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی دنیا کی سب سے دلکش اور مقبول ترین صنف شاعری بن گئی ہے اور اب دنیا کی تقریباً سبھی اہم زبانوں میں غزل لکھی جانے لگی ہے۔'' 5

غزل کی ہمہ گیری (ابتداء سے عہد حاضر تک) کا جب ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو میں تخلیقی اعتبار سے سب سے زیادہ شعری سرمایہ اسی صنف شاعری کی رہینِ منت ہے اور یہی نہیں اردو زبان وتہذیب کی سب سے توانا اور نمائندہ صنف شاعری ہونے کا شرف بھی اسے ہی حاصل ہے:

''غزل اردو زبان وتہذیب کی سب سے توانا اور نمائندہ صنف شاعری ہے اس لیے یہ اپنے آغاز سے عہد حاضر تک اردو شعر وشاعری کی سرتاج رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ اردو میں تخلیقی اعتبار سے سب سے زیادہ شعری سرمایہ بھی اسی صنف شاعری کا پیدا کردہ ہے۔'' 6

نسیم اعظمی ادب برائے زندگی کے قائل ہیں وہ مقصدی ادب کے ہمنوا بھی ہیں مگر تخلیقی ادب میں یا

تنقیدی ادب میں کسی نظریہ کسی ازم یا کسی جماعت کی تبلیغ کو یا اس کی پابندی کو غیر ضروری تصور کرتے ہیں اس لیے شعر و شاعری ہو یا تنقید ان میں آزادانہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کیوں کہ ادیب و شاعر کے لیے ذہنی و فکری آزادی سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے، اس کے بغیر نہ وہ سچا ادب تخلیق کر سکتا ہے اور نہ غیر جانب دارانہ تنقید ہی کر سکتا ہے۔ ادب پہلے ادب ہے بعد میں کچھ اور۔ جس طرح غزل میں تغزل، افسانہ میں افسانویت اور تنقید میں نقدیت ضروری ہے اسی طرح ادیب میں ذہنی و فکری آزادی کا ہونا ناگزیر ہے۔ نسیم اعظمی نے اردو غزل کو اردو شاعری کی سب سے اہم صنف قرار دیا ہے، انھوں نے غزل کو فنون لطیفہ کا جوہر کہا ہے اس سلسلہ میں ان کا ایک مشہور شعر بھی ہے ۔

غزل ہے فنون لطیفہ کا جوہر
تو سائنس سر نہان غزل ہے

وہ اپنے مضمون ''اثر انصاری کی شعری جمالیات'' میں غزل کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے فنون لطیفہ کی ایک شاخ بتاتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''غزل اردو کی غنائی صنف شاعری ہے اور ہر غنائی شاعری میں حسن و عشق، پیار محبت اور عشقیہ احساسات و جذبات کی خاص کارفرمائی ہوتی ہے۔ شاعری فنون لطیفہ کی ایک شاخ ہے اور فنون لطیفہ میں جمالیات (AESTHETICS) کی حیثیت اساسی ہوتی ہے اور یہ فن آرٹ یا ادب میں پائی جانے والی وہ شئے ہے جو ادب و مواد، سلیقۂ اظہار گفتگو اور فکر و خیال کی نیرنگیوں کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے اور جسے جمالیات یا احساسات حسن و دلکشی اور کشش و دلآویزی وغیرہ ناموں سے جانا جاتا ہے۔'' 7

کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بہت خوبصورت زبان غزل ہے
بلند اور بالا نشان غزل ہے

تخیل کی رنگینیوں سے مزین
سدا جگمگاتا مکان غزل ہے

***

خود کو بھی آئینہ دکھاؤں کیا
زندگی تجھ کو آزماؤں کیا

***

جن سے ملتا نہ ہو مزاج اپنا
ہاتھ ایسوں سے بھی ملاؤں کیا

نسیمؔ اعظمی نے تمام بڑے شاعروں کی طرح روشنی کی علمبرداری کی ہے اور ظلمت کی مخالفت۔ روشنی علم وادب ارتقاء وفروغ، روحانیت واخلاقیات اور انسانیت کے عروج کا منبع ہوتی ہے جب کہ ظلمت وتاریکی اسی کی متضاد ہوتی ہے۔ وہ روشنی کے ہمنوا اور ظلمت وتاریکی کے مخالف ہیں چنانچہ ان کے بہت سے اشعار روشنی کی ہمنوائی اور تاریکی کے مخالفت میں دعائیہ اور مناجاتی انداز میں پائے جاتے ہیں۔ وہ روشنی کے طالب ہیں، ظلمت کے منحرف ہیں، روشنی کو خیر اور تاریکی کو شر سے تعبیر کرتے ہیں اور انسانی زندگی میں روشنی کو عام کرنے کے لیے وہ بار بار اکساتے بھی ہیں اس سلسلہ میں ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں ۔

ظلمت و جہل کی دنیا تہ و بالا کر دے
علم کا سارے زمانے میں اجالا کر دے

***

ہم سر غالبؔ و اقبالؔ نہیں ہو سکتا
مجھ کو بس میرے زمانے کا حوالہ کردے

***

خواب غفلت میں رہے گا یہ مسلماں کب تک
پھر اسے حکمت و تعلیم کا آلہ کر دے

***

روشنی عام ہو تعلیم کی دنیا میں نسیمؔ
اور ظلمت کی تجارت کا دوالہ کردے

***

نسیمؔ سے بھی ہوں سیراب تشنگان علوم
اس آب جو کو بھی اک بحر بیکراں کر دے

***

ہمیں تدریس کا پیغمبرانہ دے ہنر یا رب
گہر بن جائیں آجائیں جو کنکر اپنی مٹھی میں

***

تعطیل کے دنوں میں بھی گھر پر پڑھیں سبق
بچوں میں شوق علم کا ایسا شعار دے

***

معلم تو نہیں تلمیذ شیطان لعیں ہوگا
بنام درس جو بچوں کو بہکانے میں رہتا ہے

***

درعلم و حکمت کبھی کھولے تھے جو اسلاف نے
پھر دے وہ ذوق جستجو طرز حکیمانہ الگ

نئی نسل کے تئیں ان کے رجحان کو دیکھتے ہوئے اسامہ ارشاد لکھتے ہیں:

ان کے یہاں سنجیدگی، متانت اور بردباری کی وہ لہریں صاف نظر آتی ہیں جو مسائل کی تحلیل کے لیے ضروری ہیں، وہ شاعری کو شوق یا تفریح کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ قوم اور نئی نسل کی فلاح و بہبود اور اصلاح معاصرہ کے لیے آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔'' 8

نسیم اعظمی کی اردو کے پورے ادبی سرمایہ پر بڑی گہری نظر ہے انھوں نے کلاسیکی شاعری سے لے کر اردو شاعری کی مختلف اصناف کا بڑا عمیق مطالعہ کیا ہے اور اردو کے تقریباً سبھی اہم شعراء کا موقع بہ موقع اپنے شعروں میں ذکر کیا ہے جیسے میر تقی میر، غالب، مومن، سودا، مصحفی، جوش، ساحر لدھیانوی، حسرت موہانی، فراق گورکھپوری، فضا ابن فیضی، ناصر کاظمی، ماہر عبدالحی، اور اثر انصاری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ظہیر حسن ظہیر کو دیے گئے انٹرویو میں نسیم اعظمی نے اپنے جن پسندیدہ شعراء کے نام بتلائے ہیں وہ ملاحظہ ہو:

''ظہیر حسن ظہیر: آپ اپنے پسندیدہ شعراء کے نام بتائیے؟

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: مولانا روم، حافظ شیرازی، عمر خیام، خسرو، میر انیس، اقبال، حسرت، فیض احمد فیض، ن م راشد، اختر الایمان، ناصر کاظمی، فراق گورکھپوری، اور اثر انصاری میرے پسندیدہ شعراء ہیں اور میں انھیں بار بار پڑھتا ہوں۔ کیوں کہ ان کی شاعری میں ایک عجیب قسم کی تاثیر محسوس کرتا ہوں۔ ان کے علاوہ حرمت الاکرام، وامق جونپوری، فضا ابن فیضی، کیفی اعظمی اور عہد حاضر کے چند شعراء کو میں کثرت سے پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں اور لطف اندوز ہونے کے ساتھ ان کے فکر و تخیل اور فن سے متاثر بھی ہوتا ہوں۔'' 9

چنانچہ اس سلسلہ میں ان کے اشعار بطور مثال ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

یہ دور میر و غالب و رنگین کا نہیں
کہتا بھلا نسیم غزل عاشقانہ کیا

بیاں کیا کیجیے اس کا سراپا
مجسم جیسے حافظؔ کی غزل ہے

***

کوئی اقبالؔ نہ ٹیگور نہ غالبؔ نکلا
گرچہ پیدا ہوئے بھارت میں سخنور کتنے

***

ولیؔ و قطبؔ ،میرؔ و غالبؔ ،اثرؔ سے
جگر تاب روح و روان غزل ہے

***

ذہانت مشق و محنت کی بدولت
کوئی عرفیؔ و بیدلؔ ہو گیا ہے

***

نسیمؔ بے نوا کی شاعری ہے
جو جوشؔ و حسرتؔ و فانیؔ نہیں ہے

***

اس شہر علم و فن میں فضاؔ اور اثرؔ کے بعد
ماہرؔ سا کوئی صاحب شعر و سخن نہیں

انھوں نے اپنے استاد محترم اثرؔ انصاری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

زباں میں کس قدر قند و شکر تھی
اثرؔ کی بات کتنی با اثر تھی
نسیمؔ غم زدہ سے کوئی پوچھے
کہ اس کی ذات کتنی معتبر تھی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ غزل محبوب سے باتیں کرنے یا محبوب کی باتیں کرنے کا نام ہے مگر زمانہ کے رفتار کے ساتھ اس کی معنویت میں وہ وسعت اور تنوع پیدا ہوا کہ غزل حسن وعشق کے دائرے سے نکل کر انسانی زندگی میں پیش آنے والے تمام تر معاملات اور موضوعات کا احاطہ کرنے لگی اور اس میں ہر طرح کے مضامین رقم ہونے لگے، جس سے غزل کی مقبولیت اور اہمیت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور یہی تبدیلی غزل کے خوش آئند مستقبل کا ضامن بھی ہے۔اس لیے تقریباً سبھی شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنا سکہ رائج کیا ہے۔موجودہ دور کے شعراء کی ایک فہرست قائم کی جائے تو اس میں ایک اہم اور نمایاں نام ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی'' کا بھی آئے گا جو بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ان کے مجموعے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک سنجیدہ اور خوش مذاق شاعر ہیں بلکہ شعروسخن کے رموز و نکات سے پوری طرح سے واقف نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں مضمون آفرینی کا شعری ہنر،عصری حسیت اور موجودہ دور کی تلخ حقیقتیں نمایاں ہیں۔وہ محض لفظوں کی بازیگری کے قائل نہیں ہیں بلکہ لفظوں کا سہارا لے کر اپنے دل کی آواز کو سامعین تک پہنچانے کا ہنر جانتے ہیں۔

عشق ومحبت ایک ایسا انسانی جذبہ ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ادبی اور شعری اخلاقیات میں محبت کی بڑی اہمیت ہے، یہ صرف جنسی تعلق یا جسمانی تلذذ یا بوالہوسی کے اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا پاکیزہ جذبہ ہے جو ہر انسان میں فطرتاً موجود رہتا ہے۔شاعر چونکہ انسانیت اور محبت کا علمبردار ہوتا ہے اس لیے عشق ومحبت کی مختلف کیفیات کا مختلف انداز میں اپنی شاعری میں اظہار کرتا ہے۔نسیم اعظمی نے بھی اپنی شاعری میں محبت کی مختلف کیفیات کا اظہار کیا ہے، کہیں جذباتی انداز میں کیا ہے تو کہیں فطری انداز میں۔محبت انھیں بھی عزیز ہے اور ساری دنیا کو بھی عزیز ہے۔

آج پرانی قدریں مٹ رہی ہیں، اخلاقیات کمزور ہوتی جارہی ہے، مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوگئی ہے۔سماجی اخلاقیات دم توڑنے لگی ہے، پورا معاشرہ عجیب طرح کی بے راہ روی کا شکار ہے۔روحانی سکون کسی کو بھی اور کہیں نہیں مل رہا ہے ایسے میں اگر کوئی محبت کا نغمہ چھیڑ دیتا ہے تو انسانی فطرت تھوڑی دیر کے لیے ایک عجیب روحانی سکون میں اپنے آپ کو محسوس کرتی ہے۔

جہاں تک غزل کی صنف کا معاملہ ہے اس کا بنیادی موضوع ہی عشق و محبت ہے۔ جگر مرادآبادی کا بڑا مشہور شعر ہے۔

ان کا جو کام ہے اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

نسیم اعظمی کے بھی اس موضوع پر کئی مشہور اشعار ہیں۔

تمہارے پاس خنجر ہے عداوت کا
میں رکھتا ہوں محبت کا گل تر اپنی مٹھی میں

***

جہاں تم نے لاشیں بوئی تھیں
وہاں ہم نے پھول کھلائے ہیں

نسیم اعظمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ چونکہ غزل کا مطلب محبوب سے یا محبوب کی باتیں کرنا ہوتا ہے اس لیے ان کے یہاں بھی وصال و ہجر اور محبوب کے حسن و شباب کی باتیں ہوئی ہیں لیکن ان کے یہاں محبت کے پاکیزہ جذبات ملتے ہیں مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ جا چکا ہے چھوڑ کے مدت ہوئی مگر
لگتا ہے آج بھی وہ رگ جاں کے پاس ہے

***

اکیلے میں ذرا پڑھ کر سمجھنا
کہ میں تنہائیوں کی گفتگو ہوں

***

افسانۂ حیات تو بے رنگ تھا مگر
کس خوب رو کے ذکر نے فن پارہ کر دیا

***

تری الفت سے وابستہ میری تقدیر ہے جاناں
مرے آئینہ دل میں تری تصویر ہے جاناں

***

عود گلاب میں نہ کہیں یا سمن میں ہے
خوشبوئے دل نواز جو اس گل بدن میں ہے

***

بکھر بکھر کے یہ ہر دل عزیز ہوتا ہے
بچا بچا کے نہ رکھنا ہے یہ آئینہ دل کا

***

نظر اس کی نہیں اٹھی کبھی پھر اور کی جانب
نہ جانے کس حسیں دل بر کی صورت دل میں رکھتا
ہے

***

تری نگاہ ناز کی ہیں سب کرشمہ سا زیاں
سرور ہی سرور ہے خمار ہی خمار ہے

***

شہروں شہروں دمک رہے ہیں لال گلابی پیلے ہونٹ
حشر بپا ہے دل والوں پہ دیکھ کے رنگ رنگیلے ہونٹ

***

تمہیں بتاؤ کہ کیسے نہ مانتا اس کی
جو بات بات میں دیتا ہے واسطہ دل کا

مگر یہاں یہ امر بھی وضاحت طلب ہے کہ معاملات حسن وعشق نسیم اعظمی کی شاعری کا بنیادی وصف نہیں ہے۔ان کے یہاں اس طرح کے موضوعات بہت کم رقم ہوئے ہیں۔

نسیم اعظمی کے کلام کے کچھ منتخب اشعار جو اپنی گہری معنویت کا احساس دلاتے ہیں اور جس میں اخلاقیات کا درس ملتا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اخلاص و مروت جسے مرغوب نہیں ہے
وہ شخص کسی شخص کا محبوب نہیں ہے

***

کیا وہ شرمندۂ تعبیر بھی کر پائے گا
جو کہ سپنے بھی سجوتا نہیں پورا پورا

***

ایک اک گیارہ اگر دنیا میں ہوتا ہے تو پھر
توڑ تفریق و تعصب بے حسی کا آئینہ

***

یہ نوجوان ہیں عہد شباب ہے پھر بھی
دلوں میں ہلچلیں ذہنوں میں انقلاب نہیں

***

جب معاملہ پڑتا ہے تو کھلتی ہے حقیقت
ظاہر میں یہاں صاحب کردار بہت ہیں

***

کوئی بھی جاگے گا کچھ تو کنمنائے گا
دستکیں دیے جاؤ غفلتوں کے موسم میں

جہاں ریت اڑتی تھی ہر دم نسیمؔ
نئی حکمتوں سے وہ گلزار ہے

نسیمؔ اعظمی کے اس اعتراف کے باوجود جب ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری حساس اور زندہ دل شاعر کی شاعری ہے۔ان کی شاعری میں مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری میں اپنے اطراف واکناف کے مسائل بھی ملتے ہیں ساتھ ہی وہ بڑی خوبصورتی سے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کا فن بھی جانتے ہیں۔تعلیم کی اہمیت وافادیت کا بیان بڑی کثرت سے ان کے اشعار میں ملتے ہیں۔لب و رخسار اور ہجر و وصال کی باتیں نہایت ہی مہذب اور شائستہ لہجے میں بیان کرتے ہیں۔انسانی زندگی اپنے حقیقی خدوخال میں ان کی غزلوں میں مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔

نسیمؔ اعظمی کی غزلیں تاریخی حقائق،جدید تعلیمی نظریات کی آگاہی اور بین الاقوامی افکارونظریات کی جستجو کی غماز ہیں۔اس ضمن میں عبرت مچھلی شہری لکھتے ہیں:

> ’’ان کی بیشتر غزلیں ان کی نثر کی فکری محور پر گھومتی ہیں۔ان کے زیادہ تر شعروں میں جدید تعلیمی نظریات کے عکس جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔یہ بات قابل غور ہے کہ ان کی غزلوں میں عشق وحسن اور گل وبلبل کی داستان سرائی کے بجائے علم وعمل،سائنس اور حکمت کی جلوہ طرازیاں ہیں۔‘‘ 10

نسیمؔ اعظمی قوم وملت کی تعلیم کے تئیں بے انتہا فکرمند رہتے تھے۔ان کی شاعری میں جابجا اس بات کا ذکر بھی ہے۔ان کے اندر ایک جذبہ کارفرما ہے جس کے ذریعہ وہ تمام لوگوں کو تعلیم سے جوڑ کر مسلمانوں کے ماضی کے علم و وقار کی داستانوں کو ہمیشہ کے لیے پھر منور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ پورے عالم کے انسانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ جس قوم کو جاہل،گنوار تصور کر رہے ہو اور حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہو وہ آج بھی تعلیم کے ہاتھوں دنیا کا چہرہ بدل سکتی ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تازہ نسلوں کو نئے علم سکھا کر دیکھو
اب بھی پوشیدہ ہیں اس قوم میں جوہر کتنے

***

فروغ علم و حکمت سے عروج قوم ملت ہے
یہی تقدیر ہے جاناں یہی تدبیر ہے جاناں

***

پھر لوٹ تو سائنس اور تعلیم کی جانب
گر اپنی ترقی کا طلب گار بہت ہے

***

کچھ ایسی ذہن سازی چاہیے طفلان مکتب کی
کہ پیدا خود بخود ہو علم سے رغبت کی گنجائش

***

نئی سائنس و حکمت بن چکی ہے وقت کی حاجت
یہ جادو ہے جو سر چڑھتا رہا آہستہ آہستہ

***

علم و سائنس و حکمت سے دے جگمگا
اجڑا اجڑا بہت اپنا ایوان ہے

نسیمؔ اعظمی نے اپنی غزلوں میں جس موضوع کو زیادہ اہمیت دی وہ علم و تعلیم ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ فرزندان قوم کو جدید تعلیم اور ٹکنالوجی کی طرف مائل کرنے کی حتی المقدور کوششیں کیں،وہ اس راہ میں سر سید،حالیؔ اور اقبالؔ کے ہمنوا دکھائی دیتے ہیں۔مثال کے طور پر علامہ اقبالؔ ’’مسلمان اور تعلیم جدید‘‘ جیسی شاہکار نظم میں لکھتے ہیں۔

اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا
ہے خون فاسد کے لیے تعلیم مثل نیشتر

نسیم اعظمی لکھتے ہیں۔

جو علم وفن سے رہے گا عاری سائنس وتکنک سے دور ہوگا
وہ کاروبار جہان نو میں سدا یونہی کم عیار ہوگا
یہ علم و حکمت یہ لعل وگوہر یہ گمشدہ ہیں متاع مومن
انھیں کو پا کے جہاں میں پھر سے تمہارا عزو وقار ہوگا

مولانا الطاف حسین حالؔی ''مسدس حالی'' میں علم و ہنر حاصل کرنے کی بات کتنے اچھے انداز میں کرتے ہیں اور مسلمان قوم کو غیرت دلاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کسی نے یہ اک مرددانا سے پوچھا کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا عقل جس سے ملے دین ودنیا کہا گر نہ ہو اس سے انسان کو بہرا
کہا پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہ جو باعث افتخار بشر ہے
کہا گر نہ ہو یہ بھی اس کو میسر کہا مال ودولت ہے پھر سب سے بڑھ کر
کہا اور ہو یہ بھی گر بند اس پر کہا اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر
وہ ننگ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلایق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

مولانا حالؔی کی طرح نسیم اعظمی ایک مربوط انداز میں علم و ہنر کے فوائد اور عدم حصول پر اس کے نقصانات، بیان تونہیں کرتے (چونکہ نسیم اعظمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل کا ہر شعر عموماً جداگانہ مضمون کا حامل ہوتا ہے) لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کی غزلوں میں بارہا اور بیشتر جگہوں پر علم وحکمت کے فوائد اور قومی عزو وقار کی باتیں ملتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

علم نافع کی برکتوں کے بغیر
قومی عزو وقار مشکل ہے

علم کی برکت ہے حکمت کی کرشمہ سازیاں
چلچلاتی ریت کی پوشاک دھانی کر دیا

***

عمل،تعلیم،محنت میں توازن کر ذرا پیدا
تیری تقدیر بولے گی تیری تدبیر بولے گی

***

کٹ کے رفتار زمانہ سے ہوئی ہے کم وقار
ملت بیضا کو بھی تعلیم باسی کھا گئی

جب ہم قرون وسطی کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ پیروان محمدؐ علوم وفنون کے منتہی اور امام تھے۔آج یورپ جوشعبۂ علوم وحکمت اور سائنس وٹکنالوجی میں اپنا لوہا منوار ہا ہے در اصل انہی پیروان محمدؐ کے علوم وفنون سے کمال درجہ اکتساب فیض کیا ہے۔لیکن اہل یورپ کبھی بھی ان سے حاصل فیض رسانیوں کا اعتراف نہیں کرتے۔نسیم اعظمی نے ان امور ومعاملات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے،وہ اپنے اشعار کے ذریعہ قرون وسطی کی یاد تازہ کراتے ہیں اور ملت اسلامیہ کو جھنجھورتے ہیں،انھیں عروج وارتقاء کی ترغیب دلاتے ہیں اور اس کے لیے تحصیل علم کو ناگزیر بتلاتے ہیں۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بن گئی سائنس و حکمت کا چراغ بے بدل
اہل یورپ لے گئے جو میرے گھر کی روشنی

***

پھر لوٹ تو سائنس اور تعلیم کی جانب
گر اپنی ترقی کا طلب گار بہت ہے

***

پڑھی ہیں اہل یورپ نے کتابیں میرے آبا کی
نہیں تو اس سے پہلے کتنے ظلمت ناک تھے بابا

***

یہ دنیا گول ہے ہم نے بتایا ہم نے ناپا ہے
سمندر چیرتے تھے کس قدر بے باک تھے بابا

***

گنوادی فکر کی دولت خزانے علم و حکمت کے
وہ دن بھی تھے کہ ہم انسانیت کی ناک تھے بابا

***

جہالت اور لا علمی نے رسوا کر دیا ہم کو
کبھی ہم با شعور و صاحب ادراک تھے بابا

***

اس جہان آب وگل میں افضل و اعلا ہے وہ
پا گیا جو علم و حکمت ،روشنی کا ذائقہ

***

یہ دین بھی ہے کہنہ پرستی کے جھول کی
علم و شعور لے گیا دستار دے گیا

***

چراغ آگہی جس نے دیا تھا اہل مغرب کو
وہی ملت جہاں میں آج بے تنویر ہے جاناں

***

علاج ملت بیضا ہے تعلیمی ترقی میں
سدا اس نسخۂ نایاب کی تاثیر بولے گی

نسیم اعظمی ایک اچھے معلم ہیں۔حکومت اتر پردیش سے ''بیسٹ ٹیچر ایوارڈ'' سے بھی سرفراز کیے جا چکے ہیں۔درس وتدریس سے ان کا دلی لگاؤ رہا ہے،انھیں طلبہ بے انتہا عزیز ہیں،ان کے نزدیک طلبہ کی زندگیوں کو سجانے سنوارنے میں معیاری تعلیم کے علاوہ کوئی دوسری چیز نافع نہیں ہوسکتی۔وہ ہمیشہ علم کے متلاشی کو بے ہنر تعلیم سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ علم کے بغیر ہر چیز چاہے جتنی بھی عمدہ ہو وہ بے حیثیت اور بے معنیٰ ہے۔

جو نہ دولت ہو علم سے مربوط
اس کی ہر آب و تاب بے معنی

***

ہے جو رائج یہ بے ہنر تعلیم
اپنے بچوں کو بھی دلاؤں کیا

دیگر علوم وفنون پر جس طرح کتابیں لکھی گئی ہیں اسی طرح طریقۂ تدریس پر بھی ماہرین فن نے خوب کتابیں لکھی ہیں۔درس وتدریس سے منسلک لوگ ان کتابوں سے استفادہ بھی کررہے ہیں۔نسیم اعظمی ماہر تعلیم ہیں،طریقۂ تدریس پر ان کی گہری نظر ہے،جس کا اثر ان کی غزلوں میں بھی دکھائی دیتا ہے،وہ سادہ اور سلیس انداز میں تعلیم اور تدریس کی اہمیت پر اپنے اشعار میں روشنی ڈالتے نظر آتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

صرف استاد ذی وقار ہے وہ
جو کرے علم و آگہی تقسیم

***

کم کو کثرت پہ جو گراں کردے
ایسی تعلیم ہی میں شکتی ہے

***

جو تعلیم مربوط پیشہ نہیں
تو بڑھتی رہیں گی یہ بے کا ریاں

***

اس قوم میں تدریس کچھ آسان نہیں ہے
جس قوم میں تعلیم کا فقدان بہت ہے

***

کچھ ایسی ذہن سازی چاہیے طفلان مکتب کی
کہ پیدا خود بخود ہو علم سے رغبت کی گنجائش

***

مدارس ہی سے تعلیم حقیقی عام ہو جاتی
اگر ہم علم و مذہب کی دو کاں داری نہیں کرتے

***

بے علمیت سے ہم ہیں گرفتارِ ما و تو
تعلیم جس نے پائی وہ آگے نکل گیا

***

علم کی صحرا نوردی بھی نسیم
بے شجر بے سائباں مجھ کو عزیز

ان کے کلام میں جذبات کی سہانی آنچ، حسیت کی چٹخی دھوپ، امید وبیم کی روشن کرنیں، زندگی کا

نشیب وفراز، زندگی کے مصائب و الجھن اور زندگی سے محبت کا جذبہ بھی کارفرما دکھائی دیتا ہے۔اس کے باوجود ان کی شاعری کا جو اصل موضوع اور محور ہے وہ صرف اور صرف تعلیم اور تعلیمی مسائل ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی ادبی و تعلیمی تحریروں کے انبار میں ان کی شعر گوئی اور شاعرانہ حیثیت دب کر رہ گئی ہے۔حالانکہ وہ ایک پختہ، مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔وہ برسوں سے دادِ سخن دے رہے ہیں۔ان کا کلام خوبصورت اور دلنواز کیفیات کا مجموعہ ہے۔اس میں تنوع اور گونا گونی ہے۔ان کے اصل جذبات خیالات کے نمونے نثری نگارشات کے مقابلے میں شعری تخلیقات میں زیادہ روشن ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے فکری تنوعات وموضوعات میں ایک بنیادی موضوع تعلیم بھی ہے۔وہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی سے مضمحل اور افسردہ ہیں اور بار بار متوجہ کرتے ہیں کہ مسلمان تعلیمی ترقی کے بغیر ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکتے۔وہ طرح طرح سے بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کمیوں کوتاہیوں کو واضح کرتے ہیں مجموعی طور سے جدید صالح اور قدیم نافع کے وہ علمبردار ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ قدیم تعلیم پر نیزہ زن اور جدید تعلیم کے بے راہ رو اور غیر مفید پہلوؤں پر تنقید کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ہماری عزت، وقار اور اعتبار سب کچھ تعلیمی ترقی میں مضمر ہے۔

نئی نسل کے جن شعراء نے مقصدی شاعری کو ترقی دی ان میں تعلیم اور تعلیمی مسائل کو شعری جامہ پہنانے کے لحاظ سے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ایک منفرد شاعر ہیں۔'' 11؎

نسیم اعظمی کی شاعری میں تعلیمی اور علم وآگہی کے ذوق وشوق اور دعوت فکر وعمل کا تذکرہ جا بجا نظر آتا ہے۔اس ضمن میں ''ڈاکٹر الف ناظم''، نسیم اعظمی کی دعوت فکر وعمل اور تعلیمی ذوق وشوق کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی شاعری ان کے تعلیمی مشن کے فروغ کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ان کے مجموعۂ کلام کے تقریباً ہر صفحے پر علم وفن کے متعلق ایسے اشعار مل جائیں گے جو دعوت فکر وعمل دیتے ہیں۔'' 12

تعلیم جیسے اہم موضوع کو اردو کے کچھ خاص شعراء نے ہی اپنے شعری جہان میں جگہ دی ہے ایسے شعراء میں نسیم اعظمی کا نام اہمیت کا حامل ہے، وہ اس موضوع سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ان کے شعری جہان کا بیشتر سرمایہ تعلیم ہی ہے۔وہ ایک منفرد شاعر ہیں۔ان کی شاعری پر کسی اور کے شعری لہجہ کی پرچھائیں نظر نہیں آتی۔جیسا کہ شارق عدیل رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کے شعری سمندر میں زندگی کی تمام معنوی موجیں ٹھاٹھیں مارتی پھرتی ہیں اور ہر اعتبار سے اپنے ہونے پر اصرار کرتی ہیں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی غزل موجودہ دور کی ایسی غزل ہے جس پر کسی کے شعری لہجے کی پرچھائیں نظر نہیں آتی ہے۔'' 13

آج کے اس پر آشوب دور سے نسیم اعظمی خوب واقف ہیں، وہ سرد وگرم حالات سے نبرد آزما ہونے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ان کا مشاہدہ گہرا اور تجربہ بہت وسیع ہے۔ان کی شاعری میں غم ذات اور غم جاناں سے زیادہ غم دوراں کا عکس نمایاں ہے۔موصوف کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے تاج الدین اشعر رطب اللسان ہیں:

> ''نسیم صاحب ایک نہایت حساس، باشعور اور دردمند انسان نیز تعمیر پسند اور خوش فکر شاعر ہیں۔جن کے اشعار فکر ونظر کے نئے دریچے کھولتے ہیں اور تازہ کاری کا احساس دلاتے ہیں ان کا مشاہدہ گہرا اور تجربہ وسیع ہے۔آج کے پر آشوب دور کے سرد وگرم حالات کا عکس ان کی شاعری کے کینوس پر نمایاں ہے ان کے یہاں غم ذات اور غم جاناں سے زیادہ غم دوراں کی جھلک ملتی ہے۔'' 14

نسیم اعظمی کی شاعری میں عصری انسانی صورتحال کا زوال پذیر اظہار مختلف پہلوؤں سے نظر آتا ہے۔ان کا دل اخلاقی اقدار اور انسانی رشتوں کے شکست وریخت سے بہت نالاں اور فکرمند ہے۔وہ مایوسی

اور شکست وخوردگی کے شکار نہیں بلکہ ان کے اندر حوصلہ مندی، خوداعتمادی اور اصلاح وانقلاب کے ساتھ ساتھ بیداری اور جہد وکوشش کے جذبات نظر آتے ہیں۔

محرومی ،مایوسی اور نامرادی انسان کو اندر سے کمزور کر دیتی ہے ،زندگی اور معاشرے کا ارتقاء حوصلوں سے ہوتا ہے اور نسیم اعظمی اس باریکی کو بخوبی جانتے ہیں اس لیے ان کے یہاں نہ بے ہمتی ہے نہ خوف ہے نہ مایوسی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی بیزاری ہے۔ وہ مشکل سے مشکل اور نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی نہ ہمت ہارتے ہیں اور نہ حوصلہ کھوتے ہیں بلکہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور میر تقی میر کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے رہتے ہیں اور اس بات سے مطمئن ہوتے ہیں۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

نسیم اعظمی مقابلہ بھی کرتے ہیں، حالات کو بدلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور نئے عزم وحوصلے سے کام بھی لیتے ہیں جس سے ان کے یہاں بے باکی ہے، ہمت افزائی ہے اور حالات کو بدل دینے کی ہمت بھی ہے، وہ تقدیر سے زیادہ تدبیر کے قائل ہیں اور علامہ اقبال کے درج ذیل شعروں پر ان کا یقین بہت پختہ ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

***

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن ہے فقط احکام الٰہی کا پابند

نسیم اعظمی کے شعروں میں جہاں حوصلہ مندی پائی جاتی ہے وہاں ان کا تیور عجب رخ اختیار کر لیتا ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں۔

عمل اور فکر و ہمت میں توازن جن کے ہوتا ہے
وہ رکھتے ہیں صدا اپنا مقدر اپنی مٹھی میں

***

عمل، تعلیم ،محنت میں توازن کر ذرا پیدا
تیری تقدیر بولے گی تیری تد بیر بولے گی

***

فروغ علم و حکمت سے عروج قوم و ملت ہے
یہی تقدیر ہے جاناں یہی تد بیر ہے جاناں

انھوں نے اپنے اشعار میں بڑے جوش اور ولولہ انگیز انداز میں تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کیا ہے خصوصاً اپنی ملت کے نوجوانوں کو حوصلہ دلاتے ہوئے پر جوش انداز میں ان کی ہمت بڑھائی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہنر ہے اپنی مٹھی میں کہ آزر اپنی مٹھی میں
گوہر بن جاتے ہیں آ آ کر کنکر اپنی مٹھی میں

***

زمین ہے اپنی مٹھی میں سمندر اپنی مٹھی میں
ارسطو بن کے رکھتا ہوں سکندر اپنی مٹھی میں

***

مٹے گی ظلمت نا خواندگی تنویر بولے گی
کبھی اس ملت بیضا کی بھی تقدیر بولے گی

***

فکر و عمل کا تازہ خیابان بن کے دیکھ
علم و ہنر کا پھر سے نگہبان بن کے دیکھ

***

عزم و ہمت ہو تو ہر راہ پہ چل سکتا ہے
آدمی گرتا ہے گر گر کے سنبھل سکتا ہے

***

میراث ہے مومن کی یہی حکمت و سائنس
غافل اگر اس سے ہے تو نادان بہت ہے

***

ابھی زندگی میں کئی معرکے ہیں
ابھی اپنی فتح مبیں اور بھی ہے

آج کل ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔شہروں شہروں اور گاؤں گاؤں میں قتل و غارت مذہب و تعصب کی آڑ میں ہو رہے ہیں، ملک میں قومی یکجہتی کا ان دنوں فقدان ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔مسلمان، ہندو اور دیگر مذاہب کے لوگوں میں تعصب کی آگ دلوں میں بھڑک رہی ہے جو وقتاً فوقتاً کوہ آتش فشاں کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔نسیم اعظمی نے اپنی شاعری میں اس خیال کو پیش کیا ہے کہ اس کا ذمہ دار کوئی ایک طبقہ نہیں ہے بلکہ یہ گھناؤنا کام جو بھی کرتا ہے وہ قوم و ملت اور ملک سے وفاداری کے منافی کرتا ہے۔ایسا انسان پرلے درجے کا بے وقوف اور انسانیت کا دشمن ہے۔چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

وہ ننگ دین و مذہب ہیں مسلماں ہوں کہ ہندو ہوں
جو اپنے ملک و ملت سے وفاداری نہیں کرتے

***

کہاں اب وہ ہندو مسلماں کا ایماں
بہت مسجدیں ہیں شوالے بہت ہیں

***

امن عالم کی جہاں بات ہوا کرتی ہے
خون ہوتے ہیں وہیں اجلے کبوتر کتنے

نسیم اعظمی کا سیاسی ومعاشرتی شعور بڑا بالیدہ اور بامعنیٰ ہے۔ وہ موجودہ سیاست کی گندگیوں اور چالاکیوں سے بھی واقف ہیں وہ اپنی سیاسی بصیرت کا آئیڈیل حضرت عمرؓ کو سمجھتے ہیں ان کے خیال میں ہندوستان میں مولانا آزاد اوران کے ہم عصروں کے بعد سیاسی رہنما شاید ہی پیدا ہوئے ہوں۔اس لیے سیاست ڈھونگ، مکاری اورعیاری کا نمونہ بن گئی ہے اور اتنی گندی ہوگئی ہے کہ اب اچھے اور شریف لوگ سیاست میں جانے سے کتراتے ہیں۔انھوں نے اپنے مختلف شعروں میں موجودہ سیاست کوطوائف کے مترادف قرار دیا ہے۔اس سلسلے میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

تو نسیم اور سیاست حاضر
اک طوائف سے پیار مشکل ہے

***

نسیم اعظمی بچ کے رہنا ہمیشہ
زمین سیاست بڑی دلدلی ہے

***

ہے کارو بار سیاست عروج پر جن کا
تمیز امر و نوا ہی خرید لیتے ہیں

***

کثافت کا پانی غلاظت کا پانی
بہت جا بجا ہے سیاست کا پانی

***

سیاست بن گئی ہے جب سے طوائف
کہیں رسم وفاداری نہیں ہے

***

سنبھا لو اے نسیم اب عزت نفس
سیاست کی سحر کاری بہت ہے

***

کا رو بار سیاست تو ہے اوج پر
پیار ایک گم شدہ قافلہ ہو گیا ہے

***

اب تو اسکول و مدارس کی نہیں علمی فضا
علم و دانش آگہی فکر سیاسی کھا گئی

طفلان مکتب کو کامیاب اور اچھا انسان بنانے میں سب سے اہم کردار مدرسین کا ہوتا ہے۔ مدرسین حضرات اپنی ذمہ داریوں اور رتبوں کو خود پہچاننے سے قاصر ہیں۔ ان کا جو مقام و مرتبہ ہے اس سے بے نیاز ہیں۔ اسکول کے وقت امور زندگی کے مسائل اور سیاسی بازیگری کے کرتب دکھانے میں مصروف عمل رہتے ہیں، بچوں کے تئیں علمی تربیت میں عدم دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ تعلیم جیسی ضروری شئے بھی تجارت کے نذر ہوتے ہوئے دِکھ رہی ہے۔ تعلیم کے نام پر طلبہ سے بے دریغ روپیہ وصول کیا جا رہا ہے۔ اسکول اور کالج کے نام پر جو دوکانیں کھولی جا رہی ہیں ان میں اپنے مطلب کو سامنے رکھا جاتا ہے اور بے صلاحیت اساتذہ کی تقرری عمل میں لائی جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر ان تعلیم گاہوں کے مالکان بغیر پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ حد تو اب یہ ہوگئی ہے کہ زکواتی قوت رکھنے والے اشخاص کی گرفت مدرسوں پر بہت زیادہ ہے۔ مدارس کے علماء بھی ایسے حضرات کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ جو شخص جتنی زیادہ زکواۃ جس مدرسہ میں دیتا ہے وہ وہاں کی علمی تربیت کی سرگرمیوں میں اتنی ہی قوت کے ساتھ دخل بھی دیتا ہے اور اپنے منشا کے مطابق اساتذہ کی

تقرری کرواتا ہے۔جس استاذ کی تقرری ان زکواتی قوت رکھنے والوں کی ایما پر ہوتی ہے اس کی علمی صلاحیت کا اندازہ آج کے مدارس کے تعلیمی معیار سے لگایا جا سکتا ہے۔نسیم اعظمی نے اپنے اشعار میں ایسے ہی مسائل کو پیش کیا ہے۔چند شعر بطور مثال دیکھیے ۔

درس گا ہوں پہ ہے قبضہ جا ہلان وقت کا
ذہن و دل کی پھر بھلا کرتا یہاں تطہیر کون

***

درس گاہوں پہ جا ہلوں کی گرفت
روشنی تیر گی کے چنگل میں

***

فروغ جہالت ہے سارا عمل
ہیں تعلیم کی بس ادا کا ریاں

***

ہے اس کے بھی لہجے میں سو دا گری
جو تعلیم گا ہوں کا سر دار ہے

***

آ گہی تعلیم گاہوں سے بھی رخصت ہوئی
جس کی ہوتی بھی نہیں فکر تلا فی جا بجا

***

اس صدی کی کیا یہی ہے بستیٔ عاد و ثمود
جہل کے قبضے میں جو ہے خواندگی کا آئینہ

یہ سچ ہے کہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا لیکن جھوٹ اور مصلحت منطقی انداز میں ساری دنیا پر حاوی ہے۔مثال کے طور پر ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

آئینہ کیوں دکھا دیا اس کو
اب ملے گا کبھی نہ آئندہ

علماء، انبیاؑء کے وارث ہوتے ہیں لیکن آج کے کچھ خاص علماء اس وراثت سے محروم نظر آتے ہیں۔ نسیم اعظمی کا مندرجہ ذیل شعر ایسے علمائے دین پر صادق آتا ہے۔

ذہن و دل ہیں سیا ہیوں میں غرق
جسم پر ہے لباس تابندہ

تلمیح ایک ایسی صنعت ہے جس کا فقدان اردو زبان وادب میں نہیں ہے۔ اردو کے قدیم وجدید ادباء وشعراء اس صنعت کے ذریعہ اپنے احساسات وجذبات میں نہ صرف اثر آفرینی پیدا کرتے ہیں بلکہ طویل سے طویل واقعات اور ماضی کے حالات وحادثات کو چند جملوں میں مقید کردیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ گاگر میں ساگر بھر دیتے ہیں۔ نسیم اعظمی کی شاعری میں بھی تلمیحاتی اشعار کا ایک جہان آباد ہے۔ وہ اپنے اشعار میں بار بار قرون وسطی کی تاریخ کی ورق گردانی کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنے اسلاف کے سائنسی اور دیگر علمی کارناموں کا تذکرہ تلمیح کی زبان میں کرتے ہوئے قوم کو بھولا ہوا سبق یاد دلاتے رہتے ہیں۔ ان کی تلمیحات پڑھتے وقت ہماری آنکھوں کے سامنے جابر حیان، بوعلی سینا، زکریا الرازی، البیرونی، الکندی، ابن خلدون اور عمر خیام کے انقلاب آفریں، حیرت انگیز اور تاریخ ساز کارنامے گردش کرنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر۔

گنوادی فکر کی دولت خزانے علم وحکمت کے
وہ دن بھی تھے کہ ہم انسانیت کی ناک تھے بابا

***

کیے ہیں ہم نے پیدا ابن سینا ،ہیثم ،ادریسی
جنون علم میں ہم کتنے دامن چاک تھے بابا

نسیم اعظمی کا مطالعہ اسلامی تاریخ پر بھی بہت گہرا ہے جس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل تلمیحی اشعار

سے لگایا جا سکتا ہے۔

خلیفہ پیادہ غلام اونٹ پر
عجب تھیں ہماری جہاں داریاں

***

جن کے ہاتھوں نے اکھاڑا تھا درِ خیبر کبھی
ان میں اب پیدا نہیں ہوتا کوئی صاحب یقیں

***

جو رسم و روایت کے بت توڑ ڈالے
براھمی قلب و نظر چاہتا ہوں

***

اسی چٹان سے پانی نکالنا تھا ہمیں
جو اپنے پاؤں رگڑتے نہیں تو کیا کرتے

***

یوسفؑ چاک پیرہن بننا
دامن داغدار مت ہونا

***

ہزاروں مصلح و پیغمبر و ہادی نبی آئے
مگر اب تک منافق اور مکاروں کی دنیا ہے

***

یہ آدمی تو براھیم بھی ہے آزر بھی
اسی میں بت شکنی بھی ہے بت پرستی بھی

تاریخی مقامات کے تئیں ان کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ قرطبہ ہو تاج ہو اہرام مصر ہو
اہل ہنر سے سارا جلال و جمال ہے

***

غزنوی سے بت کدوں کا تذکرہ تو کردیا
دیکھ رسم آزری زیرو زبر ہو جائے گی

نسیم اعظمی کے تلمیحاتی اشعار میں شیریں، فرہاد، خسرو، لیلیٰ و مجنوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو عموماً شعراء کے تلمیحاتی اشعار کا محور رہا ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

بھلا دیتی ہے دنیا خسرو و پرویز کو اکثر
مگر فرہاد و مجنوں سا دیوانہ یاد رہتا ہے

***

رہے تیشہ بہ کف فرہاد سے آگے کئی لیکن
کوئی گمنام رہ جائے کسی کا نام رہ جائے

***

تیشہ و بے ستوں زندگی
شیریں فرہاد خسرو لگے

***

یہ اپنا عشق موجودہ صدی کی اک حقیقت ہے
نہ لیلیٰ کا یہ قصہ ہے نہ مجنوں کی کہانی ہے

نسیم اعظمی کے کچھ تلمیحاتی اشعار قدیم ومشہور ومعروف شعراء کے ہم پلہ لگتے ہیں، مثلاً علامہ اقبال کا یہ تلمیحی شعر جو موقع بہ موقع ہر خاص وعام کی زبان پر رہتا ہے۔

آج بھی ہو جو براھیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

بالکل اسی طرز کا نسیم اعظمی کا تلمیحی شعر ملاحظہ ہو۔

چاہ زم زم کی یہ تاریخ بتاتی ہے ہمیں
پاؤ ں کی ضرب سے چشمہ بھی ابل سکتا ہے

تلمیح کی طرح اردو شاعری میں استعاروں کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔استعارہ کے بغیر اچھی اور مؤثر شاعری ذرا مشکل ہے اس لیے شعراء نے استعاروں کا استعمال خوب کیا ہے۔استعارہ سازی میں شاعر کی فنی خوبیوں کی خاص کارفرمائی ہوتی ہے اور جن شعراء کے یہاں استعارات وتشبیہات کا جتنا بہتر اور تخلیقی استعمال ہوتا ہے اس کی شاعری کے معیار و وقار میں اسی تناسب سے اضافہ ہوتا ہے، چنانچہ قدیم شعراء سے لے کر عہد حاضر کے موجودہ شعراء کے یہاں بھی اپنے اپنے طریقوں سے استعاروں کا استعمال پایا جاتا ہے۔

نسیم اعظمی نے بھی اپنی شاعری میں استعاروں اور تشبیہات کا برمحل استعمال خوب کیا ہے اور یہ استعمال شعوری سے زیادہ فطری انداز میں ہوا ہے جس سے ان کے اشعار میں جان سی آ گئی ہے۔

غزل کا استعارہ بولتا ہے
کنایہ اور اشارہ بولتا ہے

***

کچھ نئے الفاظ با معنی اشارے دے گیا
تازہ تشبیہیں،انوکھے استعارے دے گیا

***

ایک ہنگامہ بپا ہے ذہن و دل کے درمیاں
رنگ لائی ہے میرے علم و ہنر کی روشنی

نسیم اعظمی اللہ تعالیٰ سے اس کی تمنا کرتے ہیں اور دعا گو ہیں۔

بر محل تشبیہ دلکش استعارہ دے مجھے
دل نشیں الفاظ با معنی اشارہ دے مجھے

ان کے استعاروں کو بھی ملاحظہ کیجیے۔

اب پیمبر کوئی آئے گا نہ ہوگا معجزہ
راہ دکھلائے گی حرف معتبر کی روشنی

***

گھٹا زلف ہے میکدہ اس کی آنکھیں
ہے چہرہ کتابی بدن صند لی ہے

غزل کا وہ خطہ جو کہنہ مشق شعراء کا بھی امتحان لیا کرتا ہے، جہاں موسیقی اور زبان کے بہاؤ کو برقرار رکھنے کے لیے شاعر کو مزید شعری مشققتوں سے گزرنا پڑتا ہے، وہ خطہ چھوٹی بحر ہے۔نسیم اعظمی چھوٹی بحروں میں بھی غزلیات بہت مشاقی کے ساتھ تخلیق کرتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے۔

اس میں شامل ہوا اگر ہوس
عشق کو بھی خطاؤں میں رکھ

***

دعا نہ دینا دوا نہ دینا
مرے جنوں کو سزا نہ دینا

***

زندگی لائی ہے کس جگہ
ہر کوئی الجھا گیسو لگے

***

جام ہے وہ چھلکتا بدن
آنکھ سے تو وہ آہو لگے

ان کے مجموعہ کلام میں شاعرانہ تعلّی کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور یہ تو شاعروں کی فطرت میں شامل ہوتا ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، لیکن نسیمؔ اعظمی کے یہاں جس تعلّی کا وجود ہے وہ مذموم نہیں بلکہ محمود تعلّی ہے یعنی وہ مقصدیت اور جامعیت کو سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔

اے بنکروں کے شہر فضاؔ و اثرؔ کے بعد
کوئی نسیمؔ جیسا سخنور نہیں رہا

***

نسیمؔ تیرے قلم کے ہنر سے کاغذ پر
کھلا کرے گا سدا یوں ہی علم و فن کا گلاب

***

نسیمؔ شعروں میں تیرے اتنی جو معنویت کی ہیں یہ جہتیں
کرشمہ ہے یہ مطالعہ کا یا تیری فکر رسا کا کرتب ہے

***

نسیمؔ تجھ میں کتابوں کی پیاس ہے سچی
یہاں تو صرف ہیں شیخی بگھارنے والے

***

نسیمؔ فکر ہو تیری کہ شاعری تیری
اس عہد نو میں گذشتہ نصاب جیسی ہے

نسیمؔ اعظمی نے دیگر زبانوں کے الفاظ کو بھی اپنی شاعری میں بڑی چابک دستی سے جگہ دی ہے۔ وہ اس فن سے اچھی طرح واقف نظر آتے ہیں۔ ان کے اندر قومیت پسندی اور انسانیت پسندی کا جذبہ بھرا ہوا

ہے۔''ہندی'' ہندوستان کی قومی زبان ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں تعلیم کی اہمیت بتاتے ہوئے تمام ہم وطنوں کو ہندی اور اردو زبان کی آمیزش سے مخاطب کیا ہے۔مثلاً ؎

آؤ یارو! ہم بھی دیکھیں کچھ سپنے کچھ خواب نئے
دھرتی اور آکاش بنائیں ،سورج اور مہتاب نئے

***

کم کو کثرت پہ جو گراں کر دے
ایسی تعلیم میں ہی شکتی ہے

اللہ کی وحدانیت پر یقین ہمارا ایمان ہے نسیم اعظمی بھی اس حقیقت سے بہرور ہیں انھوں نے عربی الفاظ کا استعمال خوبصورت اور دلکش انداز میں کرتے ہوئے اس حقیقت کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں ؎

خدائے لم یزل تنہا مگر ہر جا وجود اس کا
وہی دیرو کلیسا میں وہی کعبہ میں رہتا ہے

***

نسیم بے غرض اللہ اکبر
یہ اک ڈنڈے سے سب کو ہانکتا ہے

عربی زبان کے استعمال کی چند اور مثالیں دیکھیے ؎

کن سر پھروں نے وقت کے تیور بدل دیے
پگڑی اچھال دی ہے یہاں قیل و قال کی

***

آئینہ حیات بہت فرد فرد ہے
صنعت یہ ہے نسیم اسی ذو الجلال کی

نسیم اعظمی کی شاعری میں بعض جگہوں پر لوک گیت جیسے اشعار بھی در آئے ہیں۔جس میں

ہندوستانی تہذیب اور دیو مالائی اثر نمایاں نظر آتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اب نہ رادھا ،کنہیا ،نہ مدھوبن رہے
زندگی کا ہے ماتم تیرے گاؤں میں

***

پیڑ پیپل کے نہ پھر گاؤں میں پنگھٹ ہوں گے
گوپیوں کی نہ کنہیا کی ادا میرے بعد

قرآن کریم رب العالمین کی نازل کردہ ایسی کتاب ہے جسے ہر دور اور ہر عصر میں پڑھا اور سمجھا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے آسمانی صحیفہ سمجھنے والے عقیدے اور ایمان کی بناء پر ثواب کی نیت سے پڑھتے رہے اور اس کے اندر پنہا خوبیوں سے نا آشنا رہے جب کہ اغیار اپنی جملہ ریشہ دوانیوں اور اسلام دشمنی کے باجود اس کی ان خوبیوں سے آگاہی و واقفیت کی تلاش میں ہمہ تن مصروف رہے جن کی بناء پر اس کتاب الٰہی کو ناپید کرنے کی ہزار جتن کے باوجود کامیابی نہ ملی، بالآخر اس کو اپنے مطالعہ اور تحقیق کا خاص محور بنا لیا پھر کیا تھا؟ اس سے ایسے ایسے جو ہر پارے نکالے اور ایسی ایسی تحقیقات کھل کر سامنے آئیں کہ انگلیوں تلے دانت دبانا پڑا اور اس کا اعتراف زبان قال سے نہ سہی زبان حال سے کرنا ہی پڑا کہ یہ کتاب علم و معرفت کا بیش بہا خزینہ ہے جو نسل انسانی کو عین اس کے تقاضے کے مطابق ہمہ وقت علمی غذا فراہم کرنے کی اہلیت و صلاحیت رکھتی ہے، اس کتاب کے متعلق نسیم اعظمی نے کتنی سچی بات کہی ہے اور حاملین قرآن کو چوٹ لگایا ہے کہ صرف اس کو کتاب ہی نہ سمجھو بلکہ اس کی اصلیت سے بھی آگاہ رہو۔

طاق نسیاں پہ جسے ہم نے سجا رکھا ہے
وہ صحیفہ نئی سائنس کا دفتر نکلا

قرآن پاک کے متعلق ان کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔

آخری وہ کتاب ہدایت بھی اب
طاق نسیاں پہ کیوں نذر جزدان ہے

آئے نہ جانے کتنے صحیفے جہان میں
باقی نہ رہ سکا کوئی قرآن کی طرح

نسیم اعظمی کی شاعری میں قوم وملت کا درد دکھائی دیتا ہے انھیں اپنی قوم سے محبت و ہمدردی ہے،انھیں اپنی قوم کی زبوں حالی کا احساس ہے وہ اپنے اشعار میں ہمیں اس کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں۔

کوئی حسرت سے تاکے ہے کوئی عبرت سے دیکھے ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا حقیقت ہوں کہ افسانہ

***

ہمیں اسلاف کا عز و شرف ملتا بھلا کیوں کر
نہ وہ رسم روا داری نہ وہ طرز حکیمانہ

نسیم اعظمی نے جہاں اپنی شاعری میں نئے موضوعات نئے مضامین اورنئی فکری جہتوں کا اظہار کیا ہے وہیں انھوں نے کچھ کلاسیکی شعراء سے پرانے خیالات وموضوعات نئے انداز واسلوب میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی معنویت نیا رنگ اختیار کرگئی ہے یعنی مومن کا یہ طرز تھا کہ وہ اپنے تخلص کا عمدہ استعمال کرتے تھے۔نسیم اعظمی نے بھی اپنے کلام میں تخلص کو بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے چند مثالیں پیش ہیں۔

مومن خان مومن کہتے ہیں۔

اللہ رے گم رہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

***

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

نسیم اعظمی کہتے ہیں۔

نسیم صبح کا رشتہ گلوں سے تو رہے گا ہی
کوئی کیوں خوشبوؤں کو دیکھ کر تیور بدلتا ہے

***

نسیم صبح سے کہہ دو سبک شیریں زباں ہو کر
زمانے کی نظر میں باعث اکرام ہو جائے

***

ہے عصر نو کی صبا و نسیم کا بھی خرام
جو دور دور ہمارے سخن کی خو شبو ہے

***

نسیم صبح ہے باد صبا بھی
پڑے جو وقت تو صرصر بہت ہے

***

میں نسیم سحر ہوں نسیم سحر
ساتھ خوشبو کے خود بھی بکھرتا ہوں میں

نسیم اعظمی بذات خود ایک استاد ہیں۔تاثراتی، جمالیاتی اور عملی تنقید میں انھیں اچھی دسترس حاصل ہے،انھیں شاعری کی تنقید میں بھی دلچسپی ہے اور فکشن کی تنقید مین بھی۔شاعری کی تنقید میں ان کے مختلف شعراء پر لکھے گئے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''نقد سخن'' کے نام سے شائع ہو چکا۔اس کے علاوہ فکشن تنقید میں ان کی ایک اہم کتاب ''اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ'' شائع ہو چکی،اس کتاب میں ابتدائیہ کے نام پر ان کا لکھا ہوا مقدمہ جو 67 صفحات پر مشتمل ہے اردو کی فکشن تنقید و تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔انھوں نے اس مقدمہ میں اردو فکشن کی تنقید پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے اس سے پہلے اس نوعیت

سے کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے مختلف لوگوں کی کتابوں پر جو مقدمہ، دیباچہ اور تقریظیں لکھی ہیں ان میں بھی ان کی تنقیدی بصیرت کا احساس بولتا نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ ان کے بہت سے شعروں میں بھی تنقیدی نکات کے اشارے پائے جاتے ہیں۔بعض شعروں میں انھوں نے اشارے کنائے میں بڑے بڑے تنقیدی نقطے اور مسئلے پیش کر دیے ہیں جن کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تنقیدی بصیرت بڑی وسیع و وقیع ہے۔چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں ؎

چناب وراوی و گنگ و جمن کی خوشبو ہے
غزل کے پھول میں بنگ و دکن کی خوشبو ہے

***

گلوں کا رنگ عنادل کا یہ ترانہ ہے
زبان اردو غزال ختن کی خوشبو ہے

***

سبک نرم و شیریں کبھی یہ بہت تھی
مگر کھر دری اب زبان غزل ہے

***

مجھے محدود رکھنا چاہتا تھا
نسیم صبح بن کر چار سو ہوں

***

پھیلا کے ہم نے روشنئ علم و آگہی
تاریکیوں سے کی بغاوت تمام عمر

نسیم اعظمی اپنے ملک اپنی زبان اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے بڑی والہانہ محبت رکھتے ہیں اور ان چیزوں کا کسی بھی حال میں سودا کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں۔ وہ نہ اپنا ملک چھوڑ سکتے ہیں اور نہ اپنے ملک سے جو محبت ہے اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ انھیں اپنی قومیت اور ہندوستانیت پر فخر ہے انھیں اپنی مادری زبان اردو سے غیر معمولی تعلق خاطر ہے لیکن ان کے اندر لسانی تعصب کا سائبہ تک نہیں وہ اردو ہندی سمیت ہندوستان کی ساری زبانوں کو اہمیت دیتے ہیں اور سب کے فروغ و ترقی میں یقین رکھتے ہیں اور ہر زبان کے بڑے بڑے مشاہیر کو خصوصاً ہندوستانی لسانی مشاہیر کو باعزت اور محترم تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے سولہ سال کی عمر میں زمانہ طالب علمی میں اردو زبان و ادب کا بیڑا اٹھایا تھا جو ان کی آخری زندگی تک قائم رہا۔

نسیم اعظمی اردو زبان کے لیے جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ بڑے خلوص سے کرتے ہیں اور صلہ و ستائش کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کی تعلیم، عصری علوم اور جدید علوم سے اردو داں طبقے کو اردو زبان کی جانکاری رکھتے ہوئے تمام علوم و فنون میں آگے بڑھنے کے لیے مہماتی انداز میں کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے جہاں نوجوانوں کی تعلیمی رہنمائی کی ہے وہیں اردو کی جانکاری پر زور بھی دیا ہے اور کئی غیر اردو داں خصوصاً غیر مسلم نوجوانوں کو اردو سے اس قدر واقف کرایا ہے کہ وہ آج اردو پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھ بھی سکتے ہیں۔

نسیم اعظمی نے جہاں اردو زبان اور اردو کی تعلیم کے لیے بے پناہ عملی کوششیں کی ہیں وہیں اردو زبان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی مختلف شعروں میں کیا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں ۔

یہی اکیلی اک اردو زبان ہے جس میں
ہر اک علاقے کی ہر ہر چمن کی خوشبو ہے

***

گلوں کا رنگ عنادل کا یہ ترانہ ہے
زبان اردو غزال ختن کی خوشبو ہے

***

اپنی اردو زبان کے لیے
کچھ کریں آؤ ہم سوچ کر

پروفیسر شارب ردولوی، نسیم اعظمی کی شعری جہت کو دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نقدسخن'' اور'' میزان آگہی'' کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔آپ کے مضامین سے پہلے آپ کے اشعار نے متوجہ کیا۔سیدھی سادی غزلوں میں جو محبت اور انسان دوستی کا جذبہ ہے وہ بہت قیمتی ہے۔آپ کا ایک شعر ہے

نسیم اب ہر سخن مبہم ہے تیرا
وہ پہلی سی وضاحت کھو گئی ہے

لیکن مجھے نہ ابہام کہیں نظر آیا اور نہ وضاحت آپ نے تو سادگی کے ساتھ اپنے تاثرات اور تجربات نظم کر دیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان اشعار کی کہ ان میں کسی طرح کا تصنع یا بناوٹ نہیں ہے۔'' 15؎

نسیم اعظمی کا کلام پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ان کے یہاں اظہار کی پختگی، کلاسیکی رچاؤ، گہری دردمندی، جذبات کی فراوانی اور شدت احساس نمایاں ہے۔دوسری بات یہ کہ انھوں نے نئے نئے موضوعات کو اپنی غزل میں سمویا ہے۔عشقیہ اشعار کم ہیں لیکن بعض سماجی مسائل یعنی اخلاقی قدروں کا احترام اور تعلیم کی اہمیت اور ضرورت جیسے مسائل کو انھوں نے اپنی غزلوں میں خاص جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے عام شعراء کی طرح آنکھ بند کر کے اندھی تقلید نہیں کی بلکہ اپنی دنیا خود آباد کرنے کا ہنر بھی سیکھا ہے اور مختلف پیرایہ بیان میں مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے ان کا زبان و بیان پر قدرت، کلاسیکی موضوعات پر گرفت، فنی محاسن کا خوبصورت استعمال اور نئے نئے مضامین کو غزل کے ذریعہ پیش کر کے سماجی اصلاح کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش بھی نظر آتا ہے۔

غرض نسیم اعظمی کی شاعری ان کے سچے جذبات و احساسات کی شاعری ہے جسے وہ سیدھے

سادے انداز میں پیش کر دینے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ان کی شاعری ان کے سچے اور حقیقی جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہے جس میں ہمیں عصری حسیت اور سماجی شعور سب کچھ نظر آتا ہے۔

*****

حوالے

1 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، میزان آگہی۔ص35

2 احسن امام احسن، اردو کا سچا خادم۔۔۔ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، مشمولہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ص48-47

3 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، نقد سخن۔ص21

4 مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات۔ص492

5 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، فیضان آگہی۔ص16

6 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، نقد سخن۔ص58

7 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، آثر انصاری پر چند تحریریں۔ص133

8 اسامہ ارشاد معروفی قاسمی، اردو شاعری کے معتبر چہرے۔ص137

9 ظہیر حسن ظہیر، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی سے ایک ادبی ملاقات (انٹرویو) مشمولہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ص108-107

10 عبرت مچھلی شہری ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخص و عکس''، مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ص66

11 ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، میزان آگہی اور ایم نسیم اعظمی، مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ص327

12 ڈاکٹر الف ناظم، وسعت فکر و خیال کا شاعر ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ص313

13 شارق عدیل، غزل کو سائنس و حکمت کی معنویت عطا کرنے والا شاعر: ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، مشمولہ

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ص289

14 تاج الدین اشعر رام نگری، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی شخصیت اور شاعری، مشمولہ، فیضان آگہی، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی۔ص23

15 پروفیسر شارب رودولوی، خیابان خیال، مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ص361

*****

باب چہارم

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تعلیمی خدمات

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تعلیمی خدمات

لفظ تعلیم کا لغوی معنیٰ ''سیکھانا، بتانا، تلقین، ہدایت ۔ تربیت'' کے ہوتا ہے اور تعلیم کا مفہوم عام طور پر اسکولی تعلیم سے لیا جاتا ہے لیکن حقیقت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس کا مفہوم اس سے کچھ مختلف اور کچھ زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ انسان کی نشو ونما کا بنیادی ذریعہ تعلیم ہے۔ انسانوں کے اندر بے شمار خداداد صلاحیتیں پوشیدہ ہیں، تعلیم کی مدد سے ان پوشیدہ خداداد صلاحیتوں کی نشو ونما اس کا صحیح سمت میں ارتقاء اور اس کے علم و فن میں اضافہ ہوتا ہے۔ تعلیم ہی انسان کے کردار میں تبدیلی لاتی ہے، اسے مہذب اور اچھا شہری بناتی ہے۔ تعلیم کا یہ عمل انسان کی ولادت کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ ولادت کے کچھ ہی دنوں بعد بچے کے والدین اور خاندان کے دیگر افراد اس سے بولنا، سننا، اٹھنا اور بیٹھنا سکھاتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ اسے چلنا، بات کرنا سکھاتے ہیں۔ بچہ جب تین یا چار سال کی عمر میں قدم رکھتا ہے تو اسے پڑھنا اور لکھنا سکھاتے ہیں، اس کے بعد پھر بچہ کو اسکول میں داخل کرا دیتے ہیں جہاں پر اس کی پڑھائی باضابطہ طور پر منظّم طریقے سے شروع ہو جاتی ہے۔ بچہ صرف اسکول سے ہی علم حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے خاندان اور سماج سے بھی علم سیکھنے کا عمل جاری رکھتا ہے۔ اسکول چھوڑنے کے بعد بھی سیکھنے کا عمل کسی نہ کسی شکل میں تا حیات جاری و ساری رہتا ہے۔ اس طرح ہم اگر صحیح معنوں میں غور وخوض کریں تو یہی سیکھنے اور سیکھانے کا عمل تعلیم کہلاتا ہے۔

تعلیم کے اشتقاقی یا لفظی مفہوم کے بارے میں پروفیسر ساجد جمال، عبد الرحیم اپنی کتاب ''ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم'' میں لکھتے ہیں:

> ''تعلیم دانوں اور دانشوروں کا یہ خیال ہے کہ یہ مندرجہ ذیل لاطینی (Latin) زبان کے الفاظ سے اخذ کیا گیا ہے۔
>
> 1. ایڈوکیئر (Educare) جس کا مطلب ہوتا ہے پالنا، پروان

چڑھانایاپرورش کرنا۔

2. ایڈوسیئر (Educere) جس کا مطلب ہوتا ہے باہرنکالنا۔

3. ایڈوکیٹم (Educatum) جس کا مطلب ہوتا ہے تربیت دینا۔

4. ایڈوکو(Educo) یہ دوالفاظ سے مل کر بنا ہے۔E جس کا مطلب ہوتا ہے اندر سے باہر(bring out)اور Duco جس کا مطلب ہوتا ہے نکالنا(To Lead Forth)یعنی educo کا مطلب ہوا اندر سے باہرنکالنا۔

یعنی تعلیم کا مطلب مندرجہ ذیل ہوسکتا ہے:

1)پالنا،2)پروان چڑھانا3)تربیت دینا 4)باہر نکالنا،5)پرورش کرنا۔'' 1

اس طرح مندرجہ بالا اصطلاحات کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم انسانوں کی ان چھپی ہوئی صلاحیتوں،قابلیتوں اوراہلیتوں کو باہرلانے اور مطلوبہ پرورش کرنے یا تربیت دینے کا سب سے اچھااور کار آمدعمل ہے۔

تعلیم کا مفہوم اور لفظی مفہوم سمجھ لینے کے بعد یہ بات جگ ظاہر ہو جاتی ہے کہ تعلیم اسکول اور اساتذہ کے ذریعے موصول اطلاعات اورطلبہ کے ذریعہ حاصل کیے جانے والاعلم ہی نہیں ہے بلکہ یہ شخصیت کا مکمل ارتقاء ہے۔تعلیم انسان کے ان تمام تجربات کا مجموعہ ہے جو پیدا ہونے سے لے کر مرتے وقت تک رونما ہوتے رہتے ہیں۔تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو تاعمر چلتا رہتا ہے۔تعلیم وقت،جگہ اورافراد کے قیود یا اس کے دائرے میں محدودنہیں رہتی ہے۔انسان دوسرے انسان کو کچھ سکھا رہا ہوا سے استاد کہا جا سکتا ہے اور کوئی بھی ایسی جگہ جہاں پر سیکھنے سکھانے کا کام چل رہا ہواسکول کہا جا سکتا ہے۔

مختلف دانشوروں نے تعلیم کے مفہوم کی وضاحتیں پیش کی ہیں مثلاً:

تعلیم کا مفہوم T.Raymont کی نظر میں:

''تعلیم نشو ونما کا وہ سلسلہ ہے جس سے انسان آہستہ آہستہ اپنے

طبعی،(Physical) سماجی اور روحانی ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا
کرتا ہے۔انسان کی زندگی کے مختلف تجربات ہی حقیقت میں اسے تعلیم
یافتہ بناتے ہیں۔انسان اپنے پیشے (Vocation) ازدواجی زندگی،
دوستی، شادی، سیر و تفریح اور سفر وغیرہ سے ہی تعلیم یافتہ کیا جاتا ہے۔'' 2

تعلیم کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے William Kilpatrick لکھتے ہیں:

'' اگر وسیع مفہوم میں دیکھا جائے تو ساری زندگی جو کہ سوچ سمجھ کر
گزاری گئی ہے، تعلیم ہے۔'' 3

Drever تعلیم کا مفہوم پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

'' اپنے محدود مفہوم میں تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس میں اور جس کے
ذریعے نوجوانوں کے علم ، کردار (character) اور طرز عمل کی
آرائش (mould) کی جاتی ہے اور انہیں ایک شکل دی جاتی ہے۔'' 4

تعلیم کے مفہوم کے بارے میں J.S.Mill لکھتے ہیں:

'' اپنے محدود مفہوم میں تعلیم کا مطلب اس تہذیب سے ہے جو کہ ایک
نسل اپنی آنے والی نسلوں کو اس امید پر دیتی ہے کہ یا تو وہ اس کا معیار
ایسے ہی رکھیں گے یا اس میں اور اضافہ کریں گے۔'' 5

مندرجہ مفکران تعلیم کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم صرف رسمی طریقوں سے ہی نہیں بلکہ غیر رسمی طریقوں سے بھی اثر پذیر ہوتی ہے۔انسان کی پوری زندگی جو اس نے سوچ سمجھ کر گزاری ہے اس کا اصل محور بھی تعلیم ہی ہوتی ہے۔تہذیب و ثقافت اور مذہب کے اصول و ضوابط کی پابندی کا لحاظ رکھنا اور آنے والی نسلوں کا اس کی یاد دہانی کرانا بھی تعلیم کا ہی رکن ہے۔

تعلیم کے مفہوم پر مختلف زاویۂ نظر سے بات ہو جانے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ تعلیم نُمو اور نشو و نما کا ایک عمل ہے اور اس عمل کے تصور کو مزید واضح کرنے کے لیے تعلیم کی تعریف کو مختلف ماہرین تعلیم کی آرا کی روشنی میں اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے مثلاً:

فروبیل (Froebel) کے مطابق:

''تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس سے انسان اپنے باطن (Internal) کو ظاہری (External) بناتا ہے۔'' 6

موہن داس کرم چند گاندھی کہتے ہیں:

''تعلیم سے میری مراد اطفال اور انسان کے جسم، شعور اور روح کی ہمہ جہت اور بہترین نشو ونما ہے۔'' 7

کانت (Kant) کا کہنا ہے:

''تعلیم ایک فرد کی ان تمام کاملیت (Perfection) کی نشو ونما ہے جس کی کہ اس کے اندر سکت ہے۔'' 8

سی وی گڈ (C.V.Good) کے لفظوں میں:

''تعلیم ان تمام سرگرمیوں کا مجموعہ ہے جن کے ذریعے سے انسان اس سماج میں جس میں کہ وہ رہائش پذیر ہوتا ہے مثبت انداز میں (Positively) اپنے طرز خیالات، صلاحیتوں، رویّے اور رجحانات کی نشو ونما کرتا ہے۔'' 9

ہربرٹ اسپنسر کے خیال میں:

''تعلیم کا مطلب انسان کی خداداد صلاحیتوں (Inherent Power) اور باہر کی زندگی کے بیچ ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔'' 10

مندرجہ بالا عبارتوں میں جو تعلیم کی توضیحات وتعریفات بیان کی گئی ہیں وہ اپنے میں منفرد اور بعض مفکروں کے نقطۂ نظر سے نامکمل ہیں۔ ڈاکٹر آفاق ندیم خان نے فلسفیوں، ماہر عمرانیات، ماہر سیاسیات اور ماہرین نفسیات کے ذریعہ منکشف تعلیم سے متعلق حقائق کی بنیاد پر اپنی توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تعلیم کسی سماج میں ہمیشہ چلنے والا وہ با مقصد عمل ہے جس کے ذریعہ انسان کی خداداد صلاحیتوں کی نشو ونما اس کے علم وفن میں اضافہ اور طرز عمل میں تبدیلی کی جاتی ہے اور اسے ایک مہذب تہذیب یافتہ شہری بنایا

جاتا ہے ۔اس کے ذریعہ فرد اور سماج دونوں مسلسل ترقی کرتے
ہیں۔"[11]

اس اقتباس کے مدنظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم انسان کی روحانی، باطنی، شعوری اور چھپی ہوئی خداداد صلاحیتوں کی نشوونما، اس کے علم وفن میں اضافہ، طرزعمل میں تبدیلی اور باہر کی زندگی کے بیچ ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

تعلیم کی قسمیں

عام طور پر تعلیم دینے کی حیثیت کے اعتبار سے تعلیم کو مندرجہ ذیل تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1. رسمی تعلیم

دانستہ اور منصوبہ بند طریقے سے دی جانے والی تعلیم رسمی تعلیم کہلاتی ہے۔مثال کے طور پر مکتب، مدرسہ اور جامعات وغیرہ۔

2. بے رسمی تعلیم

انسان کے اندر غیر دانستہ طور پر اثر انداز ہونے والی تعلیم بے رسمی تعلیم کہلاتی ہے۔جیسے کتب خانہ، ذرائع ابلاغ اور فلمیں وغیرہ۔

3. غیر رسمی تعلیم

یہ تعلیم رسمی اور بے رسمی تعلیم کے بیچ کی کڑی ہوتی ہے۔اس تعلیم کا سارا دارومدار سیکھنے والوں پر ہی منحصر ہوتا ہے مثلاً مطالعہ کیسے کرنا ہے اور کس طرح سے کرنا ہے۔اس ضمن میں خط وکتابت کے ذریعہ تعلیم، فاصلاتی تعلیم وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

تعلیم کے مقاصد

تعلیم کے مطالب، مفاہیم، تعریفات اور اقسام کے بعد تعلیم کے مقاصد پر مختصراً بات کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔تعلیم کے مقاصد میں یہ واضح کرنا ضروری ہوتا ہے کہ سماج اور حالات کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔کچھ ایسے بھی مقاصد ہیں جو تمام سماجوں کے لیے تعین کرنا ہر حال میں ان کے

لیے سازگار نہیں ہوتا لیکن کچھ ایسے مقاصد بھی ہیں جو تمام سماجوں کے لیے یکساں اور اہم ہوتے ہیں، ان پر وقت اور حالات کی تبدیلی کا اثر خاص نہیں پڑتا۔ ایسے کچھ اہم مقاصد ہیں جیسے جسمانی نشوونما کا مقصد، ذہنی نشوونما کا مقصد، سماجی نشوونما کا مقصد، ثقافتی نشوونما کا مقصد، اخلاقی نشوونما کا مقصد، کردار سازی کا مقصد، پیشہ ورانہ نشونما کا مقصد اور روحانی نشوونما کا مقصد وغیرہ۔

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

> ''تعلیم حقیقتاً نور ہے۔ عزت و وقار اور عظمت و شہرت کا ذریعہ ہے۔ بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ صرف تعلیم کے باعث ہے۔ قرآن پاک کی پہلی آیت تعلیم کے متعلق ہے۔ اسلام کی عظمت و سربلندی کا ذریعہ بھی تعلیم ہے۔ اسلام اور جہالت دو متضاد چیزیں ہیں جو کبھی ایک ساتھ نہیں ہوسکتیں۔'' 12

اردو میں تعلیم کا لفظ دو خاص معنوں میں مستعمل ہے، ایک اصطلاحی، دوسرے غیر اصطلاحی۔ غیر اصطلاحی مفہوم میں یہ لفظ واحد اور جمع دونوں صورتوں میں استعمال ہوسکتا ہے، مثلاً آنحضرت ﷺ کی تعلیم یا تعلیمات، حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم یا تعلیمات، شری کرشن کی تعلیم یا تعلیمات، اور اس صورت میں تعلیم کا لفظ آدرش، پیغام، درس حیات، ارشادات، ہدایات اور نصائح کے معنی دیتا ہے۔

لیکن اصطلاحی معنی میں تعلیم جو کہ عربی زبان کا لفظ ہے انگریزی میں اس کا متبادل لفظ ایجوکیشن ہے، اس سے وہ شعبہ مراد لیا جاتا ہے جس میں خاص عمر کے بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما، تخیلی و تخلیقی قوتوں کی تربیت و تہذیب، سماجی عوامل و محرکات، نظم و نسق، طریقہ تدریس، نصاب، معیار تعلیم، تاریخ تعلیم اور اس طرح کے دوسرے موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔

ماہرین تعلیم نے تعلیم کے مفہوم کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا ہے ہم مختصراً چند کا تذکرہ کریں گے پھر اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کریں گے تاکہ یہ اندازہ لگانا آسان ہو جائے کہ اسلام میں تعلیم کو کیا مقام و مرتبہ حاصل ہے اور کتاب و سنت نے اس کو کیا حیثیت دی ہے۔

کسی نے تعلیم کو انسانی ذہن کی نشو ونما قرار دیا ہے، کسی نے اسے معاشرتی مطابقت کا نام دیا ہے، سقراط نے اسے سچائی کی تلاش، ارسطو نے جسمانی واخلاقی نشو ونما کا عمل اور افلاطون نے صحت مند معاشرے کی تنظیم کا عمل قرار دیا ہے، جان ڈیوی اسے تجربے کی مسلسل تعمیر نو اور تنظیم نو کا نام دیتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ تعلیم انسانی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کی مسلسل نشو ونما اور بالیدگی کا عمل ہے جو انسان کی شخصیت کے نکھارنے اور اعلیٰ کمال کے حصول کا باعث بنتا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان دیگر مخلوقات کی نسبت اپنی عملی زندگی میں قدم قدم پر تعلیم و تربیت کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معلم اول حضرت آدمؑ کو خود تعلیم سے بہرور فرمایا اور بنی نوع انسان کی ہدایت، رہنمائی اور تعلیم و تربیت کے لیے انبیاء علیہ السلام کی صورت میں معلمین مبعوث فرمایا جن کی آخری کڑی خاتم المرسلین جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، آپؐ نے فرمایا: ''اِنما بعثت معلماً'' (بیشک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے)۔

اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کا مقصد، معاشرے کی نو خیز نسلوں کی تکمیل ذات، آداب معاشرت، اخلاق حسنہ اور صحیح تصور کائنات کی تربیت دینا ہے تا کہ انسان اپنے خالق و مالک اور رزاق کو پہچان سکے۔ تعلیم ہی انسان کو خدا شناس، خود شناس اور کائنات شناس بناتی ہے تا کہ انسان خلیفۃ اللہ کا کردار ادا کر سکے۔

شاہ ولی اللہؒ نے تعلیم کو خیر وشر میں تمیز کر کے خیر کو اپنانے اور شر کو دبانے کا عمل قرار دیا ہے، علامہ اقبالؔ نے تعلیم کو تعمیر خودی اور تکمیل خودی قرار دیا ہے۔ جو انسانی شخصیت کی تشکیل کا دوسرا نام ہے۔

جب قرآن قریم کا نزول شروع ہوا جو سراپا کتاب ہدایت ہے تو اس ہدایت نامہ کی پہلی آیت ''اقرأ'' قرار پاتی ہے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں تعلیم کو کتنی اہمیت حاصل ہے، اور اس آیت کا معنی ہی ہے کہ پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہ تھا (سورۃ العلق)۔

اس حسن آغاز کے بعد قرآن کریم نے حصول تعلیم پر مہمیز دینا بند نہیں کیا بلکہ وقفہ وقفہ سے مختلف آیتوں میں مختلف وانوکھے پیرائے بیان میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھا کہ علم و تعلیم انسانوں کے لیے بہت ہی ضروری ولازم چیز ہے، چنانچہ قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں سے اہم کا ترجمہ پیش ہے:

''سورۃ الزمر کی آیت نمبر9 میں ہے: اے پیغمبر کہہ دیجیے کہ کیا صاحب
علم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟۔
سورۃ النحل آیت نمبر 43 کا ترجمہ ہے: اگر تم کو علم نہ ہو تو اہل علم سے
پوچھ لیا کرو۔
سورۃ فاطر آیت نمبر 28 کا ترجمہ ملاحظہ ہو: اللہ سے علم رکھنے والے ہی
ڈرتے ہیں۔
سورۃ العنکبوت آیت نمبر 43 کا ترجمہ ہے: ان باتوں کو علم والے ہی
سمجھتے ہیں۔''

مندرجہ بالا آیتوں کے ترجمہ کے مطالعہ سے اسلام میں علم کی اہمیت کا تصور واضح انداز میں آشکارا ہوتا ہے، لیکن بڑے افسوس کے ساتھ سر جھکا کر یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ آج اسلام کے ماننے والے ہی تعلیم کے میدان میں سب سے پیچھے نظر آتے ہیں:

ے حیرت ہے کہ تعلیم و ترقی میں ہے پیچھے
جس قوم کا آغاز ہی اقرأ سے ہوا تھا

قرآن پاک کے شارح علیہ السلام نے اپنے اقوال وارشاد سے تعلیم کی اہمیت کو اس طرح اجاگر فرمایا کہ آپؐ کے مخاطب یعنی صحابہ کرام علم و تعلم کے عشق میں سرشار ہو گئے، پھر انھوں نے اس کے لیے نہ موسم کی سختیاں دیکھیں نہ ملکوں کے فاصلے اور مسافتیں، اور آج بھی ان ارشادات کو جو شخص حرز جاں بنا لے وہ بھی حصول تعلیم میں دیوانہ ہو جائے (تعجب ہے ایک امّی شخص اور تعلیم پر اس قدر زور اور اس ماحول میں جب کہ پڑھے لکھے لوگ انگلیوں پر گنے جاتے تھے یہ خود اپنی جگہ ایک مسلم ثبوت ہے کہ اسلام نے تعلیم کو بہت ہی زیادہ اہمیت دیا ہے) آپؐ ارشاد فرماتے ہیں:

''جو طلب علم کے راستے پر چلے گا اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان
کر دے گا (مسلم شریف حدیث نمبر 6853)
جو طلب علم میں نکلے گا وہ جب تک واپس نہ آجائے، اللہ کے راستہ، میں

شمار ہوگا (ترمذی شریف حدیث نمبر 2647)

طلب علم پچھلے گناہوں کا کفارہ ہے(ترمذی شریف حدیث نمبر 2648)

دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں اللہ کی رحمت سے دور ہیں، سوائے اللہ کے ذکر، اس کے متعلقات اور عالم و طالب علم کے (ترمذی شریف حدیث نمبر 2322)

عالم کو عابد پر وہی فضیلت حاصل ہے جو مجھے ادنیٰ امتی پر (ترمذی شریف حدیث نمبر 2685)۔''

اس طرح مقاصد حیات اور لوازمات حیات دونوں سے اسلام نے علم کا تعلق قائم کر دیا، تا کہ انسان اپنی ان خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اور پروان چڑھا کر خلیفۃ اللہ فی الارض کی اہم ذمہ داریوں کو نبھا سکے جن صلاحیتوں سے ملائکہ بھی محروم ہیں، پھر اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو جائے۔

اسلام میں تعلیم کی اہمیت کا ندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبرؐ کو علم کی زیادتی کی دعا کی تعلیم دی ہے فرمایا: ''وقل رب زدنی علماً'' کہ آپ دعا کیجیے کہ اے میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ فرمایئے، امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی چیز علم سے افضل ور برتر ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیتے کہ وہ اس میں اضافہ کی دعا کریں۔

اور یہ سچ ہے کہ تعلیم انسان کو شعور فراہم کرتی ہے اور زمین کی پستیوں سے نکال کر آسمان کی بلندیوں پر لے جاتی ہے، اور افراد و اقوام کی زندگی میں اس کو وہ بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ افراد کی ساری زندگی کی عمارت اسی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے اور اقوام اپنی تعلیمی فلسفہ کے ذریعہ ہی اپنے نصب العین، مقاصد حیات، تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت کا اظہار کرتی ہے۔ اگر تعلیم نہ ہوتی تو انسان جانوروں جیسا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حسن بصریؒ کا قول ہے:

''اگر علماء نہ ہوتے تو لوگ چوپایوں کے مثل ہوتے۔'' مطلب یہ کہ علماء

لوگوں کو علم سکھا کر حیوانیت سے نکال کر انسانیت میں داخل کرتے ہیں۔'' 13؎

امام غزالیؒ بے علم انسان کو انسان قرار دینے کے لیے تیار ہی نہیں، فرماتے ہیں:

''حضرت سیدنا عبداللہ بن مبارکؒ نے غیر عالم کو انسانوں میں شمار نہ کیا کیوں کہ علم ہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان تمام جانوروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ پس انسان اس وصف کے ذریعے انسان ہے جس کے باعث اسے عزت حاصل ہوتی ہے۔ وہ جسمانی قوت کی وجہ سے انسان نہیں ورنہ اونٹ اس سے زیادہ طاقتور ہے۔ نہ جسامت کی وجہ سے انسان ہے ورنہ ہاتھی کا جسم اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ نہ بہادری کے سبب ورنہ درندے اس سے بڑھ کر بہادر ہیں۔ نہ اس لیے کہ وہ زیادہ کھاتا ہے کیوں کہ بیل کا پیٹ اس سے زیادہ بڑا ہوتا ہے اور نہ اس وجہ سے کہ وہ جماع کرتا ہے کیوں کہ اس معاملے میں چھوٹی سی چڑیا اس سے بڑھ کر طاقتور ہے بلکہ انسان علم ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔'' 14؎

؎ علم ہی سے انسان انسان ہے
علم جو نہ سیکھے وہ حیوان ہے

آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیمی پس ماندگی کا مسئلہ ایک اہم موضوع رہا جو محبان تعلیم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور انھیں عملی اقدامات اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بھی انھیں محبان تعلیم میں سے ہیں جو مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے تدارک میں ہمہ تن مشغول عمل رہے ہیں تعلیم جیسے اہم موضوع پر ان کی سات کتابیں منظر عام پر آئیں۔ وہ اس طرح ہیں:

1. تعلیمی تجزیے
2. تعلیمی جہات
3. مولانا قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات

4. تعلیم اور تعلیمی افکار
5. تعلیمی نکات
6. تعلیمی اشارات
7. راجارام موہن رائے اوران کے تحریکی و تعلیمی کارنامے

نسیم اعظمی سے ایک ادبی ملاقات (انٹر یو) میں جب ظہیر حسن ظہیر نے پوچھا کہ وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے تعلیم جیسے اہم موضوع پر کام کرنے کی آپ میں تحریک پیدا کی؟ تو نسیم اعظمی نے یوں جواب دیا:

> ’’میں اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد ہوں۔لیکن میرے والدین کی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر کسی کام کا آدمی بن جاؤں۔لیکن میری تعلیم کے حصول کے زمانے میں وہ ضعیف ہو چکے تھے اس لیے ہائی اسکول کے بعد میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔جب کہ میں اپنے تمام ہم جماعتوں میں ہمیشہ نمایاں رہا۔اس کے بعد میں نے جو کچھ بھی تعلیم حاصل کی محض اپنے ذاتی شوق اور دلچسپی کی بدولت حاصل کی۔باقاعدہ تعلیم کے حصول کا موقع نہ ملنے اور تعلیمی عدم رہنمائی کا احساس مجھے ہمیشہ کچوکے لگا تا رہا اس لیے جب ہوش آیا اور سماجی شعور قدر بیدار ہوا تو مجھے طریقۂ تعلیم ،نظام تعلیم کے بارے میں جاننے کی خواہش پیدا ہوئی اور میرے اندر خود بخود یہ احساس پیدا ہوا کہ میں تو اعلیٰ تعلیم جیسی چاہتا تھا ویسی حاصل نہ کر سکا اور نہ ہی کسی نے میری تعلیمی رہنمائی کی لیکن میں اپنے جیسے تمام طالب علموں کی رہنمائی کی کوشش کروں گا۔چنانچہ میں نے تعلیم کے موضوع پر عملی اور نظری طور پر خود کو مطالعہ میں لگا دیا ہے۔‘‘[15]

ظہیر حسن ظہیر کو دیے گئے انٹر یو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نسیم اعظمی اپنے ذاتی شوق اور دلچسپی کی بنا پر تعلیم کے موضوع کی طرف متوجہ ہوئے۔ان کے اندر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ موجزن تھا

۔پر یہ جذبہ ان کے گھریلو معاشی حالات کی بنا پر وقتی سرد پڑا لیکن انھوں نے اپنے آپ کو تعلیم سے منقطع نہیں کیا بلکہ اس سے دلچسپی ہمیشہ برقرار رہی۔ان کے نزدیک قوم وملت کی فلاح و بہبود کے لیے تعلیم ہی سب سے بہترین ذریعہ تھا۔تعلیم کے ذریعہ قوم وملت کی پس ماندگی کا ازالہ کرنے کے لیے وہ ہمیشہ سے کوشاں رہے ہیں۔

نسیم اعظمی کے تعلیمی صورتوں سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی صورتحال کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔ ہندوستان کی تاریخ ہر اعتبار سے شاندار اور گونا گوں ہے۔ یہاں کا تعلیمی نظام مذہبی اور عصری دونوں لحاظ سے دیگر مما لک سے ممتاز رہا ہے۔ یہاں کے تعلیمی ادارے قبل مسیح سے ہی مشہور ومعروف رہے ہیں۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے تعلیمی پس منظر کو نسیم اعظمی کے تعلیمی تصورات کے تناظر میں ہی پیش کرنے کی سعی کی جا رہی ہے تا کہ واضح طور پر سپرد قرطاس ہو سکے۔وہ تعلیم کے تئیں لکھتے ہیں:

> ’’عام اصطلاح میں علم کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں ایک روحانی یا اخلاقی اور دوسری جدید یا عصری۔روحانی یا اخلاقی تعلیم سے مراد وہ دینی یا مذہبی تعلیم ہوتی ہے جو عموماً ہمارے دینی مدارس میں دی جاتی ہے اور جس کا اصل سرچشمہ الہامی تعلیم ہوتی ہے جس میں قرآن وسنت، تفاسیر وفقہ اور وہ تمام شرعی موضوعات شامل ہوتے ہیں جو ہماری مذہبی زندگی میں کام آتے ہیں لہذا ہمارے دینی مدارس میں اسی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا ہے۔جب کہ عصری یا جدید تعلیم سے مراد ایسی مروجہ سیکولر تعلیم ہوتی ہے جو عصری تعلیم گاہوں جیسے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں رائج ہوتی ہیں جس میں آرٹس، کامرس، سائنس، ٹکنالوجی اور دیگر اسٹریم اور ان کے مضامین وموضوعات کی تعلیم شامل ہوتی ہے۔‘‘ 16

جب ہندوستان پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی اس وقت بہت سارے مثبت پہلو عوام کے سامنے کھل کر آئے۔محمد غوری نے 1192ء میں جب دہلی میں حکومت قائم کی تو اس وقت یہاں مسلمانوں کے قائم

کیے گئےتعلیمی ادارے دوقسم کے تھے۔ایک ’’مکتب‘‘ جو ابتدائی تعلیم کے لیے دوسرے ’’مدرسے‘‘ اعلیٰ تعلیم کے لیے۔’’اردو انسائکلو پیڈیا‘‘ میں اس بات کی وضاحت یوں قلم بند ہے:

’’اس دور میں مسلمانوں کے قائم کیے ہوئے ادارے دو قسم کے تھے۔مکتب جو ابتدائی تعلیم کے لیے،مدرسے اعلیٰ تعلیم کے لیے۔ان اداروں میں جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا نصاب ہر جگہ یکساں نہیں تھا۔لیکن ہر مسلمان بچے کے لیے ضروری تھا کہ وہ کم از کم مکتب میں شریک ہوکر اور قرآن کی اتنی آیتیں ضرور یاد کرلے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ سکے۔مدرسوں کے نصاب میں حدیث،فقہ،ادب،منطق،فن عروضی وغیرہ شامل تھے۔بعض جگہ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں تاریخ،معاشیات،حساب،علم ہیئت اور طب و زراعت جیسے علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔‘‘ 17

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکمرانی کے وقت صرف مذہبی تعلیم کا ہی رواج نہیں تھا بلکہ اس وقت کے تعلیمی ادارے عصری تعلیم کے تقاضوں سے بھرپور ہوا کرتے تھے۔مذہبی تعلیم جیسے قرآن،حدیث،فقہ،ادب اور منطق کے ساتھ طب علم ہیت،تاریخ،معاشیات اور حساب جیسے عصری علوم سے بھی مزین تھے۔

مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانہ سے ہندوستان میں تعلیم کا باقاعدہ نظام شروع ہوتا ہے۔اکبر کی سلطنت میں پہلی مرتبہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے جہاں بلا تفریق مذہب و ملت ہندوؤں،مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے پیروکار ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔اس وقت ذریعۂ تعلیم فارسی تھا اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہوا کرتا تھا۔موجودہ دور کی طرح تعلیم کو تعصب کی نذر نہیں کیا جاتا تھا،ہندوستان کے عظیم کلاسیکی ادب کو فارسی میں منتقل کرنا اس بات کی تصدیق ہے۔جس کے نتیجہ میں یہاں مشترکہ کلچر کو بے انتہا فروغ ملا۔مشترکہ کلچر کے فروغ کا ایک اعلیٰ نمونہ اردو زبان ہے۔

شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں جو تعلیمی نظام قائم ہوا تھا وہ جہانگیر و شاہجہاں کے عہد تک قائم رہا۔

لیکن اورنگ زیب نے اپنے دورِ حکومت میں اس نظامِ تعلیم میں کافی تبدیلیاں لائیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے اسلامی مدارس میں درس نظامیہ کا سلسلہ جو بہت دنوں سے چلا آ رہا تھا اس کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر اعتراضات کا سلسلہ اکبر کے دور حکومت سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے بھی اسلامی مدارس کے اس نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر شدید اعتراضات کیے اور اپنے استاد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''......مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر حکومتوں کے آغاز اور ان کی ترقی وتنزلی کے اسباب بتاتے......خیر دنیا کی تاریخ سے پوری اور گہری واقفیت تو در کنار آپ نے مجھے میرے آباء واجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے......آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے یہ صحیح ہے کہ آپ نے کئی برس تک میرے دماغ کو ان فضول اور احمقانہ مسائل سے پریشان کیا جن کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا......اس طرح آپ نے میری جوانی کا قیمتی زمانہ لفظوں کے سیکھنے کی خشک بے فائدہ اور لامتناہی کوشش میں ضائع کر دیا۔'' 18؎

مندرجہ بالا اقتباس سے آج کے دور کے اسلامی مدارس (درس نظامیہ) کو دیکھتے ہوئے شہنشاہ اورنگ زیب کی باتوں سے متفق ہونا پڑتا ہے کیوں کہ اس وقت بھی مدارس اتنا ہی از کار رفتہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ اس کے نصاب میں البتہ بعض فروعی تبدیلیاں انیسویں صدی میں ضرور ہوئیں لیکن کچھ خاص نہیں ہوئیں۔ نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم جیسی تبدیلیاں لانے کی بیسویں صدی میں بھی کوشش ہوئی لیکن یہ کوششیں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ اکیسویں صدی میں بھی اس نظام تعلیم میں خاطرخواہ تبدیلی نہیں ہوئی، ایک طرف حکومت کے تعصب دوسری طرف خود مسلمانوں کی آرام طلبی نے اسے اپنی پرانے روش پر ہی چھوڑ رکھا ہے جس سے اہل بصیرت خوب واقف ہیں۔

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال (1707ء) کے بعد

مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت کو مسلمانوں سے عیاری و مکاری اور غاصبانہ طور پر حاصل کیا تھا۔اس لیے وہ مسلمانوں کو ہی اپنا اصل دشمن تصور کرتے تھے۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے ساتھ اگر چہ دال میں نمک کے برابر ہندوؤں نے بھی انگریزی حکومت کے خاتمے کی کوششیں کی تھیں مگر اس جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جس انداز میں انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف انتقامی کاروائی کی شاید ہی تاریخ کے کسی ادوار میں کم ظرف سے کم ظرف دشمن نے بھی اپنے مفتوح کے ساتھ کیے ہوں۔ انگریز مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ نرم پہلو اختیار کر کے اپنی پرانی کلیسائی پالیسی لڑاؤ اور حکومت کرو پر عمل پیرا تھے۔

1835ء میں لارڈ میکالے نے ہندوستان میں جدید مغربی علوم وسائنس کا باقاعدہ آغاز متعصّبانہ تعلیمی پالیسیوں کے تحت شروع کیا تھا۔اپنی اس متعصّبانہ تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے بارے میں وہ کہا کرتا تھا:

''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوں اور روح وفکر کے لحاظ سے عیسائی۔'' 19

لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے لارڈ میکالے کے اس تعلیمی پالیسی کو اپنے دین و مذہب کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے 1835ء میں آٹھ ہزار علماء کے دستخط کے ساتھ عرضداشت پیش کرتے ہوئے سخت مخالفت کی تھی۔

1857ء کی عوامی بغاوت کا اثر سیدھا مسلمانوں پر پڑا۔اس بغاوت کے نتیجہ میں انگریزوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے بہیمانہ انتقام لینا شروع کر دیا۔ ہر طرف قتل وغارت عام کر دی تھی۔علماء اور اہل علم و دانش کے خاتمہ پر ان کی نگاہیں زیادہ مرکوز تھیں۔مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کو صرف زمین بوس ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ اس کی تاریخ کو بھی مسخ کرنے میں ہر ممکنہ کوشش کرتے تھے۔مسلمانوں کی سماجی و معاشی پستی اور سیاسی تنزلی جیسے ناگفتہ بہ حالات کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں سے دو اہم شخصیات سامنے آئیں،ایک مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دوسری سر سید احمد خاںؒ کی۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلق سے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی تاریخ شاہد ہے کہ اس

جنگ میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف بہ نفس نفیس شرکت کی اور ''شاملی'' کے محاذ پر انگریزوں کو شکست دی۔

انگریزوں کی فتح اور عوامی بغاوت کی ناکامیوں کے بعد یہاں کے بدلے ہوئے نئے ماحول اور فاتح قوم کے بے جا ظلم وستم، تمدنی یلغار اور عیسائی مشنریوں کے حملوں سے اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن کو بچانے کی فکر مولانا کو لاحق ہوئی اور انھوں نے اسلام اور اسلامی تعلیم کے احیاء وبقا کے لیے دار العلوم دیوبند کا قیام عمل میں لایا۔ جس کے نتیجہ میں غیر منقسم ہندوستان میں قیام مدارس کی تحریک کے فروغ کو جلا ملی اور لارڈ میکالے کے جدید تعلیمی پالیسی کے نفاذ پر قدغن لگاتے ہوئے مولانا نے زبان حال سے بآواز بلند کہا تھا کہ ہماری تعلیم کا مقصد:

> ''ایسی نسل تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندی، سندھی، افغانی، ایرانی، خراسانی و ترکستانی ہوں لیکن روح وفکر کے لحاظ سے عربیت واسلامیت کی روح سے معمور اور بھرپور ہوں۔'' 20؎

مولانا مسلمانوں کے تئیں بڑے دوراندیش تھے۔ وہ اسلامی تعلیم کو رائج کرنے اور اسلامی طرز زندگی گزارنے کے خواہاں تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر ہندوستان میں مسلم نوجوانوں کی ایک ایسی تعلیم یافتہ نسل تیار ہوجائے جو ٹھوس اسلامی فکر سے مزین ہو اور دین اس کے مزاج میں پیوست ہو تو یقیناً انگریزوں اور اسلام کے دشمنوں سے بحسن خوبی نپٹا جاسکتا ہے اور ان کی مکارانہ چال پر قدغن لگایا جاسکتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے دار العلوم دیوبند کے قیام کے بعد اپنے دینی نصاب میں بعض عقلی علوم کو بھی شمولیت دی جس کا لب لباب خاص اسلام کا احیاء ہی تھا۔ 9/جنوری 1874ء کو دار العلوم دیوبند کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر مولانا قاسم نانوتویؒ نے جو تقریریں کیں اس سے صاف وضاحت ہوجاتی ہے کہ دینی مدارس کا نصاب کیسا ہونا چاہیے:

> ''دار العوم کے نصاب میں دینی علوم کے ساتھ جو علوم عقلی ونقلی رکھے گئے ہیں تو اس کا مقصد ایک طرف تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے وہ علوم جو حکومت کی بے توجہی سے زوال پذیر ہیں وہ محفوظ ہوجائیں اور دوسری طرف ان کے پڑھنے سے طلباء میں علوم جدیدہ حاصل کرنے کی

استعداد وصلاحیت پیدا ہو جائے......دارالعلوم دیو بند کے نصاب سے
فارغ ہونے کے بعد اگر طلبہ سرکاری مدارس میں جا کر علوم جدیدہ
حاصل کریں تو ان کے کمال میں اس سے بہت اضافہ ہوگا۔'' 21ے

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا قاسم نانوتویؒ صرف مذہبی تعلیم رائج کرنے کے خواہاں نہیں تھے بلکہ وقت اور حالات کے مدنظر جدید علوم سے بھی مسلمانوں کو مزین کرنا چاہتے تھے تا کہ دین اور دنیا دونوں جگہ مسلمان کامیاب ہوسکیں اور اپنے آپ کو مشکل حالات سے بھی نبرد آزما کرسکیں۔

محسن اعظم سرسید احمد خاں 1857ء کی عوامی بغاوت کے وقت بجنور میں تعینات تھے۔ وہاں انھوں نے بہت سارے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی جان بچائی تھی لیکن انگریزوں نے دہلی میں خود ان کا گھر لوٹ لیا تھا۔عوامی بغاوت کے اس نفسہ نفسی کے عالم میں انھوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سب سے پہلے بجنور سے میرٹھ اور پھر میرٹھ سے دہلی پہنچے۔

بالا کوٹ کی جنگ میں مسلمانوں کی ناکامی نے سرسید کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ان کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب وقت مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ رہا ہے، ایسے حالات میں ان کو مسلمانوں کا کوئی مسیحا نظر نہیں آ رہا تھا جو مسلمانوں کو صحیح سمت پر ڈال سکے۔ 1957ء کی ہنگامہ خیزی جب ماند پڑنی شروع ہوگئی اور حالات معمول پر آ گئے تو ان کا تبادلہ بحیثیت صدر الصدور مراد آباد میں ہو گیا۔مراد آباد کی زبوں حالی اور بربادی دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھا، اور اپنے اس ارادہ کو پس پشت ڈال دیا جو ہندوستان سے باہر چلے جانے کو تھا۔انھوں نے ہندوستان میں ہی رہ کر قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔انھوں نے قوم کو ناگفتہ بہ حالات میں چھوڑ کر بیرون ملک جانے میں انسانیت اور اخلاق کے منافی سمجھا اور فوری طور پر دو اہم ترین تدبیریں اختیار کیں۔نسیم اعظمی ان دو اہم ترین تدابیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سرسید احمد خاں نے ہجرت کا ارادہ ترک کرنے کے ساتھ ہی
ہندوستان میں رہ کر اپنی تباہ شدہ اور مفلوک الحال قوم کی اصلاح اور ترقی
سے ہمکنار کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لیے فوری طور پر دو اہم ترین تد
بیریں اختیار کیں

1. ایسے رسالے لکھنا جس سے انگریزوں کی غلط فہمیاں دور ہوں جو ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوگئی ہیں تا کہ آپسی مفاہمت کی صورت پیدا ہو سکے اور مسلمانوں کو ان کی موجودہ حالت سے نکالنے میں معانت مل سکے۔ چنانچہ اپنے اسی مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند''، ''سرکشی ضلع بجنور'' اور ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' جیسے رسالوں کی تصنیف واشاعت کی۔

2. مسلمانوں کی موجودہ تباہی اور زبوں حالی سے نجات دلانے کے لیے عصری اور جدید انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے تعلیمی اداروں اور تنظیموں کا قیام کیا اور مختلف علوم وفنون کے فروغ کے لیے انھوں نے زوردار مہم چلائی جو بعد میں علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم ہوئی اور مدرستہ العلوم یا ایم اے او کالج کا قیام کر کے اور اس کو مثال بنا کر پورے برصغیر میں عصری اور مغربی تعلیم کے فروغ کی کوششیں کیں۔'' 22ؔ

ہندوستان میں لارڈ میکالے کے زمانے میں جب جدید مغربی علوم وسائنس کا آغاز ہوا جس کا مقصد صرف اور صرف انگریزوں اور ان کی کلیسائی پالیسیوں کے نفاذ کے تئیں تھا، اور مسلم رہنماؤں نے اسے اپنے دین ومذہب کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے اس کے خلاف حکومت کو عرضداشت بھی پیش کی تھی جب کہ اس وقت سرسید احمد خاں اسی جدید مغربی علوم وسائنس کو مسلمانوں کی اس وقت کی ناگفتہ بہ حالات سے نجات کا ذریعہ تصور کرتے تھے اور اس مغربی علوم وسائنس کے حصول اور فروغ کے لیے ہی زبردشت تحریک کی شروعات کی۔ شروع شروع میں ان کی تعلیمی واصلاحی تحریکیں وکوششیں صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ ہندوستان کی تمام قوموں کے لیے بھی تھیں۔ وہ صرف یہاں کی قوموں کی فلاح و بہبود نہیں چاہتے تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی ترقی بھی چاہتے تھے، ان کے نزدیک ملک کی ترقی تبھی ممکن ہوسکتی تھی جب یہاں ہندو اور مسلم متحد ہو کر رہیں۔ لیکن انگریز تن کے اجلے تو ہوتے ہیں مگر من کے اتنے کالے کہ اس کا بیان کرنا ممکن نہیں بلکہ ناممکن ہے، اسی اپنے کالے من سے ایک ایسا حربہ استعمال کرنا شروع کیا جس سے

ہندو اور مسلم میں نفاق پیدا ہو۔اس حربے میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔سرسید کے متحدہ قومیت کے نظریے کو اس سے زور کا دھچکا لگا۔اس کے بعد سے انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔اس ضمن میں پروفیسر شارب رودولوی لکھتے ہیں:

''جب سرسید کا متحدہ قومیت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا تو انھوں نے اپنی تمام صلاحیتیں مسلمانوں کی جدید تعلیم کے راستے پر صرف کرنے کی کوشش کی۔ان کا یہ عمل ہر اعتبار سے درست تھا۔اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آج مسلمان ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے نظر آتے۔'' 23؎

مسلمانوں کے تئیں سرسید کا ذہن بہت کشادہ تھا،انھوں نے جس جدید انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس کے حصول کا تصور پیش کیا تھا وہ نہایت ہی وسیع اور ہمہ گیر تھا اور ساتھ ہی اس جدید تعلیم کے حصول میں جس کے لیے سرگرم عمل تھے اس میں کسی طرح کا مذہب وملت اور تہذیب ومعاشرت پر خطرہ بھی منڈراتا نظر نہیں آتا تھا بلکہ ایسی تعلیم کو مسلمانوں کے تحفظ وبقا کے ساتھ انھیں دلایا جاسکتا تھا۔

مولانا قاسم نانوتویؒ اور سرسید احمد خاں جیسے مسلم رہنماؤں کے ساتھ مسلمانوں میں تعلیم کے تئیں بیداری لانے اور ان کی زبوں حالی کو دور کرنے میں بدرالدین طیب جی کا بھی شمار ہوتا ہے۔بدرالدین طیب جی نے ان رکاوٹوں کی طرف خاص دھیان دیا جس کی طرف نہ تو سرسید اور نہ ہی مولانا قاسم نانوتویؒ نے دیا تھا۔وہ ہندوستانیوں کو سرکاری ملازمتوں میں پیش آنے والی مشکلات کو دور کرنے کے لیے کوششیں کیں۔''ہنٹر تعلیمی کمیشن'' کا قیام جب 1882ء میں ڈاکٹر سرولیم ڈبلیو ہنٹر کی سربراہی میں عمل میں آیا تو طیب جی نے سب سے پہلے اس کمیشن کے سامنے مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال سے روشناس کرایا۔ان کے حقائق و اعداد وشمار پیش کیے جو طیب جی کی مسلمانوں کی تعلیم کے تئیں بے پناہ محبت اور دلچسپی کا بین ثبوت ہے۔

سرسید احمد خاں اور بدرالدین طیب جی دونوں تقریباً ہم عصر تھے لیکن دونوں کی سوچ میں تھوڑا تضاد بھی تھا۔یہ تضاد مسلمانوں کی فلاح و بہبود ہی پر منحصر تھا۔سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی ساری توجہ تعلیم پر ہی مرکوز ہونی چاہیے،انھیں خاص کر سیاسی سرگرمیوں سے دور رہنا چاہیے۔جب کہ طیب جی سرسید کے اس نظریہ سے اختلاف رکھتے تھے،یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سمیت ہر قسم کی ترقی ہو اور خاص کر مسلمان

سیاست میں بھی اپنی پوری سرگرمی کا مظاہرہ کریں اور دیگر ہم وطنوں کی طرح سیاسی معاملات میں بھی اپنا تعاون پیش کرسکیں اوران کے شانہ بہ شانہ رہیں۔

1857ء کی عوامی بغاوت کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی اصلاح کے مقصد سے یہاں تین قسم کے تعلیمی رجحان رکھنے والی جماعت نظر آئی۔ایک جماعت وہ تھی جو حالات اور تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی روایتی اور قدیم تعلیم کے تحفظ وبقاء کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے سب سے اہم تصور کرتی تھی،اور زمانے کی مادّی اور جدید تعلیمی ترقی کی طرف راغب نہ تھی بلکہ وہ دھیرے دھیرے اس طرف پیش قدمی کرنا چاہتی تھی۔اس جماعت کے امیر کارواں وروح رواں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے۔مولانا اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھ کر ہندوستان میں قیام مدارس کی عظیم الشان تحریک چلائی۔آج بھی اس تحریک کے زیراثر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مدارس اپنی پرانی روایتی تعلیم کو بچائے ہوئے ہے۔

دوسری جماعت وہ تھی جو مسلمانوں کی ہرطرح کی زبوں حالی کے خاتمے کے لیے جدید تعلیم کو ہی تصور کرتی تھی۔اس جماعت کے سرخیل سرسید احمد خاں تھے۔انھوں نے علی گڑھ کالج کا قیام کر کے صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پورے برّصغیر میں عصری تعلیم کے لیے انقلاب آفریں اور تاریخ ساز تحریک چلائی،افسوس سرسید احمد خاں کے رحلت فرما جانے کے بعد بھی اس تحریک کو جلا تو ملتی رہی اور اس جماعت کے لوگ پوری محنت اور لگن کے ساتھ اس میں منہمک رہے لیکن قیام دارالعلوم دیوبند کے بعد جس طرح پورے ہندوستان میں جگہ جگہ مدارس اور مکتب کھولے گئے ویسے اگر قیام علی گڑھ کالج کے بعد بھی اس کی شاخیں کھولی جاتی تو ممکن ہے آج مسلمان دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم سے بھی بہرور ہوتا اور ہندوستان کا نقشہ اس براعظم میں کچھ اور ہوتا۔

تیسری جماعت وہ تھی جو مندرجہ بالا جماعتوں کے نظریہ سے اتفاق رکھتی تھی۔قدیم مذہبی تعلیم سے روشناس بھی تھی۔اس پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ عصری علوم وفنون کو بھی مسلمانوں کے لیے بہتر اور ضروری سمجھتی تھی۔یہ جماعت چاہتی تھی کہ ایک ایسے مرکب اور متوازن طریقۂ تعلیم رائج ہو جس سے یہاں کے مسلمان اپنے مذہب وعقیدت کے ساتھ عصری علوم وفنون سے واقف ہو کر ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما

ہونے کے قابل ہوسکیں، اس جماعت کے امیر کارواں علامہ شبلی نعمانی تھے۔ڈاکٹرمحمدالیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''عہد شبلی کے ہندوستان میں مسلمانوں کے دو بہت واضح دھڑے تھے۔ایک دیوبند دوسرے علی گڑھ تحریک۔دیوبند قدیم اور قدامت کا حامل تھا جب کہ علی گڑھ تحریک جدید تعلیم اور جدید خیالات کی علمبردار تھی۔ان دونوں تحریکوں کے زیر اثر علماء اور جدید تعلیم یافتہ اشخاص کے درمیان نظریاتی دوریاں پیدا ہوگئی تھیں۔علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم دونوں کے درمیان مفاہمت کا نظریہ تھا۔'' 24ؔ

علامہ شبلی نعمانی قدیم و جدید تعلیم کے زبردشت حامی تھے۔وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اپنے ایسے تعلیمی ادارے ہوں جس میں قدیم مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی ہو، تاکہ ہندوستان کے مسلمان بھی دیگر ممالک کے مسلمانوں کی طرح جو قدیم و جدید تعلیم حاصل کر کے اپنے ممالک میں دیگر قوموں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہیں ویسے ہی کھڑے ہوسکیں۔قدیم و جدید تعلیم کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی واضح طور پر اپنے تعلیمی تصور کا اظہار فرماتے ہوئے کہا تھا:

''میں اگر چہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لیے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے۔'' 25ؔ

سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک جو برطانوی دورحکومت میں مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالات سے نکالنے کے مقصد سے شروع کی گئی تھی اور اس تعلیمی تحریک کے زیر اثر جن لوگوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی و فلاح و بہبود کے لیے ذہنی، فکری، عملی اور قلمی جہاد چھیڑا، اور تن من دھن سے اپنی پوری زندگی تک عمل پیرا رہے ان میں مولانا الطاف حسین حالیؔ کا نام سرفہرست ہے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ تعلیمی نظریات میں دیگر لوگوں سے کافی روشن خیال تھے۔وہ مسلمانوں کی قدیم تعلیم کو وقت اور حالات کے مدنظر از کار رفتہ اور بے وقت کا الاپ تصور کرتے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان میں جو فرقہ پرستی جنم لے رہی ہے وہ انگریزوں کی جدید تعلیم کی ہی دین ہے۔اس کے باوجود وہ

جدید انگریزی تعلیم کو وقت اور حالات کے مد نظر از حد ضروری بھی سمجھتے تھے۔انھوں نے جہاں جدید انگریزی تعلیم کے منفی اثرات واضح کیے وہیں مثبت پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی،ایسا نہیں کہ صرف ایک پہلو پر ان کی نظر تھی۔مولانا انگریزی تعلیم کے زہریلے اور گرد آلود اثرات سے بخوبی واقف تھے۔ان کا ماننا تھا کہ یہی انگریزی تعلیم ہندوستانی عوام کو ان کے حقوق اور ان کی حقیقت کا شعور بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔مولانا تعلیم کے معاملہ میں جس طرح روشن خیال تھے اسی طرح دور اندیش بھی تھے۔تعلیم کے تئیں ان کے منفی اور مثبت خیالات صحیح ثابت بھی ہوئے۔ہوا یوں کہ لارڈ میکالے نے جس مغربی تعلیم سے ہندوستانیوں کو انگریزوں کا ہمنوا اور ذہن ودل کے اعتبار سے عیسائی بنانے کے مقصد سے عام کرنا چاہا تھا وہی تعلیم بعد میں انگریزی حکومت کو ختم کرنے اور آزادی کا پرچم لہرانے میں معاون ثابت ہوئی۔شعوری بیداری اور حقیقت پسندی پیدا کرنے میں تعلیم چاہے جیسی بھی ہو ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔انگریزی میں ایک کہاوت ہے''آئرن کٹس آئرن''(لوہا لوہے کو کاٹتا ہے)اور ایسا ہی ہوا۔

مسلمانوں کی تعلیمی تحریک جب سرسید احمد خاں نے شروع کی اور اس کے آغاز ومقاصد پر روشنی ڈالی تو یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی کہ ان کی تمام تر توجہ مسلم لڑکوں کی ہی تعلیم پر مرکوز ہے۔ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کا سوال اٹھانا اس لیے مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ کہیں مزید قوم کی مخالفت مول نہ لینا پڑ جائے،جب کہ حالؔی سرسید سے اس معاملہ میں کئی قدم آگے نکلے۔انھوں لڑکیوں کی تعلیم کے معاملہ میں نہ کسی مصلحت اندیشی دیکھی اور نہ کسی قسم کا انتظار کیا۔اس ضمن میں نسیؔم اعظمی لکھتے ہیں:

> ''اس طرح دیکھا جائے تو مولانا موصوف ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے سچے بہی خواہ تھے اور مسلمانوں میں تعلیمی بیداری اور تعلیمی فروغ کے لیے عورتوں کی تعلیم کو بھی لازمی سمجھتے تھے اور ہندوستان میں تعلیم نسواں کے اسی طرح باقاعدہ پیش رو تھے جس طرح اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد تھے۔'' 26؎

مسلمانوں کو خستہ حالات سے نکالنے اور ان کی زبوں حالی کے خاتمے کے لیے موثر اور اہم جدید تعلیم کو تجویز کرنے والوں میں ایک اہم نام مولوی نذیر احمد کا بھی آتا ہے۔ان کی نظر میں جدید انگریزی تعلیم

مسلمانوں کے عزت ووقار کا باعث، سماجی عظمت وعفت کا ذریعہ اور آنے والی نسل وقوم کی ترقی کا زینہ ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ انگریزی تعلیم صرف سرکاری نوکری کے حصول کے مقصد سے نہ حاصل کی جائے اور نہ ہی ایسی تعلیم کے توسط سے انگریزی سرکار کا محتاج بن کر رہنا چاہیے بلکہ مسلمانوں کو اپنا خود انتظام کرنا چاہیے۔ وقت اور حالات کے پیش نظر انگریزوں نے اپنے آپ کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگی کرتے ہوئے عصری علوم و سائنس کے حصول میں سرگرم ہو جائیں۔ وہ خاص کر سائنس کی تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنا چاہتے تھے اور مسلمانوں میں رائج قدیم طرز کی تعلیم کو جہل سے بدتر تصور کرتے تھے۔

مولوی نذیر احمد مزاجاً اور طبعاً مذہبی تھے۔ گھریلو اور سماجی ماحول کے ساتھ قدیم طرز کی ابتدائی تعلیم نے بھی ان کے اوپر اپنا گہرا نقش چھوڑ رکھا تھا، اس کے باوجود قدامت پرستی اور دقیانوسیت ان میں بالکل نہ تھی، وہ اپنی قوم کو ایک تعلیم یافتہ اور باعزت قوم کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنے اسی مقصد کے تئیں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے دور رس فوائد کا حامل منصوبہ بند تعلیمی تصور پر کاربند بھی تھے۔ نسیم اعظمی نے لڑکیوں کی تعلیم کے تحت ان کے رجحان کے بارے میں یوں لکھا ہے:

> ''تم مجھے پڑھی لکھی ماں دو میں تمہیں ایک تعلیم یافتہ، مہذب اور باعزت قوم دونگا۔''
>
> انیسویں صدی کے اواخر میں مذکورہ بالا قول کو اگر کسی نے بہتر طور پر سمجھا تو وہ مولوی نذیر احمد تھے۔ یہ ایک ادبی اور تاریخی المیہ ہے کہ آج بیشتر لوگ مولوی نذیر احمد کو صرف ناول نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں اور ان کے ناولوں کو اردو ناول نگاری کا اولین نمونہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ناول نگاری ہندوستانی مسلمانوں میں جدید تعلیم اور تعلیم نسواں کے فروغ کا ایک ذریعہ تھی۔'' 27

جب مسلمانوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لیے مختلف تحریکیں وجود میں آئیں اور ان کے نتائج بھی ظاہر ہونے شروع ہو گئے، ایسے میں انگریزی حکومت مسلمانوں کے قومی جذبات اور عزائم کو دبانے کی ہر ممکنہ کوشش کرنے لگی، ان کی پرانی کلیسائی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو' کے عزم میں تیزی آنے لگی۔

اس افراتفری اور کشمکش کے ماحول میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت رونما ہوئی۔

ہندوستان میں جب انگریزوں کی حکومت عروج پر تھی اور ان کا قائم کردہ تعلیمی نظام تقریباً ہر جگہ رائج ہو چکا تھا اس وقت مسلمانوں میں تعلیم جیسی اکائی میں دین اور دنیا کو لے کر تفریق پیدا ہو چکی تھی۔ انگریزوں کی نیت مسلمانوں کے تعلق سے صاف نہ تھی۔ مولانا آزاد انگریزوں کی مکارانہ چال سے واقف تھے۔ تعلیم دو مختلف خانوں میں بٹ چکی تھی۔ اس وقت کی رائج تعلیم کی کمزوریوں اور خامیوں کو مولانا بخوبی سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے مستقبل کو لے کر بے چین تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مستقبل کا منصوبہ جو تحریک آزادی کے دوران بنایا تھا اس میں تعلیم کو بنیادی حیثیت دی تھی۔ مولانا کے اس بنیادی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے نسیم اعظمی رقم طراز ہیں:

> ''ان کے خیال میں انگریزوں کے دور میں جو تعلیمی نظام رائج تھا اس کے اندر کوئی فلسفۂ حیات نہیں تھا جس کے باعث اس نظام تعلیم کو متحرک اور فعال بنایا جا سکے۔ وہ ایک ایسے نظام تعلیم کے تشکیل و رواج کے حق میں تھے جو حرکیاتی نوعیت کا ہو، تاکہ نئی نسل انسانی کی خوابیدہ صلاحیتیں ابھر کر اپنا جوہر دکھا سکیں اور نئی نسل میں حوصلہ مندی، جرأت و بیباکی اور آزادانہ سوچ کو فروغ مل سکے۔ وہ آرٹ، سائنس اور علم و حکمت کی عظیم قوتوں سے بنی نوع انسانی کو استفادہ پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ سائنس کو ایک ایسی قوت سمجھتے تھے جس سے اس درد و غم سے پوری دنیا کو جنت بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فنون لطیفہ سے دنیا کے حسن و جمال میں اضافہ کرنے کے حق میں تھے۔ فنی، پیشہ ورانہ اور اعلیٰ تعلیم سے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود، طرز فکر اور معیار زندگی میں بہتری اور خوشحالی لانے کے خواہاں تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مذہب کو سائنس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہماری عملی زندگی میں بھی مرکزی اہمیت ملنی چاہیے۔'' 28

جدید ہندوستان کے مایہ ناز تعلیمی معماروں میں ایک روشن نام ڈاکٹر ذاکر حسین کا آتا ہے جنھوں نے تعلیم جیسی اہم اکائی کو تعمیر و ترقی کا ذریعہ تصور کرتے ہوئے اس کی افادیت، مقصدیت اور ہمہ جہت ترقی و

اشاعت کے لیے پوری زندگی بھرعملی تگ ودو میں لگے رہے۔جس کی بنا پر ملک وقوم کو بجاطور پران پر فخر ہے۔

ہندوستان کی آزادی سے قبل انگریزوں نے جوتعلیمی نظام قائم کیا تھا وہ دراصل بدنیتی پر مبنی تھا، اسے ذاکرحسین یہاں کی قوم وملت کے لیے نافع کم ومضر زیادہ سمجھتے تھے۔وہ ملک کی آزادی کے بعد کے حالات وماحول اور یہاں کے تمدنی تناظر میں ایک ایسے تعلیمی نظام کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے جو ہندوستان کے ہر طبقے کے تمدنی پس منظر پر محیط ہو، بھید بھاؤ اور تعصب سے پاک ہو، ساتھ ہی ایک جیسا ہونے کے ساتھ مفید اور کارآمد بھی ہو۔ وہ فرد کی تعلیم کو اہمیت دینے سے گریز کرتے تھے۔ان کے نزدیک انفرادی تعلیم بے معنی تھی، اصل اور موثر چیز سماج تھا اس لیے وہ تعلیم کو ہمیشہ سماجی عمل قرار دیتے تھے۔

ہندوستان کے تعلیمی پس منظر پر قدر روشنی ڈالنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں، بقول ایم نسیم اعظمی:

> ''افراد وملت وقوم کے بنانے سنوارنے کا سب سے اہم اور بنیادی ذریعہ تعلیم ہوتی ہے اس لیے اقوام وملل کے عروج وزوال کا تعلق براہ راست تعلیم سے جڑا ہوتا ہے۔تعلیم کے ذریعہ ہی زوال وپس ماندگی سے نجات پائی جاسکتی ہے۔اور تعلیم کے زینہ سے ہی بام عروج تک پہنچا جاسکتا ہے۔تعلیم ہی افراد، خاندان اور سماج کو استحکام عطا کرتی ہے۔ اور قوموں کی تعمیر وترقی اور تحفظ واستقامت کی ضمانت دیتی ہے۔ کامرانی وفتح مندی اور اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے تعلیم سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں ہوتا ہے۔'' 29

ملک کی آزادی کے بعد مسلمانان ہند کو بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔اگر ان کی فہرست تیار کی جائے تو بہت طویل ہوگی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان مسائل کی اہمیت سے انکار کیے بغیر یہ کہنا بالکل غلط نہ ہوگا کہ ان میں سب سے زیادہ اہم نئی نسلوں کی صحیح سمت میں تعلیم وتربیت کا مسئلہ تھا۔ چونکہ اس وقت خصوصاً حکومت کی طرف سے تعلیمی محاذ پر متعدد سمتوں سے جو یلغار ہوئی اس سے مسلمانوں کے ایمان واعتقاد، تہذیب وتمدن اور مذہبی معتقدات کے لیے جو خطرہ لاحق ہوا وہ اہل بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔

ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ یہاں ہمیشہ سے مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں اور اپنے رسم و

رواج کے حساب سے زندگی بسر کرتے ہیں۔تعلیم اور دیگر امور ملک میں بہت آگے بھی ہیں۔لیکن افسوس کہ یہاں کے مسلمان دیگر مذاہب اور ملتوں کے مقابلہ میں بہت پچھڑے ہوئے ہیں، جس کا اعتراف اب متعصب غیر مسلم حضرات بھی کرنے لگے ہیں۔لیکن آج تک مسلم اقلیت کی پس ماندگی کے اسباب اور ان کے تدارک کے بارے میں نہ تو مسلم علماء یا دانشور اور نہ ہی سیاسی رہنماؤں نے اس جانب کبھی غور وخوض کیا،اور نہ ہی یہاں کی نام ونہاد سیکولر حکومتوں نے ان کی پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اور دوررس نتائج کے حامل اقدامات کیے۔مگر اب وہ وقت آگیا ہے کہ یہاں کے مسلمان اپنی ہر طرح کی پس ماندگی کو پس پشت ڈالنے کے لیے خود غور وفکر کریں۔اپنے ماضی کے حالات سے سبق لیتے ہوئے حال میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھیں اور مستقبل کو تابناک بنائیں،اور اپنی پسماندگی کے اسباب وعوامل کو تلاش کریں پھر ان کے سدباب کی صورتیں نکالیں۔قرآن کی سورۃ الرعد کی آیت کے ٹکڑے کے ترجمہ کو مولانا الطاف حسین حالؔی نے شعری پیکر میں ڈھال کر مسلم اقلیتوں کے آنکھوں پر پڑے پردے کو چاک کر کے رکھ دیا ہے۔ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ بات جگ ظاہر ہے کہ جب ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے پوری طرح آزاد ہو گیا تو یہاں کے تقریباً سبھی طبقوں نے تعلیمی لحاظ سے کافی پیش قدمی کی ہے،علاوہ ازیں مسلم اقلیت کے دوسری اقلیتیں مثلاً سکھ،جین،عیسائی وغیرہ نے بھی تعلیمی میدان میں کافی پیش رفت کی۔اگر حقیقت کا عینک لگا کر دیکھا جائے تو اس ملک کا صدیوں سے محروم دلت طبقہ نے بھی آزادی کے بعد اپنی پرانی روش کو پس پشت ڈال کر تعلیمی اور معاشی لحاظ سے کافی آگے بڑھے ہیں۔لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک کی مسلم اقلیت ہی تعلیمی سمت میں اور دیگر سارے معاملات میں آخر پس ماندہ کیوں رہ گئی۔

مسلم اقلیت میں تعلیمی فقدان کی بنا پر معاشی واقتصادی ابتری اور سماجی وسیاسی بے وزنی کے دریچے کھل رہے ہیں۔ایسے دریچہ کھلنے سے ان کے اندر تمام خرابیاں تو درآہی رہی ہیں ساتھ ہی ساتھ ان میں احساس کمتری، بے بسی اور عدم تحفظ جیسے ناسور احساسات بھی پیدا ہو گئے ہیں۔نسیم اعظمی مسلم اقلیت کی تعلیمی

پس ماندگی کی حقیقت عیاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی مسلم اقلیت کی تعلیمی پس ماندگی نے اسے دیگر بہت سارے نت نئے مسائل میں الجھا کر رکھ دیا ہے جس سے اس کی ترقی و فروغ کی ساری راہیں مسدود ہوگئی ہیں جس کا صحیح اندازہ سچر کمیٹی اور ڈاکٹر رنگ ناتھ مشرا کمیشن وغیرہ کی رپورٹوں اور شفارشوں سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔'' 30

لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد جب دیگر سارے طبقوں نے تعلیم کے میدان میں کافی ترقی کی ہے تو آخر مسلم اقلیت ہی کیوں پیچھے رہ گئی اور دن بہ دن پچھڑتی ہی چلی جا رہی ہے۔ ذیل میں ہم چند وجوہات پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ عوامل ومحرکات کیا ہیں۔

1947ء میں جب ملک تقسیم ہوا اور پاکستان کا وجود عمل میں آیا تو اس وقت مسلم گھرانے ہجرت کر کے اس نئے مسلم ملک کو چلے گئے۔ ہجرت کا مقصد ایک مضبوط اور اعلیٰ مسلم ملک بنانے کا تھا۔ ان میں زیادہ تر تعلیم یافتہ اور خوشحال طبقہ سے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ ملک کی آزادی میں مسلمان کس طرح پیش پیش تھے۔ اور آزادی کے وقت یہاں کا اکثریت طبقہ مسلمانوں کے تعلق سے اپنا تیور بدلنا شروع کر دیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دور میں ان کی نیت واضح طور پر عیاں ہوچکی تھی۔ ہجرت کے اور بھی بہت وجوہات تھے۔ بہر کیف جن کے یہاں صدیوں پرانی خاندانی تعلیمی روایات تھیں ان کے پاکستان چلے جانے کے سبب یہاں تعلیم یافتہ مسلم دانشور طبقے کا فقدان ہوگیا۔ محنت کش مزدور، بنکر، کاریگر، دستکار اور زراعت جیسے پیشہ ور طبقہ ہی یہاں رہ گیا تھا۔ ہاں البتہ ان کے پاس پیشہ ورانہ ہنر مندی تو تھی مگر نہ تو تعلیمی روایات تھیں اور نہ ہی حصول تعلیم کا ذوق وشوق، جو کچھ بھی تھا تو وہ محض واجبی مذہبی تعلیم تک محدود تھا۔

آزادی کے ملک کے تمام ایسے شہروں، قصبات اور علاقے جہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی وہاں سیاسی فرقہ پرست طاقتوں نے منظّم اور منصوبہ بند سازشوں کے تحت ان کو تعلیمی واقتصادی پس ماندگی کا شکار بنانے میں پوری کوششیں صرف کیں اور آئے دن فرقہ ورانہ فسادات کو انجام دے کر مسلمانوں کی اقتصادی حالات کو خراب کر کے انھیں دفاعی پوزیشن پر لا کھڑا کر دیا۔ ان سیاسی فرقہ پرست طاقتوں کے

ہاتھوں سے مسلمانوں کی ہوئی تعلیمی پس ماندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''ان فرقہ پرستوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں انسانیت، رواداری اور سیکولرزم کی علامت مہاتما گاندھی کو ہی شہید کر دیا کیوں کہ بابائے قوم مہاتما گاندھی کو فرقہ پرستی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے تھے۔ اس کے بعد منظّم اور منصوبہ بند سازش کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیمی و اقتصادی پس ماندگی کا شکار بنانے میں لگ گئے۔ آئے دن ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن میں کھڑا کر دیا تا کہ ان کی ساری توانائی اپنے وجود کے تحفظ اور روزگار کے دفاع میں صرف ہوتی رہیں اور انھیں اپنی تعلیمی و اقتصادی ترقی کے مواقع نہ مل سکیں۔'' 31

انگریزوں کی رائج کردہ تعلیم جولڑاؤ اور حکومت کرو کے مقصد سے عام ہو چکی تھی اور اس کے نتائج بھی سامنے تھے، مسلمان ایسی تعلیم سے آراستہ کرنے کو اپنے مذہب وعقائد کے لیے خطرہ سمجھتے رہے۔ چونکہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد چھوٹے شہروں اور قصبوں میں آباد تھی، ان شہروں اور قصبوں میں تعلیم کے لیے معقول انتظامات نہ تھے۔ لوگ اپنے گھروں یا قرب و جوار کی مساجد یا مکاتب میں بچوں کو مذہبی تعلیم سے مختصراً ضرور روشناس کرا دیتے تھے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے یا دلانے سے گریز کرتے تھے۔ جس کے سبب ان کے ذہنوں میں نہ تعلیمی ماحول پیدا ہوا اور نہ ہی تعلیم کی کمی کے سبب ان میں روشن خیالات کی نشو ونما ہو پائی، بالآخر وہ دیگر ہم عصر قوموں سے تعلیمی دوڑ میں پیچھے رہے۔

عام طور پر مسلم بچے اپنے علاقہ کے اسلامی مکتب اور دینی مدارس میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایسے مکتب و مدارس میں جو مولوی یا حافظ صاحبان تعلیمی کام انجام دینے پر معمور ہوا کرتے تھے وہ غریب اور پس ماندہ عوام کے بچوں کے اندر ان چھپی ہوئی خداداد صلاحیتوں کو ابھارنے اور ان میں تعلیم جیسی اہم اکائی سے اچھی طرح سے روشناس کرانے کے اہل نہ ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ بچوں کی اچھی طرح سے رہنمائی اور خود اعتمادی پیدا نہیں ہو پاتی تھی، جس کے سبب مزید آگے کی تعلیم حاصل کرنے سے گریز کرنے

لگتے اور اپنی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید عصری تعلیم حاصل کرنا ہی چھوڑ دیتے تھے۔جس کی وجہ سے تعلیمی انحطاط روزافزوں ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ نئی بات نہیں کہ سرکاری نوکریوں اور تعلیمی درسگاہوں میں مسلمانوں کے ساتھ تعصّبانہ اور امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔دیگر برادران وطن کی صلاحیتوں کے مقابلے اگر مسلمانوں کی صلاحیتیں سبقت لے جاتی نظر آتی ہیں تو بھی انھیں پس پشت ڈال دیا جاتا ہے،جس کے سبب مسلمانوں کے حوصلوں میں پستی اور دلوں میں تعلیم جیسی اہم اکائی سے عدم دلچسپی کے رجحانات خودرو پودوں کی طرح پنپنے لگتے ہیں،جو تعلیمی پسماندگی کو بڑھانے میں معاون ہوتے ہیں۔

مولانا قاسم نانوتویؒ،حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ،سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں میں عصری و اسلامی تعلیم کو عام کرنے کا جو بیڑا اٹھایا تھا وہ بہت کارگر تھا،1947ء کی آزادی اور تقسیم ملک کے بعد بھی اس طرز کی تعلیمی تحریک کی مسلمانوں کو اشد ضرورت تھی جو ان کو نئے حالات و ماحول سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ ساتھ نئے تعلیمی رجحانات سے مالا مال کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی،لیکن حالات کی ابتری کی وجہ سے پھر ماحول سازگار نہ ہو سکے اور طرز تعلیم کے بہتر طریقوں کو نظرانداز کر کے یوں ہی تعلیمی سرگرمیاں جاری رہیں جو کما حقہ سودمند نہ ہو سکیں۔

مسلمانوں کو تعلیمی پس ماندگی کی سمت لے جانے میں کچھ نام و نہاد علماء بھی ہیں جو اپنی دقیانوسیت کے سبب مسلم بچوں میں تعلیمی بیداری اور روشن خیالی پیدا کرنے میں ناسور بنے ہوئے ہیں،وہ اپنی سماجی بالادستی کے لیے اسے خدشہ سمجھتے ہیں،اور ساتھ ہی ساتھ جدید تعلیم اور سائنس کی اہمیت و افادیت کو اسلام کے لیے خطرہ بتاتے ہیں۔جب کہ حقیقت کچھ برعکس ہے۔1000ء تک سائنس کے میدان میں مسلمانوں کا تناسب ترانوے(93%)فیصد تھا،اس وقت تک مسلمان دنیا میں باعزت اور بلند رہے۔یورپ کی سب سے پہلی یونیورسٹی''کارڈوا یونیورسٹی''مسلمانوں کی ہی قائم کردہ ہے،جو ان کے بعینہ افکار کی واضح نشانی ہے اور اپنے ہم عصروں پر جدید تعلیم کے میدان میں فوقیت رکھنے کی بین دلیل ہے۔

اتر پردیش کے سابق ریاستی وزیر مملکت برائے بیسک تعلیم مسٹر رونددر شکلا نے گورکھپور،لکھنو،

ہاتھرس اور سلطان پور میں جو بیانات تعلیمی نصاب اور اسکولوں میں وندے ماترم، ایش وندنا، بھارت ماتا کی تصویر پر پھول چڑھانے و پوجا ارچنا کرنے اور اسکولوں کو آشرم کا روپ دینے کے سلسلہ میں دیے تھے اس پر پوری طرح سے عمل کرنے کے احکامات جاری ہو گئے تھے۔

مسٹر شکلا ضرور دیگر برادران قوم کے مذہب سے واقف رہے ہونگے کہ مورتی پوجا مسلمانوں، عیسائیوں اور آریہ سماجیوں میں جائز نہیں ہے۔ مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ وحدانیت ہے اور ان کے یہ احکامات ان کو ان کی مذہبی آزادی سے محروم کرتا ہے۔ دستور ہند بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ دستور ہند کی دفعہ 25 میں مذہبی آزادی دفعہ 29 میں زبان اور کلچر کی حفاظت کی ضمانت اور دفعہ 350 میں پرائمری سطح کی تعلیم بچوں کی مادری زبان میں دینے کی ذمہ داری اسٹیٹ کو دی گئی ہے۔ اس کے باوجود دستور ہند کی دفعات کے خلاف احکامات جاری کر کے مسلمانوں کی تعلیمی اور مذہبی حوصلوں کو مجروح کیا جا رہا ہے۔

دہشت گردی کے نام پر بے گناہ مسلم طالب علموں کی اندھا دھند گرفتاری، بٹلہ ہاؤس کا فرضی انکاؤنٹر، گجرات، کشمیر اور مظفر نگر جیسے نسل کش فرقہ وارانہ فسادات، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دیگر مسلم اقلیتوں کے اداروں میں حکومت کی طرف سے بے جا مظالم نے مسلم نوجوانوں کے تعلیمی حوصلوں کو زبردست مجروح کیا ہے۔

مذکورہ اسباب و عوامل کے علاوہ اور بھی بہت سارے وجوہات ہیں جن کے سبب ہندوستان میں مسلمان پچھڑتے جا رہے ہیں اور تعلیم میں پچھڑنے کے سبب زندگی کے تمام کاموں اور میدانوں میں ناکام ہوتے جا رہے ہیں۔

ان اسباب و عوامل کو دیکھتے ہوئے کچھ مسلم دانشوران نے عملی اقدام اٹھانا شروع کیا تعلیم کے تئیں بیداری لانے، اسے مستحکم بنانے، اسلام کی امانت کو محفوظ رکھنے، اور آنے والی نسلوں تک اسے منتقل کرنے کے بارے میں 1959ء میں ضلع بستی میں ایک تاریخی صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں تدارک کے ٹھوس اقدامات کیے گئے اور درج ذیل قرارداد پیش کی گئیں:

1. ''ہم بحمد اللہ مسلمان ہیں اور ہمارا فیصلہ ہے کہ اسلام کی امانت محفوظ

رکھیں گے اور اپنی نسلوں تک اسے منتقل کریں گے۔

2. ہم ہندوستان کے شہری ہیں اور اپنے ملک میں ایک باوقار زندگی کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہیں گے۔

3. علم حاصل کرنا ہمارا فریضہ ہے ہم اپنے بچوں کو علم کی اور خاص کر علم دین کی روشنی سے محروم نہ ہونے دیں گے۔

4. قرآن ہمارا ورثہ ہے اس ورثہ کو آئندہ نسلوں کے سینے میں محفوظ کرنا ہمارا فرض ہے، اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

5. اپنی پسند کی تعلیم کے لیے ہم حکومت کے دست نگر ہو کر نہیں رہیں گے بلکہ اپنی ضروریات کو گھٹا کر اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ کاٹ کر اپنے بچوں کی تعلیمی ضرورت کو پورا کرتے رہیں گے۔

6. ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں ملک میں اسلامی عقیدے کی حامل صاحب ایمان، باصلاحیت اور مفید شہری بن کر رہیں گے۔

7. ہم دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے نام سے ہر مسلک و خیال، ہر جماعت اور ہر طبقے کے مسلمانوں پر مشتمل اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں تاکہ تعلیم کے سلسلے میں ہر ممکن تعمیری اور آئینی جدوجہد کی جا سکے۔''32

یہ تھے وہ فیصلے جو نہایت اہم اور لائق اعتناء ہیں۔ لیکن اس فیصلے کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا بلکہ صرف زبانی لفاظی کے نذر ہو گیا، تاریخ کے کسی بھی دور میں مسلمان دنیا کے دیگر مذاہب کے مقابلے میں کبھی بھی اتنا کم خواندہ نہیں تھے جتنے کہ آج ہیں، لہذا مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو درج ذیل صورتوں سے دور کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی 80% فیصد آبادی کی مادری زبان اردو ہی ہے، اور دیگر برادران قوم روزمرہ کی زندگی میں عملی طور پر 5% اردو زبان کا ہی استعمال کرتے ہیں، اور ہندوستان کے بڑے حصے میں

یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔اس لیے یہاں اردو میڈیم کا فروغ ہونا چاہیے،تاکہ اردو والے بھی آج کے بدلے ہوئے حالات میں ترقی کے مساویانہ راہ پر گامزن ہوسکیں اور دیگر زبانوں کے طلباء کے شانہ بہ شانہ چل سکیں۔

زیادہ تر لوگوں کا رجحان ہے کہ اردو میڈیم سے جدید عصری،تکنیکی،اور ایڈوانس تعلیم کی سہولیات فراہم کرنا ممکن نہیں یہ کہہ کر کسی کو مطمئن نہیں کیا جاسکتا،جیسا کہ نسیم اعظمی اردو میڈیم سے دی جا چکی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کیوں کہ اب یہ کہہ کر کسی کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اردو میڈیم سے جدید عصری،تکنیکی اور ایڈوانس تعلیم کی سہولیات فراہم کرنا دشوار و مشکل امر ہے۔آج کا طالب علم انتہائی ذہین بھی اور وقت شناس بھی ہے،وہ اپنے حال و مستقبل کے ساتھ ساتھ ماضی سے بھی بڑی حد تک آشنا ہے۔انہیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ 1835ء میں کولکتا میں میڈیکل اور انجنیئر نگ کی بہتر تعلیم اردو میڈیم سے کی جا چکی ہے۔ ایک طویل عرصہ تک اردو میڈیم سے تعلیم یافتہ ڈاکٹروں اور انجنیئر وں نے دنیا بھر سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔'' 33

آگے مزید لکھتے ہیں:

''1917ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں سائنس،انجنیئر نگ اور میڈیکل سمیت دیگر عصری جدید اردو تکنیکی تعلیم کے کامیاب تجربے کیے جا چکے ہیں،اور عہد حاضر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور بہت سے دیگر تعلیمی ادارے بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔'' 34

مکاتب و مدارس کی ابتدائی تعلیم سے ہی تعلیمی اصلاح کی کوشش کی جائیں تا کہ آگے کی تعلیم کے لیے اچھے طلباء تیار ہوسکیں اور مسلم نوجوانوں میں تعلیم چھوڑ دینے کی شرح زیادہ ہے اس پر قابو پایا جاسکے۔

مسلم سماج کا ایک بہت بڑا طبقہ جس میں علماء بھی شامل ہیں وہ جدید تعلیم اور سائنس وٹکنالوجی کی

اہمت وافادیت سے نہ صرف قائل ہیں بلکہ مسلمانوں میں ایسی تعلیم کے علمبردار بھی ہیں۔تعلیم ہی سے اچھا شہری، بااخلاق انسان، بہتر سائنسداں، کامیاب معالج، جید عالم وغیرہ تیار ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں میں تعلیمی ترقی کی ایک ایسی راہ ہموار کر سکتے ہیں جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں موجود تھی۔

دینی مدارس اور مسلمانوں کے اقلیتی اسکولوں میں صنعت وحرفت، روایتی دستکاری وزراعت جیسے اہم مضامین کو عملی طور پر شامل کیا جانا چاہیے، تاکہ طلباء کے اندر پیشہ وارانہ وابستگی کو استحکام ملے اور نئی ترقی و توسیع کے امکانات بھی روشن ہوں۔ مدارس کے نظام تعلیم میں انگریزی اور غیر ملکی زبان کا داخل ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس سے طلباء اور اساتذہ اس سے واقفیت حاصل کر کے ایسے پرفتن دور میں اپنے آپ کو کسی عصری اور جدید تعلیم حاصل کرنے والوں کے سامنے اپنی مذہبی تعلیم کو لے کر نفسیات کا شکار نہ ہوں۔ مولانا ابوالحسن علی الندوی لکھتے ہیں:

> ''حضرات! مدارس دینیہ کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ نصابی کتابیں سمجھ لی جائیں اور مسئلے مسائل بتا دیے جائیں، ہم ان کی ناقدری نہیں کرتے، اس نظام تعلیم کا ہم احترام کرتے ہیں، اور اس کے داعی اور ذمہ دار ہیں، لیکن صرف اتنا کافی نہیں، موجودہ فتنوں کو سمجھنا ان سے اچھی طرح باخبر ہونا اور ان کا مؤثر و طاقت ور زبان اور دلکش اسلوب میں مقابلہ کرنا وقت کا بنیادی تقاضا ہے، ہمارے طلبہ واساتذہ انگریزی اور کسی غیر ملکی زبان سے بھی واقف ہوں اور ان کے مآخذ سے فائدہ اٹھا سکیں اور ایسا لٹریچر تیار کریں جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کر سکے، ہمارے اساتذہ و طلباء کا مطالعہ وسیع، متنوع اور اپٹوڈیٹ ہو۔'' 35

نسیم اعظمی نے بھی یہ تجویز دی کہ قلیل مدتی تعلیم، مراسلاتی تعلیم، فاصلاتی تعلیم اور غیر رسمی تعلیم سے مسلم بچوں کو روشناس کرا کے اور ان پر عمل پیرا ہو کر کے بھی ان کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''مسلم بچوں کو قلیل مدتی طریقۂ تعلیم جیسے غیر رسمی تعلیم، مراسلاتی تعلیم

اور فاصلاتی تعلیم کے طور طریقوں سے باخبر کر کے ان تعلیمی طریقوں کو
ان کے لیے مؤثر بنایا جائے۔اس کے علاوہ شبینہ مدارس اور تعلیم بالغان
کے مراکز کا قیام کر کے ہنگامی طور پر کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تعلیم
یافتہ بنانے کی کوشش کی جائے تا کہ مسلمانوں کے تعلیمی تناسب کی
شرمناک کمی کو دور کیا جا سکے۔'' 36

نسیم اعظمی کے مطابق مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں قلیل مدتی تدریسی تربیت کا انتظام ہونا چاہیے اور نا اہل اساتذہ جو اپنے غیر تعلیمی لیاقت (پیسہ، رشتہ داری اور چاپلوسی) کو بروئے کار لا کر اساتذہ کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں ایسے اساتذہ کی تقرری پر روک لگانی چاہیے۔اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے مرکزی تعلیمی ادارے جیسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد دہلی، دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ
وغیرہ کو چاہیے کہ بنیادی تعلیم کے لیے قلیل مدتی تدریسی تربیت کا اہتمام
کریں تا کہ مسلمانوں کے ابتدائی تعلیم مکتبوں اور مدرسوں میں نا اہل
اساتذہ کی تقرری پر روک لگ سکے، اچھے تعلیمی ریکارڈ والے تعلیم یافتہ
حضرات کی تدریسی ٹریننگ کا بندوبست کیا جائے اور جدید معروضی طرز
کے ٹیسٹ کی بنیاد پر میرٹ کے اعتبار سے ہی اساتذہ کی تقرری کو یقینی
بنایا جائے کیوں کہ سرکاری امداد یافتہ مدارس میں اقرباء پروری کا ہی بول
بالا ہے۔لائق و فائق اساتذہ سے ہی معیار تعلیم بلند ہوگا اور بچوں میں
تعلیمی دلچسپی کے رجحان کو فروغ ملے گا۔'' 37

جس طرح سے مولانا قاسم نوتویؒ کے قائم کردہ مدرسہ کی شاخیں ہندوستان بھر میں کسی نہ کسی شکل میں قائم ہوئی تھیں ٹھیک اسی طرح سے اگر سرسید احمد خاں کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جاتا اور جگہ جگہ مسلم یونیورسٹیاں کھولی جاتیں تو آج مسلمانوں کے کئی ادارے ہوتے اور مسلمان تعلیمی و ترقی کے معاملات میں غیر برادران قوم سے آگے ہوتے، ان کی حالت اتنی خستہ نہ ہوتی، تعصب اور فرقہ پرستی کا وار ان پر کارگر نہ ہوتا، ان کا آج اپنے ملک میں منصب اور مرتبہ ہی کچھ اور ہوتا۔

آج حالات ایسے رونما ہو چکے ہیں کہ اگر مسلمان اب بھی حصول تعلیم میں سرگرم عمل نہ ہوئے تو انھیں ہر طرح کے مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا، انھیں اپنی قومیت ثابت کرنے کے لیے دردر بھٹکنا پڑے گا، انھیں ہر طرح سے ملکی اور صوبائی سطح کے حقوق سے دستبردار ہونا پڑے گا، اس سے پہلے کہ اگر مسلمان اپنی تعلیمی پس ماندگی کا سدباب خود ڈھونڈ ھ لے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے تو یقیناً یہ صدی پھر سے مسلمانوں کی صدی ثابت ہوگی، پھر سے مسلمانوں کا ملک میں بول بالا ہوگا، ظلم ستم کا جو آج بازار گرم ہے اس پر قدغن لگ جائے گا، ملکی اور عالمی پیمانے پر پھر انھیں عزت واحترام سے دیکھا جانے لگے گا، اور مسلمانوں کی قائدانہ صلاحیت کے سامنے پوری دنیا سرنگوں ہوگی، جیسے قرون وسطیٰ میں ہوا کرتی تھی۔

نسیم اعظمی اپنے تعلیمی تصورات پیش کرتے ہوئے اپنے تجزیے بھی پیش کیے ہیں، چند مضامین میں انھوں نے تعلیم کے انتظامی امور سے بحث کیا ہے۔ اپنے مضمون ''یہ خامیاں فقط تعلیم و امتحاں کی ہیں'' اس میں انھوں نے ان خرابیوں کو اجاگر کیا ہے جو رواج کے طور پر رائج ہیں اور اس کو اسی طرح برتا جاتا ہے جیسے زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ لہٰذا آپ نے ان خرابیوں پر انگلی رکھی اور ان کی نشاندہی فرمائی تا کہ ان کو دور کر کے مستقبل میں اچھی راہ اپنائی جائے، انھوں نے ان کی نشاندہی کرتے ہوئے اس مضمون کے تحت اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق تعلیم کو لانے اور مروجہ طریقۂ تعلیم کا متبادل تیار کرنے کی راہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''مروجہ نظام تعلیم اور طریقۂ امتحان کی مختلف خامیوں کو این۔سی۔ای۔ آر۔ٹی اور دوسرے اداروں نے بھی مخالفت کی ہے اور خارجی امتحانات کے اثرات کو کم کر کے ملک کے نظام تعلیم کو اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق بنانے پر زور دیا ہے اور مروجہ طریقۂ تعلیم کا متبادل کرنا ناگزیر بتایا ہے اس لیے درج ذیل نکات پر عمل درآمد کر کے ہندوستانی طلباء اور نئینسل کو مختلف پریشانیوں اور تعلیمی استحصال سے بچایا جا سکتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کو ملک وقوم کی ترقی میں معاون بنایا جا سکتا ہے۔
>
> 1. تعلیم کا مقصد ملازمت کے بجائے طلباء کی ذہنی وفکری نشو ونما اور ہمہ

جہت ترقی کی بنیاد بنایا جائے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ از سر نو نظام تعلیم کی تشکیل کی جائے۔اسکولی تعمیرات، نصاب، طریقۂ تعلیم اور طرز امتحان میں بنیادی تبدیلی لائی جائے۔

2. طلباء کو ایک اہم معاشرتی اکائی تصور کرتے ہوئے ان کے لیے بہتر تعلیم لائق اساتذہ کا بندوبست کیا جائے اور ان کی صلاحیتوں کو داخلی امتحانات اور خارجی آزمائش کے ملے جلے پیمانے سے جانچ پرکھ کی جائے۔

3. پاس فیل ہو جانے والے خارجی امتحانات کو ختم کر کے گریڈ سسٹم رائج کیا جائے اور ایسا کرنے سے قبل اس کا واضح خاکہ طلباء، اساتذہ اور سرپرتوں کے سامنے رکھا جائے۔

4. جدید طرز کے معروضی امتحانات کو رواج دیا جائے تاکہ طلباء کو قصاب نما ممتحن اور نقل سے نجات دلائی جائے اور طلباء اپنے جوابات و نمبرات کی جانچ خود ہی کر سکیں۔

5. پورے ملک میں ثانوی سطح کے جو 34 تعلیمی بورڈ قائم ہیں ان میں تال میل پیدا کر کے یکسانیت لائی جائے اور امتحانات سے گزرنے کے بعد بھی طلباء کو جو انجینئرنگ، میڈیکل، مینجمنٹ، ٹیکنالوجی اور دوسرے پیشہ ورانہ اداروں میں داخلے کے لیے مختلف ٹسٹوں سے گزرنا پڑتا ہے اور مختلف مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس لیے اس سے نجات مل سکے اور ان میں آگے بڑھنے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ اور جوش پیدا ہو سکے۔اس کے علاوہ ثانوی سطح پر سمسٹر سسٹم اور اعلیٰ ثانوی سطح پر کریڈٹ سمسٹر سسٹم کو اپنا کر بھی متبادل تعلیمی نظام قائم کیا جا سکتا ہے اور 1986ء اور 1992ء کی قومی تعلیمی پالیسی میں جو قومی ویلوایشن کمیٹی کی تشکیل کی باتیں کی گئی ہیں اس پر عمل درآمد کر کے نئی نسل کو ذہنی الجھن ،خوف، بے عزتی ،محرومی، مایوسی، بے حوصلگی اور خودکشی وخودسوزی سے

بچایا جاسکتا ہے اور طلباء کی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے اور بروئے کار لا کر ملک وقوم کی ہمہ جہت ترقی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر بنایا جا سکتا ہے۔'' 38

دوسرا مضمون ''جدید ٹکنالوجی اور بدلتی تعلیمی قدریں'' ہے جس میں جدید تعلیم اور تکنیکی تربیت حاصل کرنے کی اصلاح کے ساتھ ساتھ نسیم اعظمی نے تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو جدید تکنیک سے ہم آہنگ کرنے کی بات بھی کہی ہے اور یہ مشورہ دیا ہے کہ صرف جدید طرز سے تعلیم حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ حالات کی برق رفتاری کو دیکھتے ہوئے اس جدید تکنیک سے آراستہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

تیسرا مضمون ''بزنس مینجمنٹ کی تعلیم اور اس کے اہم مراکز'' ہے۔ اس میں آپ نے انتظامی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی بات کہی ہے اور ان مراکز کی نشاندہی فرمائی ہے جہاں سے اس صلاحیت کو پروان چڑھانے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں اور شعبہائے حیات کے شعبہ میں ادھر دھیان دینے کی ضرورت ہے، ورنہ کام ادھورا رہ جائے گا یا ہوگا بھی تو سودمند نہیں ہوگا۔

اسی طرح آزادی کے بعد سے تعلیم کی جو صورت حال ہے اس پر بھی آپ نے تجزیہ پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں آپ کے مضامین ہیں ''اردو کی بنیادی تعلیم۔ آزادی کے بعد''، ''اردو ثانوی تعلیم کی صورت حال''، ''اردو کی اعلیٰ تعلیم۔ مسائل اور حل''، ''اردو تعلیم اور روزگار کے مواقع''۔

ایسے ہی انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کا بھی جائزہ لیا ہے اور مفید مشورہ دیا ہے، اس سلسہ میں ان کے مضامین ہیں ''مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے اسباب''، ''مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے تدارک کی صورتیں''، ''اتر پردیش کے عربی مدارس کا نیا نصاب'' وغیرہ ہے۔

نسیم اعظمی چونکہ خود معلم تھے اس لیے طالب علموں کے مسائل، ہمارے تعلیمی نظام اور تعلیمی طور طریقوں سے اچھی طرح واقف تھے ی، یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے تعلیمی طور طریقوں سے مایوس ضرور تھے لیکن نئی نسل سے مایوس نہیں تھے، وہ اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ ہم اگر چاہیں تو ان کی صلاحیتوں کو ابھار سکتے ہیں اس سلسلے انھوں نے ہر طالب علم کو اس مٹی سے تشبیہ دیا ہے جسے کمہار اپنی ہنرمندی سے جو چاہے بنا سکتا ہے

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''میں خود ایک معمولی معلم ہوں اور تعلیم سے عملی طور پر وابستہ ہونے کے ناطے اپنی بساط بھر ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتا ہوں کہ ملت کی نئی نسل تعلیمی پس ماندگی سے نکل کر تعلیمی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے، اور اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی اورینٹل اور جدید تعلیم اور سائنس وٹکنالوجی میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ مگر اسی کے ساتھ اپنے نظام تعلیم اور تعلیمی طور طریقوں پر نظر ڈالتا ہوں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ مگر مایوسی کفر کا درجہ رکھتی ہے اس لیے میں طالب علموں کو نہ مجبور ولاچار اور کمزور سمجھتا ہوں اور نہ ہی نئی نسل سے مایوس ہوں کیوں کہ آنے والا ہر بچہ اور ہر طالب علم اس مٹی کی طرح ہوتا ہے جسے کمہار کی فنکاری اور ہنرمندی جو چاہے بنا سکتی ہے۔'' 39

وہ اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ طالب علموں میں حصول تعلیم اور ترقی کے امکانات موجود ہوتے ہیں لیکن وہ طالب علموں کی ان صلاحیتوں کو جو نکھر کر سامنے نہیں آرہی ہے اس کا ذمہ دار والدین، اساتذہ، تعلیمی اداروں، انتظامیہ اور سماج کو مانتے ہیں جو نئی نسل کے مزاج، فطرت، رجحان اور عہد و ماحول کے مطابق ان کی تربیت کے مواقع فراہم نہیں کر پا رہے ہیں۔ اپنے انھیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''میرا یہ بھی ماننا ہے کہ نئی نسل اور نئے طالب علموں میں حصول علم اور ترقی وفروغ کے سارے امکانات موجود ہیں کمی طالب علموں میں نہیں بلکہ والدین، اساتذہ، تعلیمی ادارے اور انتظامیہ وسماج کے ذمہ داروں میں ہوتی ہے جو نئی نسل کے مزاج، رجحان اور ان کی فطرت ونفسیات کے مطابق ان کے عہد و ماحول سے ہم آہنگ تعلیم وتربیت کے مواقع نہیں پیدا کرتے ان کی حسب ضرورت ایثار وقربانی کے جذبہ وعمل کا اظہار نہیں کرتے۔'' 40

نسیم اعظمی کے ان خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی نوجوان نسل کے درد سے اچھی طرح

واقف تھے انہیں نہ صرف اپنی قوم کی غیرت و پسماندگی کا احساس تھا بلکہ وہ ان میں زندگی کو جینے کا حوصلہ اور تعلیمی میدان میں آگے بڑھانے کے خواہاں تھے۔ پروفیسر آفتاب احمد آفاقی اپنے مضمون ''نسیم اعظمی کا تعلیمی شعور'' میں ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''نسیم اعظمی ایک نیک طبع اور مصمم ارادہ کے انسان واقع ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی ایسے تمام لوگوں کے لیے ایک نمونہ ہے جو غربت یا پس ماندگی کی دہائی دے کر ترقی کی راہیں خود کے لیے مسدود کر لیتے ہیں۔ نسیم اعظمی زندگی کو جینے کا ہنر ہی نہیں جانتے تھے بلکہ منفی حالات کو شکست دینے کی کلا بھی انھیں آتی تھی۔'' 41

یوں تو نسیم اعظمی ایک طرف منجھے ہوئے نقاد، خوش گو شاعر اور قلم کار رہیں ہی لیکن دوسری طرف ان کی زندگی کے کارہائے نمایاں پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ جو کام کیا وہ تعلیم کے میدان میں ہے، انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے تعلیم کے سلسلے میں بعض قیمتی مشورے دیئے ہیں اور پھر ان کو بروئے کار لانے کے گر بھی سکھاتے ہیں کہ ان پر عمل پیرا ہو کر ہماری قوم آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں دیگر قوموں سے مقابلہ کر سکے اور ان میں خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا ہو سکے اور اپنے تئیں وہ احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں بلکہ زمانے کے تقاضوں کے تحت خود کو ڈھال کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔ انھوں نے اپنی تصنیف ''تعلیمی اشارات'' میں چند نکات کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے جن کو بروئے کار لانے کے بعد اس تیز رفتار دور میں دیگر قوموں کے شانہ بہ شانہ چلنے کا حوصلہ اور جوش پیدا ہوگا۔

نسیم اعظمی کو اس بات کا بھی شدت سے احساس ہے کہ مسلمان قوم ہندوستان کی دیگر قوموں کے مقابلے پستی کی راہ پر ہیں، انہیں اس بات کا غم وغصہ ہے کہ دیگر قوموں کے مقابلے مسلمان جدید تکنیکی اور پروفیشنل یا اعلیٰ سائنسی ریسرچ میں بھی پیچھے ہیں۔ ہماری قوم کی جہالت اور ناخواندگی پر انہیں افسوس ہے اور اس بات پر بھی انہیں غصہ آتا ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ غفلت میں پڑی ہوئی ہے ان میں آگے بڑھنے کی تحریک ہی بیدار نہیں ہو رہی ہے اپنے انہیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی سب سے بڑی مسلم اقلیت تعلیم میں سب سے پیچھے

ہے۔ ہندو اکثریت کے مقابلے میں بھی اور ہندوستان کے ہزاروں
سال سے محروم طبقات یعنی مندرجہ قبائل اور مندرجہ فہرست سے بھی یہ
کافی پچھڑی ہوئی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا حقیقی تعلیمی تناسب تقریباً ۲۵ فیصد ہے جس
میں غالباً اکثریت معمولی پڑھے لکھے یا خواندہ لوگوں کی ہے جو اصل
میں تعلیم یافتہ نہیں بلکہ حرف شناس یا لٹریٹ(LITERATE) ہیں
۔تعلیم یافتہ یا ایجوکیٹڈ (EDUCATED) نہیں ہیں تقریباً ڈھائی
فیصد ہی ایسے لوگ ہیں جنہوں نے گریجویشن یا اس سے آگے کی تعلیم
حاصل کی۔جدید تکنیکی اور پروفیشنل یا اعلیٰ سائنسی ریسرچ و تحقیق میں ان
کا تناسب نہیں کے برابر ہے۔پھر بھی ہم اپنی جہالت اور ناخواندگی پر
قانع ہیں نہ دوسروں کی ترقی دیکھ کر اپنی ترقی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور نہ
ہی رشک و مسابقت کی تحریک ہی پیدا ہوتی ہے۔'' 42

حکیم وسیم اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن لکھنؤ) نسیم اعظمی کو قدیم تعلیمی ورثے کو شعوری طور پر اور جدید علوم کو عملی طور پر برتنے کی ان کوششوں کو سراہتے ہوئے ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے ان کی شخصیت کو منفرد اور ممتاز قرار دیتے ہیں، ان کی تحریروں میں ملت اسلامیہ کی تعلیمی بیداری اور تنظیم کے لیے بالخصوص جو دردمندی اور مستقبل کی جو منصوبہ بندی ملتی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اس میں بہتر معاشرہ کے لیے ان کا کرب نظر آتا ہے ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی کم و بیش تمام تحریریں میرے مطالعے میں رہی
ہیں۔عادتاً بھی اور ضرورتاً بھی۔ان تحریروں میں قدیم تعلیمی اور تہذیبی
ورثے کو شعوری طور پر سجونے اور علوم جدیدہ کو عملی طور پر برتنے کی
ترغیب ملتی ہے۔ان کا مجال قلم کثیرت الجہت ہے ،وہ ادیب، شاعر،
ناقد، محقق، صحافی اور معلم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن میرے
خیال میں ان کی شخصیت ایک ماہر تعلیم کے طور پر زیادہ منفرد اور ممتاز

نظر آتی ہے۔ان کی اس جہت کی تحریروں میں برادران وطن کی تعلیم کے
لیے بالعموم اور ملت اسلامیہ کی تعلیمی بیداری اور تنظیم کے لیے بالخصوص
جو دردمندی اور مستقبل کی منصوبہ بندی ملتی ہے،اس میں بہتر معاشرہ کی
تشکیل اور برتر آدم کی تخلیق کا جو کرب نظر آتا ہے ان کی فکریات اور
شخصیت کی توقیت کرتا ہے۔'' 43

مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے فکر مند اشخاص میں چند گنے چنے لوگ ہی نظر آتے ہیں۔نسیم اعظمی نے جس طرح اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں تعلیمی شعور بیدار کرنے ،ان میں ترقی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی ان کی اس کوشش کو سراہتے ہوئے حکیم وسیم اعظمی آگے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اپنی جس فکر کی اختصاص کے ساتھ منظّم طور پر تشہیر و
توسیع میں مصروف ہیں وہ علم کی تشہیر ہے، دانشوری کی توسیع ہے۔جس
میں ذہن سوزی بھی ہے اور استخواں سوزی بھی۔لیکن اس میں جولذت و
حلاوت ہے جو لطف و سرور ہے،اس کو ایک دانشور ہی محسوس کرسکتا ہے
یہ دانشوری بہت بڑوں کی ایک برگزیدہ جماعت کی دانشوری ہے۔بر
صغیر ہندو پاک میں اس طرح کی دانشوری کے لوگ ہمیشہ سے بہت کم
رہے ہیں۔'' 44

نسیم اعظمی ان لوگوں میں نظر نہیں آتے جو پروپیگنڈوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں اور جو چیز لوگوں میں رائج اور زبان زد ہو جاتی ہے اس کے لیے قائل ہو جائیں ان کی یہی کوشش رہی ہے کہ ہر کہی اور سنی ہوئی بات کو دھیان دے کر خود اپنی عقل و خرد کا بھی استعمال کرتے ہیں ان کے مطابق مسلمانوں کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی گئی ہے کہ وہ تعلیم کے سلسلہ میں سست واقع ہوئے ہیں اور اس پر دھیان نہیں دیتے اسی لیے دیگر تمام میدانوں میں دوسروں سے پیچھے ہیں،نسیم اعظمی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ سرکاری و غیر سرکاری،اسی طرح معاشی و اقتصادی تمام شعبوں میں ان کا تناسب نہیں کے برابر ہوتا ہے اور اس احساس کو خود ان کے اندر اجاگر کرنے کے لیے دوسری قوم کے لوگ اس کثرت اور شدت سے اس بات کو بار بار

دھراتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر احساس کمتری پیدا ہو جائے اور جوان میں تھوڑا بہت حوصلہ ہے بھی وہ بھی دب کر رہ جائے تاکہ ان کا مستقبل تاریک رہے، ان کا خیال ہے کہ اس طرح کی باتوں کو ہوا دینے والوں کو خوب معلوم ہے کہ مسلم قوم ہی ایسی قوم ہے کہ جب جب اس نے اپنی غفلت سے پردہ ہٹایا ہے تب تب دیگر قوموں کو اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہو گیا ہے، سابقہ صدیاں اس کی بہترین گواہ ہیں کہ علم وفن کے تمام شعبے ان کے احسانات کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور ہر شعبہ ہائے علم وفن میں ایسے ایسے باکمال پیدا ہوئے کہ دنیا ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

نسیم اعظمی اپنی قوم کے پیچھے رہنے کی مذکورہ وجوہات بتاتے ہیں اور ساتھ ہی نئی نسل کی ترقی کی طرف گامزن ہونے کی کوششوں کا بھی ذکر کرتے ہیں چونکہ اکیسویں صدی میں مسلمانوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جس طرح ہماری قوم نے ترقی کی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''اکیسویں صدی کہ ہمہ جہت انقلاب آفریں سائنسی اور ٹکنالوجی ترقی اور نئے تعلیمی دھماکوں نے تعلیمی بیداری کے ان احساسات کو مزید توانائی دی۔ مسلمانوں کی نوجوان نسلوں میں مزید بیداری پیدا ہوئی۔ لوگوں میں اپنے بچوں کو پڑھانے اور تعلیم دلانے کی ذمہ داری کا احساس ہوا اور مختلف میدانوں میں مسلم نوجوانوں نے اپنی موجودگی درج بھی کرائی، جس سے پڑھنے پڑھانے کا رواج بڑھا۔'' 45

نسیم اعظمی کی تعلیمی کتب کے مطالعہ سے ان کی فکر اور تعلیمی شعور کا اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی یہ بھی علم ہوتا ہے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتے ہیں جو مسلمانوں کی ترقی کا خواہاں ہے۔ انھیں اپنی قوم کی مفلوک الحالی اور پستی کا شدید احساس ہے اور وہ اپنی قوم کو دیگر قوموں کے مقابلے میں جدید دور کی ٹکنالوجی اور سائنسی ریسرچ میں شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف ان میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں بلکہ اپنی تعلیمی کتب میں مفید مشورے اور تجاویز بھی پیش کیے ہیں۔

نسیم اعظمی کے افکار و رجحانات کو بخوبی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی ان بے لوث خدمات کا جائزہ لیا جائے جس میں انہوں نے اپنے فکر وفن کو قلم کی زبان سے کاغذ کے ساعی کے حوالہ کیا ہے، یعنی ان کی

ان تالیفات کا تجزیہ کیا جائے جو ان کے فکر وفن کی آئینہ دار ہیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ آپ کیا سوچتے ہیں؟اور آپ کا ملت کے نام کیا پیغام ہے؟اور ملت کا رخ کس سمت موڑ کر کس بام عروج پر اس کو فائز دیکھنا چاہتے ہیں؟ ذیل میں ان کی ان تصانیف کا تذکرہ کرتے ہیں جن کو علم وادب کے ماہرین سے داد تحسین مل چکی ہے اور جن کی افادیت مرور ایام کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔

1. تعلیمی تجزیے

تعلیمی تجزیے نسیم اعظمی کی تعلیم کے متعلق پہلی کتاب ہے اور اس کتاب کے نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا موضوع تعلیم ہے، یہ کتاب تعلیم کے مختلف مسائل اور موضوعات پر لکھے گئے ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کی اشاعت 2002ء میں ہوئی، پوری کتاب چار ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں تعلیم سے متعلق مضامین شامل ہیں جن کے عنوانات ہیں ''یہ خامیاں فقط تعلیم و امتحاں کی ہیں''، ''جدید ٹکنالوجی اور بدلتی تعلیمی قدریں''، ''مینجمنٹ کی تعلیم اور اس کے خاص مراکز''۔

باب دوم میں جو مضامین شامل ہیں ان کی تعداد چار ہیں اور ان کے عنوانات ہیں ''بنیادی تعلیم اور اکیسویں صدی''، ''ثانوی تعلیم اور عصری تقاضے''، ''اعلیٰ تعلیم بڑھتی فیس اور بڑھتا معیار''، ''صنف نازک اور اعلیٰ تعلیم''۔

باب سوم میں جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق اردو تعلیم سے ہے ان میں زیادہ تر اردو تعلیم کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے جس کے عنوانات ہیں ''اردو کی بنیادی تعلیم آزادی کے بعد''، ''اردو ثانوی تعلیم کی صورت حال''، ''اردو کی اعلیٰ تعلیم مصائب اور حل''، ''اردو تعلیم اور روزگار کے مواقع''۔

باب چہارم میں مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی اور اس کے تدارک کے متعلق مضامین شامل ہیں، جن کی تعداد تین ہیں ''مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب''، ''مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے تدارک کی صورتیں''، ''اتر پردیش کے عربی مدارس کا نیا نصاب تعلیم''۔

ان مضامین کے علاوہ اس کتاب میں نسیم اعظمی کا ایک مختصر دیباچہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے تعلیم سے متعلق اپنے خیالات کو پیش کرتے ہوئے تعلیم کی اہمیت وافادیت اور اس کی ضرورت پر زور دیا ہے

مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''تعلیم کا کام دراصل پیغمبرانہ کام ہے۔ کیوں کہ اس کے ذریعہ مردم سازی کی جاتی ہے اس لیے اس عظیم کام کے لیے جہاں فکر سلیم اور فہم و فراست کی گہرائی و گیرائی کی ضرورت ہوتی ہے وہیں یہ کام دل سوزی اور جگر کاوی کا بھی متقاضی ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانے میں یہ پیشہ وہی لوگ اختیار کرتے تھے جو تخلیقی صلاحیت کے حامل ہونے کے ساتھ بنی نوع انسان کی تعمیر اور مردم سازی کے جذبہ سے سرشار ہوتے تھے طلباء میں سیکھنے اور جاننے کا ایسا جذبہ ابھارتے تھے کہ وہ علم کے سرچشموں تک رسائی پاسکیں۔ ان کے نزدیک معلّمی کا عظیم تصور ہوتا تھا چنانچہ وہ طلباء کی سیرت سازی اور علم و آگہی کے فروغ کے لیے اپنی جان تک کھپا دیتے تھے جس کے سبب انسانی معاشرہ آج کی ہمہ جہت ترقی تک پہونچا ہے لیکن جب سے معلّمی محض ایک پیشہ کے طور پر اختیار کی جانے لگی ہے اس وقت سے اس میں بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہونے لگی ہیں مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کی معلّمی کے پیشہ میں خلاقانہ ذہنیت کے لوگوں کا فقدان ہو گیا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ صحیح اساتذہ کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے جو بہر حال قابل افسوس و توجہ ہے۔'' 46

اس کتاب میں مذکورہ دیباچہ کے علاوہ پروفیسر علقمہ شبلی (سابق نائب صدر مغربی بنگال اردو اکادمی کولکتہ) کا کتاب سے متعلق ایک مختصر تعارف بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے کتاب کے مضامین کا تعارف کرتے ہوئے نسیم اعظمی کے تعلیمی افکار پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تعلیمی دور سے ہی ایم نسیم اعظمی کا تعلق علم و ادب سے رہا ہے، ان دنوں یہ درس و تدریس سے وابستہ ہیں اس لیے تعلیمی مسائل سے ان کا واسطہ براہ راست ہے اور موجودہ نظام تعلیم اور اس کی خوبیاں و خامیاں ان کی نگاہ میں ہیں، اردو کی تعلیمی صورت حال، عصری تقاضوں، بدلتی قدروں،

گرتا ہوا تعلیمی معیار اور اس کے اسباب، مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی
اور اس کا تدارک جیسے موضوعات پر ان کے مشمولہ مضامین فکر انگیز ہیں،
یہ مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں اور بہت حد تک موضوع کے ساتھ
انصاف کرتے ہیں۔'' 47

اس کتاب میں ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی (سابق صدر شعبۂ اردو شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ) کا ایک تجزیاتی مضمون ''تعلیمی تجزیئے سے متعلق چند باتیں'' بھی شامل ہے جس میں انھوں نے تعلیم وصحافت سے ان کی وابستگی اور ان کے مطالعہ کی وسعت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

''نسیم اعظمی کو شروع سے تصنیف و تالیف کا ذوق وشوق رہا ہے۔ وہ سولہ
سال کے طویل عرصہ تک ماہانہ نکھار مئو ناتھ بھنجن کے ایڈیٹر بھی رہ چکے
ہیں۔ فی الحال عرصہ سے ایک تعلیمی ادارہ اے وابستہ ہیں اس طرح
انھیں تعلیم وصحافت کا ذاتی تجربہ اور ان موضوعات کا وسیع مطالعہ بھی ہے
تعلیم سے متعلق ان کی تحویل میں ایک بڑا ریسرچ پروجیکٹ ہے اور یہ
کتاب اس کی پہلی کڑی ہے۔'' 48

سخن ہائے گفتنی کے نام سے مولانا نثار احمد قاسمی ندوی کا بھی ایک اہم مضمون اس کتاب میں شامل ہے، جس میں انھوں نے عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کی تعلیمی اور سائنسی ترقی کے تناظر میں آج کے تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے نسیم اعظمی کی اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی کتاب تعلیمی تجزیئے اپنے موضوع کے لحاظ سے
اہم کتاب ہے۔ اس سے ان کے علم کے ساتھ بے پناہ جذباتی تعلق کا
اظہار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نسیم صاحب موصوف نے اپنے تعلیمی تجزیئے اور
اپنے بیش بہا تجربے سے نونہالوں اور قوم کے جوانوں کی رہنمائی اتنے
واضح انداز میں کی ہے کہ اگر اسے مینارۂ روشنی بنالیں تو منزل رسی ضرور
حاصل ہوگی۔'' 49

مذکورہ بالا تحریروں کے علاوہ اردو کے معروف شاعر وادیب اثر انصاری کا منظوم تاثر بھی اس

کتاب میں شامل ہے۔

تعلیمی تجزیئے میں جدید ٹکنالوجی، زمانۂ حال کی بدلتی ہوئی تعلیمی قدریں، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم، تعلیم نسواں، آزادی کے بعد اردو کی ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی صورت حال، اس کے مسائل اور روزگار، مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے اسباب و تدارک، مدارس میں رائج نصاب تعلیم جیسے اہم موضوعات پر سیر حاصل و مدلل بحثیں کی گئی ہیں۔ جو نہایت ہی مفید اور کارآمد ہیں۔

موجودہ طریقۂ تعلیم اور طرز امتحان سے ہندوستانی ماہرین تعلیم اور اساتذہ متفق نظر نہیں آتے ہیں، انھیں ایسا طریقۂ تعلیم اور طرز امتحان از کار رفتہ اور ملک و قوم کے لیے غیر نافع معلوم ہوتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ جو نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم رائج ہے وہ اب فرسودہ اور از کار رفتہ ہو چکا ہے ساتھ ہی اس کا طرز امتحان بھی نئی نسلوں کے لیے ضرر رساں ثابت ہو رہا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں غیر سائنٹفک طریقوں سے امتحان کے نتائج پیش کیے جا رہے ہیں، ایک ممتحن کسی طالب علم کی کاپی پر پچھتر نمبر دیتا ہے تو اسی کاپی پر دوسرا ممتحن ساٹھ نمبر دے دیتا ہے جس کے نتیجہ میں طلباء کے اندر تعلیم سے عدم دلچسپی بڑھنے لگتی ہے اس کے اندر طرح طرح کے فضول خیالات ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ اس طرز امتحان کو نشانہ بناتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

> ''جب تک ہندوستانی نظام تعلیم میں پاس فیل کا طریقہ رائج رہے گا طلباء میں ذہنی تناؤ خوف، محرومی اور ذلت کا احساس بڑھتا رہے گا اور خود کشی اور خودسوزی کی وارداتیں ہوتی رہیں گی کیوں کہ ہمارے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں جو سسٹم رائج ہے وہ غیر سائنٹفک اور غیر اطمینان بخش ہے کیوں کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جس طالب علم کی کاپی پر ایک ممتحن نوے (90) نمبر دیتا ہے اور دوسرا اسی کاپی پر پچھتر (75) ہی نمبر دے سکتا ہے لہٰذا ایسا طرز امتحان جو طلباء کی علمی صلاحیت کا صحیح تعین نہ کر سکے کسی بھی حال میں مناسب نہیں ہو سکتا ہے اور یہی وجوہات ہیں کہ گذشتہ پچاس سالوں سے اس طریقۂ تعلیم اور

طرز امتحان میں بنیای تبدیلی اور مناسب اصلاح کی باتیں کی جا رہی
ہیں۔'' 50

نسیم اعظمی اس کتاب میں جدید اطلاعاتی ٹکنالوجی اور بزنس مینجمنٹ کی نئی تعلیم کی اہمت وافادیت سے روشناس کراتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عام طور پر ہندوستان کا اردو داں طبقہ اپنی پرانی اور روایتی تعلیم سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کیے ہوئے ہے جس کے نتیجہ میں اس کے ذہن میں جدید رجحانات کا فقدان ہے، جب کہ ضرورت آج جدید اطلاعاتی ٹکنالوجی اور بزنس مینجمنٹ کی نئی تعلیم کی ہے۔اس طرح کی تعلیم وقت کی سب سے اہم ضرورت بھی ہے۔نسیم اعظمی اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بزنس مینجمنٹ کی تعلیم وقت کی اہم ضرورت ہے کیوں کہ فی زمانہ اس تعلیم میں اس کو خاصی اولیت حاصل ہے۔ایک دور تھا جب لوگ پیشہ ورانہ تعلیم میں قانون کو اہمیت دیتے تھے پھر وہ دور بھی آیا جب میڈیکل کی تعلیم کو پیشہ ورانہ تعلیم میں اہمیت دی جانے لگی مگر بیسویں صدی کے اختتامی سالوں میں مینجمنٹ کی تعلیم نے پیشہ ورانہ تعلیم میں اپنا نمایا مقام پیدا کرلیا اور اکیسویں صدی کی شروعات کے ساتھ ہی اس کی اہمیت و افادیت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا ہے۔'' 51

ہندوستان بھر میں بزنس مینجمنٹ کی تعلیم کے ادارے تقریباً سو سے زائد کھلے ہوئے ہیں،ان میں سے کچھ کے تعلیمی معیار اور روزگار کے مواقع بہت اچھے ہیں، انھوں نے اس کتاب میں بزنس مینجمنٹ کے چند اہم اداروں کے نام و پتہ بھی رقم کیے ہیں جہاں اس کی بہتر اور معیاری تعلیم کا معقول انتظام اور بندوبست موجود ہے اور یہاں کے فارغ التحصیل طلباء کا روزگار میں بہتر سے بہتر مواقع بھی ہیں،جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

1. '' آئی. آئی. ایم (I.I.M) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف بزنس مینجمنٹ کے ایم. بی. اے (M.B.A) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ادارہ ایم .بی. اے. کی تعلیم کے لیے ہندوستان بھر میں شہرت رکھتا ہے اور اس کی شاخیں احمد آباد، کولکتہ، بنگلور اور لکھنؤ میں قائم ہیں جس کی تربیتی

مدت دو سال ہے اس ادارے میں ایم بی اے میں داخلے کے لیے امیدوار کا سائنس، آرٹ، یا کامرس میں کسی بھی اسٹریم کا گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔'' 52؎

2. ''اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی نئی دہلی میں مینجمنٹ کی مراسلاتی اور فاصلاتی تعلیم کا معقول انتظام ہے جس میں داخلہ کے لیے لازمی اہلیت گریجوایشن اور تین سالہ سپروائزری تجربہ یا انٹرمیڈیٹ اور چھ سالہ سپروائزری تجربہ ضروری ہے۔'' 53؎

3. ''قومی کونسل برائے فروغ اردو (وزارت انسانی وسائل حکومت ہند) نئی دہلی بھی مینجمنٹ اور اطلاعاتی ٹیکنیکل تعلیم کا خصوصی مراسلاتی کورس چلاتی ہے جس میں اردو داں حضرات کو داخلے میں ترجیح حاصل ہے یہ کم خرچ والا کورس ہے اور ادارہ اپنے امیدواروں کے لیے خصوصی مراعات بھی فراہم کرتا ہے۔'' 54؎

ایک مضمون ''اردو کی بنیادی تعلیم۔آزادی کے بعد'' کے عنوان سے ان کی اس کتاب میں ملتا ہے۔ جس میں اردو تعلیم کی آئینی حیثیت کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہے۔ان کے مطابق ہندوستان کے دستور و دفعات جو اقلیتوں کو زبان و ادب اور مذہب سے متعلق میراث کی بقاء و تحفظ کی گارنٹی فراہم کرتے ہیں وہ صرف کاغذ تک ہی محدود ہیں، اس کا فائدہ اقلیتوں تک نہیں پہنچنے دیا جاتا۔نسیم اعظمی اس طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک اردو تعلیم کی آئینی حیثیت کا معاملہ ہے آئین کے آرٹیکل 350A میں مادری زبان میں تعلیمی سہولیات دی گئی ہیں جو محض کاغذی بن کر رہ گئی ہیں۔آئین کا حلف لے کر بننے والی سرکاری اقلیتوں اور اردو سے متعلق آئینی گارنٹی پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا جاتا اور نہ ہی اردو والے اس کی آئینی گارنٹی کو بروئے کار لانے کے لیے کسی بیداری کا ثبوت دیتے ہیں۔دستور کے دفعات 30-29 جو مذہبی اقلیتوں کو

مذہب و زبان وادب سے متعلق میراث کے تحفظ کی گارنٹی فراہم کرتی
ہیں ان کا بھی اقلیتوں کو فائدہ نہیں پہونچنے دیا جاتا جس سے اردو زبان
کی تعلیم آزادی کے بعد سے مسلسل تنزلی کا شکار ہوتی جارہی ہے۔'' 55

نسیم اعظمی کے مطابق نظام تعلیم اور نصاب تعلیم جو عربی مدارس میں صدیوں سے چلا آرہا ہے وہ عصری تقاضوں پر پورا نہیں اترتا اور ملک وقوم کے لیے بھی دردسر بنا ہوا ہے، ان کا کہنا ہے کہ نظام تعلیم اور ایسے جامد نصاب تعلیم کی مخالفت بہت دنوں سے ہوتی آرہی ہے پھر بھی اس کی طرف خواطر خواہ توجہ نہیں ہوئی۔ ان کے مطابق سرسید احمد خاں اور ڈپٹی مولوی نذیر احمد نے اپنے دور میں ہی اس کی مخالفت عملی طور پر بھی شروع کردی تھی، نسیم اعظمی اپنے مضمون ''اتر پردیش کے عربی مدارس کا نصاب تعلیم'' کے عنوان میں عربی مدارس کے قدیم نصاب میں تبدیلی کے خواہاں نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مولوی نذیر احمد اور سرسید احمد خاں کے حوالے دیتے ہوئے عصری ضرورتوں کے تحت نصاب میں تبدیلی کو ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

''یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر دور کا نصاب تعلیم اپنے عہد کی اقتصادی
ضرورتوں کے تحت ترتیب پاتا ہے لیکن عربی مدارس کا نصاب تعلیم ایسا
جامد نصاب ہے جو نہ عصری تقاضوں سے متاثر ہوا ہے اور نہ ان پر اثر
انداز ہوتا ہے اور یہ بات درس نظامیہ کے غیر متحرک اور مردہ ہونے کا
ثبوت ہے اور ایسا جامد نظام ملک وقوم کے لیے مضرت رساں تو ہوسکتا
ہے مفید اور کارآمد نہیں ہوسکتا اور یہی وجوہات ہیں سرسید احمد خاں اور
مولوی نذیر احمد نے مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم کی اپنے دور میں
زبردست مخالفت کی تھی اور آج بھی اس کی مخالفت اور اعتراضات کا
سلسلہ جاری ہے۔'' 56

نسیم اعظمی اپنی اس کتاب کے ہر مضمون کی ابتداء شعر سے کرتے ہیں جن میں زیادہ تر اشعار علامہ اقبال کے ہیں جو نسیم اعظمی کی سوچ کے آئینہ دار ہیں اور مضمون کا بھرپور تعارف بھی کراتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''صنف نازک اور اعلیٰ تعلیم'' کا مضمون علامہ اقبال کے اس شعر سے شروع ہوتا ہے جو بالکل برمحل اور

مضمون کی عکاسی کرتا معلوم ہوتا ہے۔

آغوش صدف جن کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نسیاں کبھی بنتا نہیں گوہر

اس کتاب میں موجودہ تعلیم کی خامیوں، اکیسویں صدی کے حالات میں عصری، بنیادی، ثانوی اوراعلیٰ تعلیم کی صورت حال، تعلیم نسواں کے مسائل، اردو تعلیم کے نت نئے چیلینجز، مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی اور اس کے تدارک کی صورتوں پر سیر حاصل بحث ملتی ہے جس سے نؔسیم اعظمی کے تعلیم سے متعلق افکار و خیالات اور مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق ان کے اندر موجود دردسوز اور اس کے تدارک کے لیے فکری اور عملی کوشش پر روشنی پڑتی ہے۔

2. تعلیمی جہات

تعلیم کے موضوع پر نؔسیم اعظمی کی یہ دوسری کتاب ہے۔ دراصل یہ کتاب عصری تعلیم میں مسلمانوں کی پس ماندگی دور کرنے کی غرض سے ان طلباء کے لیے تحریر کی گئی ہے جن کا تعلق اردو مادری زبان سے ہے۔ عموماً اردو مادری زبان کے طلباء اور نوجوانوں کی تعلیمی رہنمائی کا عملی کام بھی وہ کرتے رہے ہیں اور اسی مقصد سے انھوں نے اسے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں سید حامد آئی اے ایس سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر محبوب راہؔی، پروفیسر الطاف احمد اعظمی، مولانا محفوظ الرحمٰن مفتاحی اور ڈاکٹر شکیل احمد کے تاثرات بھی شامل ہیں، جن سے کتاب کی اہمیت وحیثیت کے پیش نظر کتاب اور کتاب کے مصنف کے اس کارنامے کو سراہا گیا ہے۔ مثلاً سید حامد تمام لائبریریوں میں اس کتاب کی ضرورت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہمیں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے یہ کتاب ان تمام لائبریریوں میں دستیاب ہونی چاہیے جہاں اردو کتابیں ذخیرہ میں شامل ہیں۔'' 57

اسی طرح پروفیسر عتیق احمد صدیقی جو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک عرصہ سے تعلیمی کارواں

کے ساتھ سرگرم عمل ہیں اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں وہ تمام مضامین شامل ہیں جو پہلی کتاب کے بعد لکھے گئے، لیکن اپنی اہمیت کے اعتبار سے مضامین پہلے سے زیادہ اہمیت کے مالک ہیں، پہلے صرف نظریات کے متعلق ہیں دوسرے عملی جدوجہد سے۔ان میں نوجوان نسل کے ان تمام صاحبان ہمت کی رہنمائی کی گئی ہے جو اپنی ذات کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔'' 58؎

ڈاکٹر محبوب راہیؔ جو اردو کے مشہور قلم کار، ادیب اور نقاد ہیں، وہ اس کتاب کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کے ملت کے تئیں سوز دروں اور جذبۂ خیر خواہی کے تحت تحریر کردہ اور یکجا کر کے ''تعلیمی جہات'' کی شکل میں پیش کردہ مجموعۂ مضامین کا خیر مقدم کرتا ہوں۔اس سعی خیر کو ایک مشن سے تعبیر کرتا ہوں لہذا خوابیدہ دردمندان قوم و ملت کی خدمت میں التماس گذار ہوں کہ وہ اپنی روایتی خوابیدگی، بے نیازی اور تغافل روی سے باز آئیں۔'' 59؎

ڈاکٹر شکیل احمد تعلیم سے رغبت اور کیریئر کے انتخاب کے سلسلے میں کتابوں کی کمی کا اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نسیم اعظمی نے یہ کتاب لکھی مثلاً وہ اس کتاب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''کتاب کے مخاطب طلباء، والدین، اساتذہ اور تعلیمی ادارے ہیں۔ کیریئر کے انتخاب اور تعلیم سے رغبت پیدا کرنے کے لیے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے یہ کتاب لکھی ہے۔اردو میں اس موضوع پر بہت کم مواد ملتا ہے اور کتابیں تو چند ہی ملتی ہیں اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے ''تعلیمی جہات'' کو ترتیب دیا ہے۔'' 60؎

یہ کتاب خاص طور پر طلباء کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی تھی، اس لیے ان سے تعلق رکھنے والے علوم

اورکورسوں کی اس میں نشاندہی کی گئی ہے مثلاً سول سروسیز کے مقابلہ جاتی امتحانات،آئی آئی ٹی،نیٹ،طب یونانی، عمرانیات، قانون، ملٹی میڈیا کورسیز، بایوٹکنالوجی،میڈیکل،انجینئرنگ،چارٹر اکاؤنسی، لائبریری، ایجوکیشن، طباعت واشاعت اورکمپیوٹرکورسیز وغیرہ خاص قابل ذکر ہیں۔جن پرتفصیل سے گفتگو کی گئی ہے ،ایسے سارے کورسیز کرانے والے اداروں کا تعارف بھی پیش کیا گیاہے،یہ تمام ایسے کورسیز ہیں جن میں ملت کے طلباءشریک ہوکراپنی اورقوم کی خدمت کرسکتے ہیں۔

اس کتاب کا ابتدائیہ بڑی اہمیت کا حامل ہےجس کاعنوان ہی ہے’’طلباءتعلیم اوراساتذہ‘‘۔تعلیمی عمل میں انھوں نے تین اہم بنیادی محور بتائے ہیں جن پرتمام ترتعلیمی عمل کاانحصارہوتاہےوہ لکھتے ہیں:

> ’’ہرقسم اور ہرنوعیت کے تعلیمی عمل میں تین اہم ترین بنیادی محور ہوتے ہیں جن پرتعلیمی عمل کاانحصارہوتاہے(۱) بچے یاطلباء(۲)تعلیم وطریقۂ تعلیم (۳)استادیامعلم اور یہ تینوں تعلیمی محورغیرجامد،متحرک اورتغیر پذیر ہوتے ہیں۔‘‘ 61

تعلیمی عمل میں جو بچے شامل ہوتے ہیں ان کی عمرنشو ونما اورجسمانی حیثیت کے اعتبارسے انھوں نے انھیں پانچ حصوں میں تقسیم کیاہے:

’’(الف)	ابتدائے بچپن	3	تا	6	سال کی عمر
(ب)	بچپن	6	تا	8	سال کی عمر
(ج)	انتہائے بچپن	8	تا	12	سال کی عمر
(د)	نوبلوغت	12	تا	15	سال کی عمر
(ر)	بلوغت	15	تا	18	سال کی عمر‘‘ 62

بچوں کی عمرکےلحاظ سےتقسیم کے بعداور ہرعمرکےبچوں کی نفسیات ان کے رجحانات اوردلچسپیوں کی وضاحت کی گئی ہے۔اس کے بعدتعلیم اورطریقۂ تعلیم اوراستادیامعلم کوبتایا گیاہےاورسماج میں تاجرملازم اور مدرس کی حیثیت کونمایاں طور پرپیش کیا گیا ہے۔اس کتاب میں جومضامین شامل ہیں وہ چونکہ طلباء کی رہنمائی کے لیے لکھے گئے ہیں اس لیےان کی اہمیت کااندازہ بھی ان کےعنوان سےلگایاجاسکتاہے۔

نسیم اعظمی کے مطابق سائنس اور حکمت صحیح معنوں میں مسلمانوں کا گمشدہ مال ہے، اس لیے جہاں کہیں بھی ہو اور جس کسی کے ہاتھ میں ہو اسے حاصل کرنے کی تگ ودو میں ذرا بھی جھجھک مسلمانوں کو کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ یہ سارے موجودہ محیر العقول سائنسی ترقی عہد وسطیٰ کے مسلم سائنسدانوں کی ہی مرہون منت ہے۔ ان کے نزدیک سائنسی مضامین کو بعض نااہل لوگ اسلام مخالف سمجھتے ہیں اور مدارس دینیہ سے تعلیم حاصل کیے ہوئے طلباء کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات کھٹکتی بھی رہتی ہے۔ ان کے خیال میں ایسے مضامین دین اور دنیا کی سربلندی حاصل کرنے کا سبب ہوتے ہیں، قرآن کی آیات بھی سائنسی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اس بات کی طرف مسلم طلباء کی توجہ مبذول کراتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

> ''یورپ کو موجودہ سائنسی اور تکنیکی ترقی دراصل مسلم سائنسدانوں کی ہی دین ہے۔ اس لیے سائنسی مضامین دراصل مسلم طلباء کے لیے قابل توجہ مضامین ہیں لہٰذا انہیں سائنسی مضامین کی تعلیم سے نہ تو گھبرانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسلام مخالف سمجھنے کی اور نہ ہی یہ مشکل ودشوار ہے بلکہ سائنسی مضامین دیگر تعلیمی مضامین سے کہیں زیادہ آسان، سہل اور دلچسپ ہوتے ہیں اور پھر مسلم طلباء کے لیے تو یہ مضامین دین ودنیا سے سربلندی کا سبب ہوتے ہیں کیوں کہ بعض محققین اسلام کے مطابق قرآن پاک میں ایسی تقریباً 755 آیات ہیں جو سائنسی تعلیم کی ترغیب دیتی ہیں۔'' 63

نسیم اعظمی نے اپنی اس کتاب میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ غریب اور متوسط گھرانے کے زیادہ تر طلباء اسکول کے زمانہ سے ہی مستقبل کے خواب کو شرمندۂ تعبیر بنانے کے لیے اپنی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے لگتے ہیں لیکن ان کے سامنے جب تعلیم کی مہنگی فیس کے بارے میں اطلاعات موصول ہوتی ہیں تو وہ اپنے تمام مستقبل کے خواب جو ڈاکٹر یا انجینیئر بننے کے سجائے ہوتے ہیں اسے پس پشت ڈال کر معمولی سے معمولی نوکری جس سے مل سکے ایسی تعلیم کو ترجیح دینے لگتے ہیں یا تعلیم سے اپنے آپ کو منقطع کر لیتے

ہیں، جب کہ ان کا ماننا ہے کہ ایسے بہت سے متبادل کورسیز موجود ہیں جوان کے ڈاکٹر یا انجینیئر بننے کے خواب کوکم خرچے میں شرمندۂ تعبیر کرا سکتے ہیں، ایسے ہی کورسیز کے بارے میں تسنیم اعظمی تمام طلباء کو باور کرانا چاہتے ہیں اوران کو ہدایت دیتے ہیں کہ مایوس ہونے یا تعلیم چھوڑنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے،'' پیرا میڈیکل کورسز'' ایسا کورسیز ہے جو علاج و معاجلت اور میڈیکل سے تعلق رکھتا ہے جو کم خرچہ میں بھی کیا جا سکتا ہے، انھوں نے اس کتاب میں ایسے پیرا میڈیکل کورسیز کا تعارف، داخلہ کے طریقے وشرائط اوراداروں کے ناموں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' پیرا میڈکل کورسز بھی علاج و معالجت اور میڈیکل سے تعلق رکھتے ہیں ،ان کورسوں کی تکمیل کر کے ہی طلباء اپنی محنت اور لگن کی بنیاد پر ڈاکٹر بننے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکتے ہیں اور ایک اچھے ڈاکٹر کی پوزیشن حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی خود اعتمادی اور تجربات کی بدولت اپنے مستقبل کو روشن و تابناک بنا سکتے ہیں۔'' 64؎

کتاب کے آخری صفحات میں انھوں نے طالب علموں کی دلچسپی کے لیے تعلیمی کوئز سے متعلق سوالات شامل کیے ہیں جو طلباء کے مقابلہ جاتی امتحانوں میں معاون ہوتے ہیں۔ مثلاً:

''سوال: ''تعلیم کی نہ تو ابتداء ہے اور نہ ہی انتہا'' یہ کہا تھا؟

(الف) راجا رام موہن رائے نے (ب) سر سید احمد خاں نے

(ج) مہاتما گاندھی نے (د) جواہر لعل نہرو نے'' 65؎

''سوال: 1947ء میں ہندوستان میں یونیورسٹیوں کی تعداد تھی؟

(الف)25 (ب)30

(ج)19 (د)29 '' 66؎

یہ کتاب طلباء کی رہنمائی کے پیش نظر اردو زبان میں اپنی نوعیت کی اہم کتاب ہے اس لیے کہ ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی کی گئی ہے، طلباء اساتذہ اور سرپرست اس سے مسلسل استفادہ کرر ہے ہیں اور اس بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہاں صرف ایک تاثر

ڈاکٹر حسن الدین احمد ریٹائرڈ آئی اے ایس (حیدر آباد) کا ذیل میں بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے:

''اگر چند ہی طلباء ان معلومات سے مستفید ہوں تو یہ نہ صرف چند خاندانوں کی زندگی سنوار سکتی ہے بلکہ ان سے بیداری کی شروعات ہوسکتی ہیں جس کے نتیجہ میں قابل لحاظ حد تک معاشرتی تبدیلی یقینی ہے۔'' 67؎

تعلیمی جہات، تعلیمی اعتبار سے اور بچوں کی رہنمائی کے اعتبار سے کارآمد کتاب ہے ہی کتاب کے بغور مطالعہ سے کتاب کے بین السطور میں مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی اور ملت کی زبوں حالی کے لیے ان کے دل میں جو درد ہے اور مسلمانوں کو اس سے باہر نکالنے کے لیے انھوں نے تعلیمی مسائل سے متعلق یہ کتاب تحریر کی ہے اسی لیے طلباء کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس طرح کی کئی کتابیں تصنیف کی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ نوجوانوں اور طلباء کی رہنمائی ہو سکے اور ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل پھر سے عزت و وقار کی زندگی بسر کر سکے۔

3. مولانا قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات

تعلیم کے موضوع پر نسیم اعظمی کی یہ تیسری کتاب ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنے آثر انصاری کی ایماء پر لکھی ہے جس کا تذکرہ ابتدائیہ میں رقم ہے۔ اس کتاب میں ان کے ابتدائیہ کے علاوہ مولانا زین العابدین اعظمی استاد جامعہ مظہر العلوم سہارنپور، مولانا عبداللہ معروفی شعبۂ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا نعمت اللہ صاحب استاد دارالعلوم دیوبند کے تاثرات بھی شامل ہیں۔ کتاب کے بارے میں مولانا زین العابدین الاعظمی (مرحوم) رقم طراز ہیں:

''جناب ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب کی اہم تخلیق ''مولانا قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات'' کے ساتھ موسوم ہیں لیکن یہ کتاب صرف تعلیمی تصورات پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ مولانا نانوتوی کے حسب و نسب تعلیم و تربیت اور تصنیفات و تالیفات اور عائلی زندگی کے حالات پر بھی ایک جامع کتاب ہے۔ گو حضرت نانوتویؒ کا تعلیمی تصور اس کتاب کا اصلی

موضوع ہے۔'' 68

مولانا عبداللہ معروفی صاحب اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''راقم السطور نے کتاب کا خاص باب ''تعلیمی تصورات'' کا مطالعہ کیا بلا تصنع عرض ہے کہ ہر عنوان، ہر پیرا گراف اپنے اندر جاذبیت رکھتا ہے اور دعوت فکر وعمل دیتا ہے۔'' 69

مولانا نعمت اللہ صاحب اپنے تصورات قلم بند کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

'' جناب ایم نسیم اعظمی صاحب نے مولانا قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات'' تصنیف کر کے حضرت نانوتویؒ کے علمی وعملی کارناموں کو ایک نئے انداز اور نئے زاویئے سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے، ان کی یہ کوشش لائق ستائش اور قابل قدر ہے۔'' 70

اس کتاب کا دیباچہ بڑا پر مغز ہے جس میں 1857ء کی پہلی جنگ آزادی اور اس کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی ان کی معاشی پستی اسلام پر عیسائی پادریوں، آریہ سماجوں اور شدھی سنگھٹنوں کی مسلمانوں اور اسلام پر یلغار اور اس کو اندلس بنا دینے کے منصوبہ کے نتیجہ کے طور پر مسلمانوں میں دو تحریکیں پیدا ہوئیں، ایک تحریک جو اسلام کے احیاء اور اسلام کے تحفظ کے لیے تھی اس کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ نسیم اعظمی نے اس کا نقطۂ آغاز قیام دارالعلوم دیوبند، تحریک دیوبند اور تحریک قیام مدارس بتایا ہے، ان کے مطابق اس کے روح رواں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے۔ دوسری تحریک جو مسلمانوں کو جدید عصری تعلیم سے لیس کر کے نئے حالات و ماحول میں معاشی اعتبار سے مضبوط بنا کر انھیں عزت و وقار کی زندگی عطا کرنے کے لیے کی اس کا نقطۂ آغاز نسیم اعظمی نے علی گڑھ کالج کا قیام اور تحریک علی گڑھ بتایا ہے جس کے سر خیل سر سید احمد خاں تھے۔

نسیم اعظمی نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں 1857ء کی پہلی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج دونوں کو مسلمانوں کے لیے اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے ان دونوں تحریکوں کو سراہا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''تحریک دیوبند وقیام مدارس کے علمبردار زیادہ تر علماء تھے جن کے پیش نظر ہندوستان کے غریب اور مفلوک الحال تھے جن میں نہ تو تعلیم کا رواج تھا نہ ہی ان کی زبوں حالی اور غربت وافلاس کے خاتمے کی کوئی سبیل دکھائی دیتی تھی۔۔۔۔۔۔

تحریک علی گڑھ کے علمبردار علماء اور دانشور دونوں تھے۔ ان کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے متوسط طبقے کی معاشی زبوں حالی کا خاتمہ تھا جس کے لیے جدید انگریزی کو ذریعہ بنا کر اوراس کے حصول سے انگریزی حکومت میں ملازمت اور دوسرے پیشہ ورانہ تعلیم کے ذریعہ معاشی پس ماندگی کی اصلاح کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو، معاشی، تعلیمی، اور معاشرتی حالت میں بہتری لا کر انھیں ہندوستان میں دوبارہ باوقار اور باعزت زندگی سے ہمکنار کرنا تھا جو 1857ء کی عوامی بغاوت میں یکسر تباہ وبرباد ہوگئے تھے۔'' 71

اس کتاب میں نسیم اعظمی نے مولانا کے تصورات کو ثابت کرنے سے پہلے پہلا باب ان کی شخصیت کے تعارف میں لکھا ہے اور اس میں مولانا قاسم نانوتویؒ کی پوری روداد زندگی کا احاطہ کیا ہے، دوسرا باب نگارشات وتالیفات پر مشتمل ہے جس میں مولانا کی ہر تصنیف کا پس منظر اور موضوع تصنیف کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں مولانا کے عہد و ماحول کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں ''تحریک دیوبند''، انگریزوں، عیسائیوں کی تخریب کاریوں، فتنہ انگیزوں کی تفصیل، تحریک دارالعلوم اور پھر پورے ہندوستان میں قیام مدارس کی تحریک کی تفصیلات جامع انداز میں بیان ہوئی ہیں۔ آخری باب میں مولانا کے تعلیمی تصورات وخیالات پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''مولانا کے تعلیمی تصور میں اس بات کو خاص اہمیت حاصل تھی کہ ہندوستان میں مسلم نوجوانوں کی ایک ایسی تعلیم یافتہ نسل تیار کی جائے جو ٹھوس اسلامی فکر رکھتی ہو اور دین اس کے مزاج وذہن میں رچا بسا رہے تاکہ کسی قسم کی اسلامی مخالف یلغار انہیں ٹس سے مس نہ کر سکیں چنانچہ

انہوں نے اپنے دینی نصاب میں جو بعض عقلی علوم شامل کیے تھے ان کا
مقصد بھی بطور خاص اسلام کا احیاء ہی تھا۔'' 72ؔ

آ گے مولانا کے تعلیمی موقف پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے خیالات کی وضاحت پیش کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''مولانا نانوتوی نہ تو کبھی جدید اور عصری تعلیم کے مخالف رہے ہیں اور
نہ ہی اس تعلیم کو اسلام کے خلاف ناجائز کہا ہے ہاں وہ یہ ضرور چاہتے
تھے کہ دارالعلوم جن مخصوص مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے اس میں
جدید عصری تعلیم کی پیوند کاری کر کے نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم کا مصداق
نہ بنایا جائے۔'' 73ؔ

اس کتاب میں نسیم اعظمی نے دارالعلوم دیوبند کے قیام کے مقاصد، طریقۂ تعلیم، نظام تعلیم، تربیت رشتۂ شاگرد و استادی وغیرہ پر بھی بھرپور روشنی دالی ہے، انھوں نے مختلف دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا قیام جس مقصد سے کیا گیا تھا اس کی تکمیل کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے تھے وہ انتہائی مناسب اور کارآمد تھے۔

نسیم اعظمی نے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے علمی، تعلیمی اور تحریکی کام کی عظمت کو پہچانا اور اپنی علمی و فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کتاب تصنیف کی ہے جو ضخامت کے لحاظ سے بہت زیادہ ضخیم تو نہیں البتہ اس کا مواد انسائیکلو پیڈیائی حیثیت کا حامل ہے۔

4. تعلیم اور تعلیمی افکار

نسیم اعظمی کی یہ چوتھی کتاب ہے جو تعلیمی موضوع پر ہے۔ دراصل یہ ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو کے مشہور و باوقار رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں یا مختلف علمی و ادبی سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو وغیرہ پر نشر ہو چکے ہیں۔

یہ کتاب 2011ء میں شائع ہوئی، اس کتاب میں دو ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ پہلے باب میں مشاہیر کے تعلیمی نقطۂ نظر، ان کی تعلیمی خدمات اور تعلیمی کارناموں پر محیط مضامین شامل ہیں۔ اس باب میں کل

سولہ مضامین شامل ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

1. سرسید احمد خاں کے تعلیمی تصورات
2. بدرالدین طیب جی۔ تعلیمی خدمات اور نظریات
3. علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی کارنامے اور ان کی عصری معنویت
4. مولانا ابوالکلام آزادؔ۔ ایک اہم تعلیمی مفکر
5. ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی نظریات اور کارنامے
6. ہندوستان میں تعلیم نسواں کی روایت اور ڈاکٹر شیخ عبداللہ
7. مولانا الطاف حسین حالیؔ کے تعلیمی نظریات
8. مولانا الطاف حسین حالیؔ اور تعلیم نسواں
9. اکبرالہ آبادی اور جدید مغربی تعلیم
10. اکبرالہ آبادی اور مغربی سائنس وحکمت
11. اکبرالہ آبادی اور تعلیم نسواں
12. مولوی نذیر احمد کے تعلیمی افکار
13. مولوی نذیر احمد اور تعلیم نسواں
14. میر فتح اللہ شیرازی کے سائنسی اور تعلیمی کارنامے
15. محمود گاواں اور اس کا عظیم الشان مدرسہ وکتب خانہ
16. مولانا ضیاءالدین اصلاحی کے تعلیمی افکار

دوسرے باب میں فاصلاتی تعلیم اور تعلیم سے متعلق دیگر تاریخی اور عصری موضوعات پر مختلف مضامین شامل ہیں، جس کی تعداد چودہ ہے۔ درج ذیل ان مضامین کے عنوانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

1. فاصلاتی تعلیم۔ آغاز وارتقاء

2. فاصلاتی طرز تعلیم۔ نیشنل اوپن اسکول اور اردو
3. فاصلاتی تعلیم اور ان کے اہم ادارے
4. سائنس ٹکنالوجی اور اسلام
5. تعلیم طریقۂ تعلیم اور اسلام
6. عہد سکندری کے دو مایہ استاد
7. شیراز ہند جونپور کی تعلیمی روایات اور چلتا پھرتا مدرسہ
8. اسلامی نصاب تعلیم کے بنیادی عناصر
9. مینجمنٹ اپٹی ٹیوٹ ٹیسٹ (میٹ)
10. تعلیم ہی قوموں کی ترقی کی بنیاد ہے
11. اتر پردیش میں اردو کی ابتدائی تعلیم مسائل اور ہماری ذمہ داریاں
12. اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں اردو درس وتدریس کی موجودہ صورت حال
13. کیٹ اور میٹ کے علاوہ برنس اسکول میں داخلے کی راستے
14. علامہ رضی الدین حسن الصمنانی کا علمی مرتبہ

یہ تمام موضوعات علمی و تعلیمی نوعیت کے ہیں اور تعلیمی مقاصد ونقطہ نظر کے تحت لکھے گئے ہیں۔

اس کتاب کے ابتدائیہ میں تعلیم سے متعلق تسیم اعظمی کے نظریہ کی وضاحت ہوتی ہے، انھوں نے ابتدائیہ میں تعلیم کی اہمیت وافادیت کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے، ان کا ماننا ہے کہ تعلیم کے ہی ذریعہ کامرانی وفتح مندی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان کے خیال میں اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے اپنے ابتدائیہ میں بڑی اچھی مثال کے ذریعہ نظام تعلیم، نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کو لچکدار اور اصلاح وتغیر پسند ہونے کو ضروری خیال کیا ہے اور اس میں تبدیلی

اوراصلاح کے عمل کو بتدریج جاری رہنے کوبھی ضروری تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''کامرانی وفتح مندی اوراپنے مخالفین کوزیر کرنے کے لیے تعلیم سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں ہوتا ہے۔اس لیے فعال، کارآمداور بہتر تعلیم وقت و حالات اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہمیشہ تبدیلی وتغیر کے عمل سے ہمکنار رہتی ہے۔جس تعلیم میں تغیر وتبدل کا عمل، نئی جہتوں کی تلاش اورنئی دریافتوں کی کوشش اور روانی و بہاؤ کی کیفیت نہیں ہوتی وہ تعلیم ٹھہرے ہوئے اس پانی کی طرح ہے جوجلدسڑانداورعفونت پیدا کرنے والا ہے اورمختلف بیماریاں پیدا کرنے کا سبب بننے والا ہے اس لیے نظام تعلیم،نصاب تعلیم اورطریقۂ تعلیم لچک داراوراصلاح وتغیر پسند ہونا چاہیے،اور اس میں تبدیلی و اصلاح کا عمل بتدریج جاری رہنا چاہیے۔''74

''تعلیم اور تعلیمی افکار'' کا پہلا باب بہت اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس میں سرسید کی تعلیمی کاوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے،خصوصاً ایم۔اے۔اوکالج کے قیام اور 1920ء میں اسے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے، جوآج مسلمانوں کے لیے امتیازۂ نور کا کام کرتی ہے۔آگے انھوں نے بتایا کہ علامہ شبلی نعمانی کی تعلیم سے رغبت کی وجہ سے،شبلی نیشنل کالج اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کا قیام عمل میں آیا۔مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ہندوستان کے پہلے وزیرتعلیم ہوئے اور تعلیم اورسیاست سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔انھیں کے دوروزیرتعلیم میں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اور دیگر اداروں کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ان کے مطابق ڈاکٹر ذاکرحسین کے تعلیمی افکار کا نمونہ ان کی تعلیم سے بے پناہ دلچسپی کا شاہد ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلری کے دوران ان کی مثبت تعلیمی کاوشیں ان کی رہین منت ہیں۔ان کے خیال میں باقی تمام اکابرین کی تعلیم سے دلچسپی نے مسلمانوں میں علمی بیداری پیدا کی۔

نسیم اعظمی نے سرسید احمد خاں کی تعلیمی فکر اور ان کے تعلیمی مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ سرسید کے ذہن میں ہمیشہ مسلمانوں کے لیے انگریزی تعلیم اور سائنسی تعلیم کے حصول کا تصور گردش کرتا رہتا تھا،ان کی جس قسم کی جدید تعلیم کے تئیں سوچ تھی اور وہ اس کے لیے سرگرم عمل بھی تھے اس میں نہ تو مذہب و عقیدہ اور نہ ہی تہذیب و معاشرت پر کسی قسم کی آنچ آنے کا اندیشہ تھا، وہ ہمیشہ اس کے تحفظ و بقاء چاہتے تھے۔ ان کے مطابق سرسید لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے کیوں حمایتی تھے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید احمد خاں کے ذہن میں مسلمانوں کے لیے جس جدید انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس کے حصول کا تصور تھا وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر تھا اور وہ مسلمانوں کے لیے جس قسم کی جدید تعلیم کے لیے سرگرم عمل تھے اس میں کسی بھی حال میں مذہب، عقیدہ اور تہذیب و معاشرت کو داؤ پر لگائے بغیر بلکہ ان کے تحفظ و بقاء کے ساتھ دلانے کے ہمنوا تھے۔ وہ نہ یکسر مشرق بیزار تھے اور نہ ہی مغرب پسند وہ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسیوں کے محض اس لیے حمایتی تھے کہ مغربی تعلیم و سائنس سے ہندوستانیوں کو فائدہ پہنچنے والا تھا لیکن لارڈ میکالے کی طرح وہ ہندوستانیوں کو محض سند یافتہ بنانے کے قائل نہیں تھے بلکہ لارڈ میکالے کی فکر کے برخلاف مسلم نوجوانوں کا ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں ذہنی و فکری بیداری ہو، اپنے حقوق کی جرات ہو، قناعت پسندی اور توہم پرستی کے بجائے حقائق پسندی ہو اور وقت و حالات کے قدموں کی آہٹ پہچاننے کی صلاحیت کا حامل ہو اور نسلاً بعد نسلاً علم و فن اور ہنر و حرفت کے چراغ سے چراغ جلانے کی روایت قائم کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔'' 75؎

نسیم اعظمی کے مطابق سرسید کے تعلیمی تصورات میں ان کے بنائے ہوئے تعلیمی نصاب کو بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جسے انھوں نے اپنے مدرسۃ العلوم کے قیام کے بعد ترتیب دیا تھا، ان کے نزدیک

سرسید کے ترتیب دیے ہوئے نصاب میں ان کی خود کی تعلیمی فکراور تربیتی سوچ بھی نمایاں طور پر شامل تھی۔اس نصاب کے ذریعہ تعلیم وتربیت کی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں۔نسیم اعظمی نے سرسید کے مرتب کردہ نصاب تعلیم کو پانچ زمروں میں تقسیم کیا ہے:

''علم ادب۔: زبان دانی وانشاء پردازی،اردو، فارسی،عربی،انگریزی اور لاطینی زبان و ادب کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، اخلاقیات،مینٹل سائنس،یعنی قوائے انسانی،منطق،فلسفہ اورسیاسیات۔

علم دینیات:۔فقہ،اصول فقہ،حدیث،اصول حدیث،تفسیر،سیرت اور عقائد۔

علم ریاضیات:۔علم حساب، جبر ومقابلہ،علم ہندسہ،فروعات اورعلم اعلا ریاضی۔

علم طبیعات:۔علم سکون،علم حرکت،علم آب،علم ہوا،علم مناظر،علم برق، علم ہیئت،علم آواز،علم حرارت،اورنیچرل فلاسفی۔

علوم خاص:۔ انجنیئر نگ، علم حیوانات، اٹانومی (تشریح)، باٹنی (نباتات)، جیالوجی (طبقات الارض)،منرالوجی (علم جمادات)اور کمیسٹری (کیمیا)۔'' 76؎

سرسید کے مرتب کردہ مذکورہ نصاب تعلیم کے بارے میں نسیم اعظمی کا خیال ہے کہ یہ اپنے دور کا انتہائی کارآمداور ترقی یافتہ نصاب تھا،اس میں سرسید کی دوررس نگاہ مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال اور آئندہ اس کے ہونے والے فائدے کی سوچ تھی۔چنانچہ اس بارے میں وہ رقم طراز ہیں:

''مضامین کا مذکورہ بالاکمبی نیشن جس زمانے میں ترتیب دیا گیا تھا انتہائی ایڈوانس اور ترقی یافتہ تھا جس میں تعلیم اور درس و تدریس کی ماہرانہ صلاحیت جھلکتی ہے۔'' 77؎

بدرالدین طیب جی کا شمار اپنے دور کے ایک اہم دانشور اور مسلم نمائندہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے، انھوں نے بھی مسلمانوں کی ہرطرح کی پس ماندگی دور کرنے کا واحد نسخہ تعلیم ہی تجویز کیا ہے۔بدرالدین طیب

جی پہلے ہندوستانی مسلمان سالسٹر ہیں، انھوں نے اپنے کیریئر کی شروعات ایک کامیاب وکیل ماہر قانون کی حیثیت سے کیا اور جلد ہی ایک اہم مسلم دانشور تعلیمی مفکر اور بمبئی ہائی کورٹ کے جج ہو گئے۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے مسلمان صدر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بمبئی میں انجمن اسلام نام کی انجمن قائم کی جہاں بچوں کی کنڈر گارٹن (کے۔جی) کے اسکول کے قیام کی شروعات کی اور دیکھتے دیکھتے یہ انجمن پورے مہاراشٹرا میں مختلف اسکول و کالج قائم کر کے مسلمانوں کی ایک تعلیمی تنظیم بن گئی۔ چنانچہ اس انجمن کا تعارف کراتے ہوئے اس کی تعلیمی کارکردگی کے بارے میں نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

> ''انجمن اسلام'' کے مختلف کالجوں اور اداروں میں سائنس، کامرس، انجنیئر نگ ،ٹکنالوجی، طب اور مختلف مضامین سے فارمل اور فاصلاتی تعلیم کا بھی بہترین انتظام کیا جاتا ہے اس کے علاوہ یتیم خانے اور کوچنگ سینٹر سمیت دو درجن خیراتی ٹرسٹوں کا بھی انجمن اہتمام کرتی ہے اور اوقاف کی تمام آمدنی ملت کے تعلیمی فلاحی کاموں میں صرف کرتی ہے جس میں مصروف عمل یکے بعد دیگرے آنے والے اس کے مختلف سربراہ وارا کین اسے مسلسل ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں لگے رہے ہیں جس کے آغاز میں اس کے بانیان بدرالدین اوران کے رفقاء نے ایسی ایسی بنیادیں فراہم کر دی تھیں اور ملت کی جڑ سے ایسی آبیاری کی روایت قائم کر دی تھیں جو آج بھی دائم و قائم ہے اور آج انجمن کے متعدد تعلیمی وفنی اداروں میں تقریباً 75000 طلبا و طالبات تعلیم کے حصول میں مصروف عمل ہیں جس میں خواتین کی تعداد بھی تقریباً ایک تہائی ہے۔ انجمن کے سبھی اداروں کے دروازے بلا امتیاز مذہب وملت سب کے لیے کھلے ہیں جو اپنے جمہوری اور سیکولر کردار کے لیے بھی ملک گیر شہرت رکھتے ہیں۔'' 78

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور فکر میں بڑی ہمہ گیری اور وسعت پسندی تھی، وہ سچے پکے مسلمان ہونے کے ساتھ وہ محبّ وطن بھی تھے۔ ان کے اندر تعصب، تنگ نظری اور فرقہ واریت کے نام

کی چیز بالکل نہ تھی، نسیم اعظمی کے مطابق مولانا آزاد قول وعمل کے سچے اور اخوت وانسانی اتحاد کا نمونہ تھے، وہ ساری انسانیت کی فلاح کے ہم نوا تھے جو مذہب اسلام کا مطمع نظر آ رہا ہے اور انسانی فکر کی ان رفعتوں کے علمبردار تھے جہاں مذہب وتہذیب اور زبان وجغرافیائی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور ساری دنیا محبت ویکجہتی کا نمونہ بن جاتی ہے۔ نسیم اعظمی نے مولانا کی ''رباعیات سرمد'' کے مقدمہ کا اقتباس پیش کر کے مولانا آزاد کے مندرجہ بالا اوصاف کی عکاسی کی ہے:

> ''علماء نے سرمدؔ سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے بموجب صرف لاالا پڑھا کہ جملۂ نفی ہے۔ اس پر علماء نے شور مچایا تو کہا کہ ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں اثبات تک نہیں پہنچا اگر اللہ کہوں گا تو جھوٹ ہوگا اور جو دل میں نہ ہو وہ زبان پر کیسے آئے۔ علماء نے کہا کہ ایسا کہنا کفر صریح ہے۔ اگر توبہ نہ کرے تو مستحق قتل ہے۔ یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمدؔ اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر وایمان کی بحثیں سنائی جائیں۔ وہ قتل وخوں کے احکام سے مرعوب ہو۔ یہ کفر ساز تو اپنے مدرسہ ومسجد کی صف میں کھڑے ہو کر سوچتے تھے کہ کس کی کرسی کتنی اونچی ہے اور وہ اس مینارۂ نور پر تھا جہاں دیوار کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں اور کفر وایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں۔'' 79

نسیم اعظمی نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ہندوستان کے ایک قابل فخر ماہر تعلیم، قومی رہنما، مثالی منتظم ہونے کے ساتھ فطرتاً لائق وفائق ومشفق ومربی استاد بھی تھے۔ انھیں اردو زبان وادب سے خاص لگاؤ تھا جس کے نتیجہ میں ان کے گہربار قلم نے مجاہد آزادی کو حوصلہ اور ملک کے تعلیمی ترقی کو جلا بخشی۔ ان کے مطابق وہ ہندوستان کے پہلے مسلم نائب صدر جمہوریہ پھر صدر جمہوریہ کے عہدہ پر بھی فائز ہوئے۔ 13 ر مئی 1967ء میں ملک کے صدر جمہوریہ چن لیے گئے تو انھوں نے قوم کو مخاطب ہو کر جو تقریر کی تھی اس کا اقتباس نسیم اعظمی دیتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی نظریات اور کارنامے پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''ڈاکٹر ذاکر حسین کا شمار جدید ہندوستان کے ان مایہ ناز معماروں میں ہوتا ہے جن پر ملک وقوم کو بجا طور پر فخر ہے اور جنہوں نے تعلیم کو ہر قسم کی تعمیر وترقی کا ذریعہ تصور کرتے ہوئے اس کی ہمہ جہت ترقی واشاعت کے لیے زندگی بھر عملی کوشش کیں اور یہی وجہ تھی کہ مہاتما گاندھی نے آزاد اور جدید ہندوستان میں بنیادی تعلیم کے اہم ترین اور مشکل ترین کام کی تکمیل کے لیے ذاکر صاحب کا ہی انتخاب کیا تھا جو اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ گاندھی جی کو ذاکر صاحب کی تعلیمی فکر طریقئہ کار پر پورا اعتماد واتفاق بھی تھا۔'' 80

آج اکیسویں صدی کا دور نراج اور افراتفری کا ہے اور زمانہ تیز رفتاری کا ہے۔ایسے حالات میں فاصلاتی طرز تعلیم اور نظام تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ہمارا روایتی طریقۂ تعلیم بقول ''ایبرٹ ریمر'' کے مطابق ختم ہو چکا ہے۔اس لیے اب ہمیں تعلیم کے نئے ذرائع کی تلاش کرنی ہوگی۔ نئے طریقئہ تعلیم یعنی فاصلاتی طرز تعلیم کا ارتقائی جائزہ لیتے ہوئے نسیم اعظمی نے بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں:

''کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ فاصلاتی تعلیم کی بنیاد مشہور مفکر پلوٹو اور ''سینٹ پال'' کی تحریروں کے ذریعے پڑی ہے اور باقاعدہ مراسلاتی تعلیم کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ اسحاق پیٹ مین نے اپنے ''شارٹ ہینڈ کورس'' کے ذریعے مراسلاتی تعلیم کا آغاز 1840ء میں کیا تھا۔بعض تحقیقات کے مطابق اس تعلیمی نظام کا آغاز اٹھارویں صدی میں ہی ہو چکا تھا۔بروج ہولم برگ (BROJ HOLMBERG) کی کتاب اے سینشیل ڈسٹنس ایجوکیشن (ESSENTIAL DISTANCE EDUCATION) کے مطابق انگریزی رسالہ ''بوسٹس گزٹ'' میں مؤرخہ 20/مارچ 1728ء کو ایک اشتہار دیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ایک استاد کیلب فلپس ہفتہ میں چند اسباق ترسیل کیا کریں

گے۔اسی طرح کی ایک بات سویڈن کے ایک اشتہار میں بھی کہی گئی تھی
جو 1833ء میں شائع ہوا تھا۔اسی طرح کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں پہلا
مراسلاتی تعلیم کا نظام 1873ء میں شروع ہوا تھا جس سے 1890ء
میں یونیورسٹی کے مراسلاتی کورس کی بنیاد پڑی۔یورپ میں 1894ء
میں اس نظام تعلیم کی شروعات ہوئی تھی لیکن یورپ میں مختلف مراحل
سے گزرنے کے بعد باقاعدہ اوپن تعلیمی اداروں یا اوپن یونیورسٹی کا
آغاز 1958ء میں ہوا جسے 1969ء میں برطانوی سرکار نے اسے
تسلیم کرتے ہوئے باقاعدہ منظوری دی اور اس نئے طرز تعلیم کو رواج
دینے اور اسے عام کرنے پر زور دیا۔1971ء میں اس کے لیے
باقاعدہ طور پر عملی اقدامات کیے گئے اور اس طرز تعلیم سے دور دراز کے
افتادہ علاقوں کے لوگوں کے لیے فاصلاتی طرز تعلیم کی سہولیات مہیا کی
گئیں اور چند سال کے اندر نہ صرف یورپ و امریکہ بلکہ ساری دنیا میں
یہ طرز تعلیم مقبولیت کے ساتھ پھیلنے لگا اور اب تو صرف یونیورسٹی آف
لندن دنیا کے 160 رملکوں میں تقریباً تیس لاکھ طالب علموں کو مختلف
گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورسوں کی تعلیم دینے میں مصروف عمل
ہے اور خود ہمارے ملک ہندوستان کے تقریباً دس بڑے شہروں میں اس
کے خارجی تعلیمی پروگرام کے تحت اسٹڈی سینٹر قائم ہیں۔'' 81

اس طرح نسیم اعظمی کی تصنیف ''تعلیم اور تعلیمی افکار'' سے ہمیں نہ صرف فاصلاتی تعلیم کے آغاز و ارتقاء سے متعلق معلومات حاصل ہوئی ہیں بلکہ ہمیں ہمارے رہنماؤں کے تعلیمی تصورات ونظریات سے بخوبی روشناسی بھی حاصل ہوتی ہے اور ہمارے نصاب تعلیم اور درس وتدریس کی موجودہ صورت حال پر بھی خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ ہمارے تعلیمی مسائل ومباحث کو بھی اجاگر کر کے اس سے نبرد آزما ہونے کی راہ بھی ہموار کرتی ہے۔

5. تعلیمی نکات

تعلیم کے موضوع پر نسیم اعظمی کی یہ پانچویں تصنیف ہے جو عصری تعلیم کے مختلف موضوعات، اوراس کے حصول کے طورطریقوں پرمبنی ہے۔اس کتاب میں ڈاکٹر حسن الدین احمد (آئی اے ایس ریٹائر)، پروفیسر خورشید احمد نعمانی (ممبئی) کے تاثرات کے ساتھ مصنف کتاب کا ابتدائیہ بھی شامل ہے۔ڈاکٹر حسن الدین احمد اپنے تاثراتی مضمون ''حرف تحسین'' میں اس کی اشاعت سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے اس کتاب کو حصول روزگار اور کیریئر گائڈنس سے متعلق مفید معلوماتی کتاب قرار دیا ہے اوراس موضوع پر ان کی مضبوط گرفت کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ سال نسیم اعظمی سے شخصی ملاقات کے دوران راقم الحروف نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ''تعلیمی جہات'' کے طرز کی کتاب لکھنی چاہیے ملت کے نوجوانوں اور ان کے والدین کے لیے ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے۔ جب ان کا خط آیا کہ انھوں نے اس اہم موضوع پر ''تعلیمی نکات'' کے عنوان پر کتاب مرتب کی ہے۔ جو 57 مضامین پر مشتمل ہے اور مضامین کی فہرست بھی روانہ کی۔اب جو مضامین پر نظر ڈالی تو ''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست'' کا معاملہ ہے۔ ایسا پر مسرت احساس ہوا کہ مجھے جس تصنیف کا انتظار تھا یہ وہی تو ہے۔
>
> زیر نظر کتاب حصول روزگار کے سلسلہ میں مفید معلومات کا سمندر ہے۔ لائق مصنف نے کیریر گائڈنس سے خود کو وابستہ کرلیا ہے اوراس موضوع پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔'' 82

تعلیم جیسے اہم موضوع اور مسائل پر اردو میں لکھنے والوں کا فقدان ہے۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے سلسلے میں اہم کتاب مانی گئی ہے۔اس کتاب میں شامل پروفیسر خورشید احمد کے مضمون ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اور تعلیمی نکات'' (جو شامل کتاب ہے) میں انھوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے تعلیم کے موضوع اور مسائل پر سنجیدہ لکھنے والوں میں ان کا شمار کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''تعلیم کے موضوع اور مسائل پر آج ہمارے حلقہ میں سنجیدہ لکھنے والوں کی بہت کمی ہے اس کتاب سے مصنف کی تعلیمی و علمی صلاحیت، دیدہ ریزی، فکری و علمی بصیرت، عرفان و آگہی کا پورا پورا ادراک ہوتا ہے۔ ان موضوعات کو دیکھ کر بقول ع ''قیاس کن زگلستان من بہار مرا'' خوشی کی بات ہے کہ تعلیم سے متعلق مفید نفوس قدسیہ میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بھی شامل ہیں۔'' 83

پروفیسر خورشید احمد کے مضمون کے بعد نسیم اعظمی کا ابتدائیہ ہے۔ نسیم اعظمی اپنے ابتدائیہ میں کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پیش نظر کتاب ''تعلیمی نکات'' میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن کا تعلق عصری تعلیم کے مختلف موضوعات، مضامین، تعارف ، اہمیت و افادیت اور آج کے زمانے میں ان حصول کے طور طریقوں، ذرائع و رسائل اور شرائط وغیرہ سے ہے۔'' 84

اس کتاب کو دو ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ستاون پیشہ ورانہ عنوانات پر مشتمل ہے۔ اس میں جدید، عصری، تکنیکی اور پروفیشنل تعلیم ، کورسز، کمپٹشنوں، مقابلہ جاتی امتحانوں، ایجوکیشنل اینڈ کیریئر پلاننگ اور اردو تعلیم کے ملک گیر منظر نامہ وغیرہ کے موضوع پر مشتمل ہے۔ جس میں دو مضامین بطور خاص ہیں، ایک طلباء کی تعلیم اور کیریئر پلاننگ سے متعلق ہے اور دوسرا ملک گیر پیمانہ پر اردو تعلیم کے موضوع سے متعلق ہے، جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اردو آبادی، اردو میڈیم تعلیمی اداروں اور اردو تعلیم کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اسکولوں، کالجوں، اساتذہ اور طلباء کے مستند اعداد و شمار کی بنیاد پر مدلل انداز میں اردو تعلیم کی صحیح صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اردو تعلیم کا ملک گیر سطح پر آئینہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

ہائی اسکول کے دوران ہی طلباء و طالبات پس و پیش میں پڑ جاتے ہیں کہ کس سبجیکٹ کا انتخاب

کیا جائے تاکہ مستقبل میں اس کے ذریعہ اپنے کیریر کو تابناک بنایا جا سکے، یہ مسئلہ تقریباً سبھوں کے ساتھ درپیش آتا ہے۔ایسے طلباء و طالبات کے پاس کم عقلی ہوتی ہے اور انھیں مستقبل میں تعلیم کی صحیح رہنمائی کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا ہے، نسیم اعظمی ایسے تمام طلباء کو جو کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں انھیں مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بعض طلباء ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ میں اوّل یا اچھے نمبروں سے کامیابی کے باوجود بھی آگے کی سمت یا منزل کا تعین یا اپنے ٹارگیٹ کے انتخاب میں گومگو اور تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں اور غلط فیصلہ لے لیتے ہیں جس سے ان کے مستقبل پر منفی اثرات پڑ جاتے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں وہ کامیابی حاصل نہیں کر پاتے جس کے وہ اہل یا حقدار ہوتے ہیں ۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ بورڈ کے امتحان کے بعد طلباء بے فکر ہو کر نہ بیٹھیں بلکہ جو بھی وقت ملے اسے اپنے آگے کی صحیح اور مناسب تعلیم یا کورس کے بارے میں پوری سنجیدگی سے غور وفکر، صلاح و مشورہ، کوچنگ سینٹروں، کونسلروں اور ماہر اساتذہ سے رابطہ، انٹرنیٹ پر موجود معلومات اور اخبارات و رسائل میں شائع شدہ ایسے مضامین و مواد کے مطالعہ میں سرگرم عمل رہیں ۔جو ان کے مستقبل کی تعلیم، کورس اور کیریئر کے تعین میں معاون ہو اور انہیں آئندہ کی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے میں مددگار رہوں۔'' 85

اردو برصغیر کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے، اور ہندوستان کے اسیّ فیصد مسلمانوں کی مادری زبان بھی اردو ہی ہے صرف یہی نہیں بلکہ یہاں کے پانچ فیصد غیر مسلم لوگ بھی روزمرہ کی عملی زندگی میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔اس کے باوجود اسے تعصب کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔حد تو اب یہ ہوگئی ہے کہ حکومت کی طرف سے بھی اسے ملکی پیمانے پر اس کے احیاء پر شکنجہ کسا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں جب سے تحریک آزادی کی گونج شروع ہوتی ہے اس وقت سے اردو زبان کا رول دیگر زبانوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ رہا ہے۔اس زبان نے ایسے ایسے ادیب اور شعراء پیدا کیے جن کی تخلیقات ونگارشات سے تحریک آزادی کو بہت زیادہ جلا ملی۔ ہندوستان کی آزادی سے متعلق جتنا ادبی وشعری سرمایہ اس زبان میں موجود ہے یہاں کی کسی اور زبان میں نہیں ہے۔اس کے باوجود اسے تعصب کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔اس زبان کو ملک کی تقریباً دیگر طاقتیں کسی نہ کسی طرح سے برباد کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور ان کے ساتھ اردو داں طبقہ بھی اسے نقصان پہنچانے میں پیش پیش ہیں۔اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نسیم اعظمی ان حالات سے اچھی طرح واقف ہیں اور وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کو زیادہ نقصان پہنچانے والے خود اردو والے ہیں۔چنانچہ ایسے لوگوں سے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان اور تعلیم کو جتنا غیروں نے نقصان پہنچایا اس سے کہیں زیادہ خود اردو والوں نے پہنچایا ہے۔اردو زبان کا خوشحال اور متوسط طبقہ (خصوصاً اتر پردیش) نے اپنی خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ مصلحت اندیشوں کے باعث اپنے بچوں کو اردو پڑھانے سے باز رکھا اور انہیں اپنے ہی تہذیبی اقدار سے محروم رکھنے کے مجرمانہ عمل سے جس قدر نقصانات پہنچائے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔اسی طرح اردو کے نام پر بڑے بڑے عہدے حاصل کرنے والوں اور اسکول وکالج اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور اسی قسم کے دیگر لوگوں نے بھی اپنے بچوں کو اردو نہ پڑھا کر اپنی ہی زبان کے ساتھ منافقانہ سلوک کا برتاؤ کیا ہے اس سے اس زبان کو جو نا قابل تلافی نقصانات ہوئے ہیں وہ نا گفتہ بہ ہیں۔'' 86

مختصراً یہ کہ اس باب میں طلباء کے لیے کیریر گائڈ کی حیثیت سے رہنمائی دردمندانہ انداز سے کی گئی ہے،انھیں قدر تفصیل سے یہ بتایا گیا کہ زندگی کے مختلف مراحل اور میدانوں میں کس طرح سے ترقی سے

ہمکنار ہوا جا سکتا ہے اور کن اصولوں پر چل کر اپنی منزل مقصود تک رسائی کی جا سکتی ہے۔

''تعلیمی نکات'' کا دوسرا باب قدیم و جدید عالمی تعلیم، ہندوستانی تعلیم اور مسلم تعلیم کی تاریخ، اس کا عہد بہ عہد جائزہ، اصول تعلیم، نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم جیسے موضوعات پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ مختلف تعلیمی مسائل پر ایک ہزار چالیس معروضی سوالات و جوابات پر مشتمل کوئز کے انداز میں طلباء کی رہنمائی کے سوالات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے تا کہ اس سے طالب علم استفادہ کر سکیں اور جو موجودہ زمانے کے طلباء کی تعلیمی ضرورتوں اور مقابلہ جاتی امتحانوں کے لیے انتہائی مفید اور کار آمد ہے، ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ ضرور کر لینا چاہیے تا کہ صحیح طرز پر تعلیمی کارواں آگے بڑھتا رہے۔

نمونے کے طور پر چند سوالات ذیل میں درج ہیں:

''سوال: ہندوستان کے قدیم ترین تعلیم گاہ نالندہ یونیورسٹی کا قیام کس نے کیا تھا؟

(الف) چندر گپر   (ب) سمندر گپت

(ج) کمار گپت   (د) بھالو گپت۔'' 87

''سوال: موجودہ کمپیوٹر کی ایجاد سب سے پہلے ہوئی تھی؟

(الف) 1926ء   (ب) 1936ء

(ج) 1946ء   (د) 1956ء۔'' 88

''سوال: معلم کا اولین پیشہ ورانہ فرض ہوتا ہے؟

(الف) خود کی ہمہ جہت ترقی   (ب) طلباء کی ہمہ جہت ترقی

(ج) تعلیمی ادارہ کی ترقی   (د) انتظامیہ کی نیک نامی۔' 89

یہ کتاب ہندوستانی طلباء، اساتذہ، طلباء کے سر پرست اور تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں کے لیے خصوصاً اہمیت و افادیت کی حامل ہے، کیوں کہ نسیم اعظمی نے اس کتاب کے ایک ایک مضمون کو بڑی جاں فشانی اور باریک بینی سے غور و خوض کر کے مرتب کیا ہے اور تعلیم کے اہم مسائل پر بحث کی ہے۔

6. تعلیمی اشارات

تعلیم کے موضوع پر نسیم اعظمی کی یہ چھٹویں کتاب ہے۔انھوں نے اس کتاب میں عصری تعلیم کے تقاضوں اور جدید تکنیکی و پروفیشنل کورسوں کے ساتھ ہر قسم کے مسابقتی امتحانوں سے متعلق بڑے جامع انداز میں وضاحت کی ہے جو نہ صرف طلباء کے لیے سود مند ہے بلکہ اساتذہ اور تعلیمی اداروں کے لیے بھی اہمیت کی حامل ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں نسیم اعظمی کے ''ابتدائیہ'' کے علاوہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا تاثراتی مضمون ''گفتنی'' کے عنوان سے شامل ہے، جس میں انھوں نے کتاب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''اردو داں طبقے میں تعلیمی انفرادیت کے لیے، اقتصادی استحکام کے لیے اور سماج کے تیز رفتار عمل کی تفہیم کے لیے نیز ذہنی آسودگی اور مالی منفعت کے لیے ایم نسیم اعظمی کے ایسے مضامین سے استفادہ لازمی ہے۔ نئے پن کی جڑوں کی تلاش کے لیے ان مضامین کا منظر نامہ سمت نما ہے۔ ساتھ ہی تبدیل ہوتے ہوئے عہد کی روایت کی توسیع یہ مضامین ہیں۔ان میں ارتباط اور تعلق ہے، نزدیکی شدت اور حرکت ہے اور تعلیمی زاویئے کی وجہ سے روح یا نفس کی شہادت ہے۔'' 90

نسیم اعظمی اس کتاب کے ابتدائیہ میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آج ہندوستان میں مسلمانوں میں حصول تعلیم سے دلچسپی ضرور بڑھ رہی ہے لیکن یہاں بہتر تعلیمی ماحول، بہتر تعلیمی رہنمائی اور مثالی تعلیمی اداروں کے ساتھ مخلص و ماہر اساتذہ کا فقدان بھی جا بجا نظر آتا ہے، جس کے سبب مسلمانوں کو ہر طرح کے مصائب و آلام سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔انھوں نے اپنے ابتدائیہ میں مسلمانوں کی پستی و افلاس اور بے چارگی کو ان کی جہالت کی دین مانا ہے، انھوں نے سرسید کا حوالہ دیتے ہوئے وہ زندہ رہنے کے لیے تعلیم کا ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کی تمام قسم کی موجودہ پستیوں، بے وقعتی، بے چارگی، افلاس

اورنحوست ونامرادی اس کی جہالت اور پس ماندگی کی ہی دین ہے اور
بقول سرسید احمد خاں ''اگر چہ یہ دنیا چندروزہ ہے مگر یہ چندروز کی زندگی
بھی بڑے معرکے اور مصیبت کی ہے۔ یہاں عزت و وقار کی زندگی کی
قیمت ہے۔ جاہل وکاہل بن کر دوسروں کے رحم وکرم پر زندہ رہنا زندگی
کی توہین ہے۔'' 91

کتاب کا پہلا باب 31 مشہور کورسیز پر مشتمل ہے جن میں سمر ووکیشنل کورسیز، چند اہم قلیل مدتی ووکیشنل کورسیز، اینٹی گریٹیڈ ایم بی اے کورسیز، غیر ملکی زبانوں میں روشن مستقبل کے کورسیز، فیشن ڈیزائننگ کورسیز، نینوٹکنالوجی کورس خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس باب میں انھوں نے مختلف کورسیز کا تعارف کراتے ہوئے داخلہ کی شرطیں، ان کی تعلیم و تدریس کے طور طریقے اور تکمیل کے بعد روزگار کیریئر کے امکانات ومواقع کا جائزہ لیا ہے۔

نسیم اعظمی کے مطابق طلباء عموماً ووکیشنل کے اہم ترین اوقات کو سیر سپاٹے، گپ شپ اور بلا وجہ ادھر ادھر گھومنے پھرنے میں گزار دیتے ہیں لیکن اچھے اور ہونہار طالب علم، ذمہ دار اور سمجھدار سرپرست کبھی بھی اس تعطیل کو ضائع نہیں ہونے دیتے اور اپنی زندگی گزارنے کے طریقے کے ساتھ کوئی ہابی کورس یا سمر کیمپ جوائن کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے ایسے سمر کیمپ اور مخصوص اداروں کے شارٹ ٹرم کورس کے متعلق جانکاری فراہم کی جن کی مدت کم ازکم پندرہ دنوں سے لے کر پینتالیس دنوں تک ہوتی ہے جیسے آرٹ اینڈ کرافٹ، کھیل کود، ڈانس اور میوزک، فارن سمر پروگرام، انگلش اسپیکنگ کورس، کمپیوٹر کورس وغیرہ ساتھ ہی طلباء کے اس تعطیل کے اوقات کی سرگرمیوں کا شیڈول بھی پیش کیا ہے جو درج ذیل ہے:

''سرگرمیاں	اوقات
کوئی بھی سمر ووکیشنل کورس	صبح 9:30 سے 12:30 بجے تک
لنچ	12:30 سے 1:30 بجے تک
انگریزی یا دیگر کورس	1:30 سے 3:30 بجے تک
سیر وتفریح	3:30 سے 5:00 بجے تک

فری ٹائم　　5:00 سے 6:00 بجے تک

ڈنر　　6:00 سے 7:00 بجے تک

شام کے سوشل انوٹ　　7:00 سے 10:00 بجے تک

ٹائم اینڈ لائٹ آؤٹ　　10:00 سے 10:30 بجے تک۔'' 92

عام طور پر طلباء اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے غیر ملکی زبانوں میں سب سے زیادہ ترجیح انگریزی زبان کو دیتے ہیں جب کے اور بھی بہت ساری غیر ملکی زبانیں ہیں جسے حاصل کر کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں ''غیر ملکی زبانوں میں روشن مستقبل کے کورسیز'' کے عنوان میں اس بات پر طلباء کی توجہ خاص طور پر مبذول کرائی گئی ہے تا کہ وہ صرف اپنا کیریئر بنانے کے لیے انگریزی زبان سیکھنے کی تگ و دو میں نہ لگے رہیں بلکہ آج کل عالمی سطح پر اس زبان کے علاوہ بہت ساری زبانیں ابھر کر سامنے آئی ہیں جن کا سیکھنا انگریزی زبان سے سہل ہے اور اس سے مستقبل بھی روشن اور تابناک بنایا جا سکتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ غیر ملکی زبان سیکھنے کے لیے بیرون ممالک کا سفر کرنا پڑے بلکہ اب ہندوستان میں بھی بہت سارے ایسے ادارے موجود ہیں جہاں مختلف بین الاقوامی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں نسیم اعظمی ان اداروں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی بہت ساری یونیورسٹیاں اور متعدد دیگر ادارے بہت سی غیر ملکی اداروں کی تعلیم و تربیت کا باقاعدہ اور معقول اہتمام اور انتظام کرتے ہیں اور اس کے لیے مختلف ڈگری ڈپلوما کورس چلاتے ہیں۔ جن میں سے چند قابل ذکر اور سرفہرست اداروں کے نام درج ذیل ہیں۔
>
> سینٹرل انسٹیٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویج (CIEFL) حیدرآباد، بھارتیہ ودیا بھون۔ جواہر لعل نہرو اکیڈمی آف لینگویج۔ نئی دہلی، اسکول آف فارن لینگویج۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (JNU) نئی دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (AMU) علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ (JMI) نئی دہلی، دہلی یونیورسٹی (DU) دہلی، بنارس ہندو یونیورسٹی (BHU)

بنارس۔‘‘ 93؎

اس کتاب کے باب دوم میں 26 مضامین شامل ہیں۔اتنا سبھی جانتے ہیں کہ ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں تعلیمی اداروں کی کمی نہیں ہے اس کے باوجود طلباء عدم واقفیت یا صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے اپنے بہت سارے کورسیز کے تعلق سے جو دلوں میں خواب سجائے ہوتے ہیں انھیں شرمندۂ تعبیر نہیں کر پاتے،اس لیے مصنف نے یہاں ان اہم تعلیمی اداروں کا ذکر کیا ہے جو طلباء کی زندگی کو مستقبل میں باوقار بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اور ان کا شمار بھی دنیا کے اہم ترین اداروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے کتاب نے ان اداروں کی مختصر تاریخ کے ساتھ ساتھ ان اداروں میں کون کون سی فیکلٹیاں ہیں اور طلباء کون کون سے کورسیز یہاں حاصل کر سکتے ہیں اس کی تفصیلی جانکاری دی ہے اور یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ یہ وہ ادارے ہیں جو طلباء کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے میں معین اور مددگار ہیں، جہاں طلباء پہنچ کر نئی علمی فضا سے واقف ہوتے ہیں اور ان میں دیگر ساتھیوں کو دیکھ کر علمی ذوق وشوق کا ایک نیا ولولہ پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے آگے ترقی کرنے کی راہیں ہموار ہوتی چلی جاتی ہیں۔

انھوں نے جن اداروں کے نام درج کیے ہیں وہ اس طرح ہیں:

’’انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن‘‘،’’انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی‘‘،’’انسٹیٹیوٹ آف کیمیکل ٹیکنالوجی‘‘،’’نیشنل لا اسکول آف انڈیا یونیورسٹی‘‘،’’ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس‘‘، ’’نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فیشن ٹیکنالوجی‘‘،’’کالج آف انجینئرنگ چنئی‘‘، ’’شری رام کالج آف کامرس دہلی‘‘، ’’نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ڈیزائننگ‘‘، ’’مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی‘‘، ’’علی گڑھ مسلم یونیورسٹی‘‘ ، ’’بنارس ہندو یونیورسٹی‘‘،’’جادو پور یونیورسٹی‘‘،’’سارک یونیورسٹی‘‘،’’چھترپتی شاہو جی مہاراج کانپور یونیورسٹی‘‘، ’’جامعہ ملیہ اسلامیہ‘‘،’’لکھنؤ یونیورسٹی‘‘،’’جواہر لعل نہرو یونیورسٹی‘‘،’’اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی‘‘،’’پی پی این کالج کانپور‘‘،’’موتی لعل نہرو انسی

ٹیوٹ آف ٹکنالوجی''،''انجمن اسلام ۔ ممبئ''، انسی ٹیوٹ آف
مینجمنٹ''، ''نینی تال کے تعلیمی ادارے''، ''کوٹا(راجستھان) کی
انجینئرنگ اور میڈیکل کوچنگ''،''خواجہ معین الدین چشتیؒ اردو فارسی
یونیورسٹی۔'' 94؎

تعلیمی اشارات کا باب سوم بیرون ممالک کے تعلیمی اداروں پر مشتمل ہے جن میں دنیا کے اہم ترین اداروں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی تعداد سترہ ہے۔مصنف نے اپنے ملک کے اہم تعلیمی ادروں کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کے معیاری تعلیمی اداروں،ان اداروں میں شامل کورسیز اور داخلے کے اصول وضوابط اوراس کے بہترین نتائج کے بارے میں جانکاری دی ہے۔اس باب کو پڑھ کر طلباء بیرونی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے اپنے خواب کوشرمندۂ تعبیر کر سکتے ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ کے خواہش مند ایسے ہندوستانی طلباء جو بین الاقوامی شہرت واہمیت کے حامل بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں انہیں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی مشورہ دیتے ہیں کہ ایسے تمام طلباء کو بلا تامل آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے سرگرم ہو جانا چاہیے جن کے تعلیمی ریکارڈ بہتر رہے ہوں۔آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے جو اہلیت ہونی چاہیے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اس یونیورسٹی میں داخلے کے لیے طلباء براہ راست اپنی درخواست آن
لائن بھیج سکتے ہیں۔پوسٹ گریجوئٹ کورسوں میں داخلہ کے لیے کم سے
کم سیکنڈ ڈویژن میں طالب علم کا آنرس ڈگری ہولڈر ہونا ضرور ہوتا
ہے۔درخواست دیتے وقت اپنی تعلیمی اہلیت اور کورسوں اور دیگر
سرگرمیوں وغیرہ اور ضروری کاغذات کی صحیح صحیح جانکاری دینی ہوتی
ہے۔اس کے ساتھ ہی پوسٹ گریجویٹ کورس میں داخلہ کے لیے آئی
ای ایل ٹی ایس (IELTS) میں 75 یا ٹافل (TOFEL) میں
600 کا اسکور ضروری ہوتا ہے۔'' 95؎

کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ کے شرائط پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس یونیورسٹی میں داخلے کے لیے کسی بھی منظور شدہ ہندوستانی

یونیورسٹی پہلی یا دوسری پوزیشن میں گریجویٹ یعنی بی اے(.B.A) یا
بی ایس سی (B.Sc) وغیرہ ہونا لازمی ہوتا ہے۔اس کے علاوہ کسی بھی
اورینٹل لینگویج، ریاضی یا سائنس یا انگریزی کا ہونا ضروری ہوتا
ہے۔ یہاں سبھی قسم کی پہلی ڈگری کے لیے بی اے(.B.A) آنرس ہونا
بھی ناگزیر ہوتا ہے۔'' 96

اس کتاب کا چوتھا اور آخری باب تعلیمی سہولیات پر مشتمل ہے جن میں تین مضامین شامل ہیں، پہلا مضمون ''تعلیمی قرض (ایجوکیشن لون)'' کے عنوان سے ہے۔ ہمارے ملک میں اعلیٰ ،معیاری ، تکنیکی و پرفیشنل تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہت ساری سہولیات مہیا ہیں لیکن معلومات نہ ہونے کی وجہ سے خصوصاً مسلم طلباء اس سے استفادہ نہیں کر پاتے ہیں اور بہت سے باصلاحیت اور غریب طلباء بہتر تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مصنف نے اس باب میں تعلیمی قرض دینے والے اہم بینکوں کے نام، رقم کی حد اور دوسری ضروری معلومات بہم پہنچائی ہے۔ نیز اس کا بھی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ملک میں کم از کم طلباء کے لیے بلا سود تعلیمی قرض کا اہتمام کیا جائے تا کہ ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کی فیصد میں اضافہ ہو اور کچھ بننے کا حوصلہ رکھنے والے طلباء ہمت ہارنے نہ پائیں۔ یہ نسیم اعظمی کی تعلیمی نقطہ نظر سے اہم خدمت ہے۔

ہندوستان میں تعلیمی قرض کا رواج تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے اور تقریباً ۸۰ فیصد جدید پروفیشنل کورسوں کے طالب علم اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ تعلیمی کورس کی تکمیل کے لیے تعلیمی قرض کے حصول کے لیے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے شرائط اور اہم دستاویز سے آگاہ کیا ہے جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

''تعلیمی قرض کا درخواست دہندہ ہندوستان کا شہری ہو۔
طالب علم کی عمر کسی بھی حال میں 35 سال سے زیادہ نہ ہو۔
طالب علم کا داخلہ/رجسٹریشن سرکاری یا سرکار سے منظور شدہ تعلیمی
ادارے میں ہو یا ہونے کے عمل میں ہو۔
طالب علم ریگولر طور پر اپنے مجوزہ تعلیمی کورس کی تکمیل کرنا چاہتا ہو۔ تعلیمی
قرض کے حصول کے لیے طالب علم کے پاس درج ذیل دستاویز کا ہونا

ضروری ہوتا ہے۔

سابقہ تعلیمی ریکارڈ سرٹیفکیٹ اور مارک شیٹ۔

جس تعلیمی ادارہ میں داخلہ لینا چاہتا ہے اس کا اتھارٹی لیٹر ایڈمیشن سلپ۔

عمر اور پتہ کا تصدیق نامہ،فوٹو اور شناختی کارڈ۔

غیر ملکی ادارہ میں داخلہ لینے والے طالب علم کے لیے پاس پورٹ اور ویزا کی مصدقہ نقول۔

والدین یا سرپرست کا آمدنی سرٹی فیکیٹ۔

قرض کی رقم زیادہ ہونے پر والد یا سرپرست کی گذشتہ چھ مہینوں کی سیلری سلپ، بینک اسٹیٹ منٹ یا اس کی جائداد کی دستاویز۔

والدین یا سرپرست کا شناخت نامہ۔'' 97

اسی طرح اس باب میں قرض دینے والے چند اہم بینکوں کے نام،رقم کی حد اور شرح سود سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

بینک کا نام	سکورٹی حد	اندرونہ ملک	بیرونی ملک	شرح سود فیصد میں	کیفیت
اسٹیٹ بینک آف انڈیا	۴ لاکھ سے اوپر	۱۰ لاکھ روپے	۲۰ لاکھ روپے	۱۱.۲۵ تا ۱۲.۷۵	خواتین کے لیے ۰.۵۰ کی رعایت
پنجاب نیشنل بینک	۴ لاکھ سے اوپر	۱۰ لاکھ روپے	۲۰ لاکھ روپے	۱۱.۲۵ تا ۱۲.۵۰	خواتین کے لیے ۰.۵۰ کی رعایت
اسٹیٹ بینک حیدرآباد	۴ لاکھ سے اوپر	۱۰ لاکھ روپے	۲۰ لاکھ روپے	۱۱.۲۵ تا ۱۲.۵۰	خواتین کے لیے ۰.۵۰ کی رعایت
بینک آف انڈیا	۴ لاکھ سے اوپر	۷.۵ لاکھ روپے	۱۵ لاکھ روپے	۹.۵۰ تا ۱۰.۷۵	خواتین کے لیے ۰.۵۰ کی رعایت۔'' 98

اسی باب کا دوسرا مضمون ''تعلیمی وظائف'' کے عنوان سے ہے،طلباء کو بہتر تعلیم حاصل کرنے کے لیے کون کون سے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے تعلیمی وظائف دیتے ہیں ان کا نام اور وظائف کی رقم اور اس ادارے کی ویب سائٹ کی تفصیل بھی انھوں نے دی ہے،اس طرح طلباء کی مشکلات کو آسان بنانے میں اس کتاب کا مطالعہ کافی سودمند اور مفید ہے۔

اس باب کا آخری مضمون ''ہندوستان کی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے'' کے عنوان سے ہے۔اس میں اس ملک کی 508اہم یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کی فہرست مع پتہ ویب رینکنگ کے مطابق دی گئی ہے۔جس میں یونیورسٹی آف حیدرآباد کا نمبر 427 ہے۔گویا یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کی یہ کتاب ایک چھوٹی سی انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب موضوع اور افادیت کے لحاظ سے انتہائی اہم جانی جاتی ہے۔کتاب کی تفہیم کے لیے زبان کو نہایت آسان رکھا گیا ہے،اور ہر مضمون کے شروع کرنے سے پہلے مصنف نے ایک شعر دیا ہے جو مضمون سے ہم آہنگ اور بامعنیٰ ہے،مثال کے طور پر''ہندوستان کی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے'' کا عنوان اس شعر سے شروع کرتے ہیں ۔

ہیں تعلیم کی بھی نئی کوششیں
اداروں کی اب تو بھرمار ہے

1. راجا رام موہن رائے اور ان کے تحریکی و تعلیمی کارنامے

یہ کتاب نسیم اعظمی کی تعلیم کے موضوع پر ساتویں کتاب ہے جو چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ابتدائیہ کے عنوان سے ان کا تعارفی مضمون بھی شامل ہے،جس میں انھوں نے پوری کتاب کا مختصراً مگر جامع انداز میں احاطہ کرتے ہوئے راجا رام موہن رائے کے تحریکی و تعلیمی تناظر میں ہندوستان کے تاریخی ادوار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔کتاب میں تاریخی پس منظر کو اتنے برمحل انداز میں پیش کیا ہے کہ جس سے راجا رام موہن رائے کی سبھی کاوشوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے مثلاً راجا رام موہن رائے کی تحریک سے قبل ہندوستان میں عورتوں کی حیثیت کیا تھی پھر راجا رام موہن رائے کی تحریک کے بعد حالات میں کیسی تبدیلی آئی ،جس پر اظہار

خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے نصف اول کے زمانے میں جب دنیا میں ایک نئی تبدیلی اور انقلاب کے آثار نمایاں ہو رہے تھے ہندوستان میں قدامت پسندی، توہم پرستی، اندھی مذہبی عقیدت اور غلط رسم و رواج کی جکڑ بندیاں عام تھیں۔ عورتوں کو ان کے بنیادی حقوق حاصل نہیں تھے، بیوہ ہو جانے پر یا تو شوہر کی چتا میں جل کر ستی ہو جانا پڑتا تھا یا زندہ رہنے کی صورت میں موت سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ دوسری شادی کی اجازت نہیں تھی۔ مذہب کی غلط تشریح عام تھی۔ ایسے وقت میں راجا رام موہن رائے نے جدید مذہبی عقلیت پسندی کو عام کرنے کی کوشش کیں، ستی جیسی انسانیت سوز رسم کے خاتمے کے لیے تحریک چلائی اور اسے غیر قانونی قرار دینے میں بنیادی کردار ادا کیے۔ بیواؤں کی شادای کی حمایت کی، اخبارات و رسائل نکالے۔ فارسی بنگلہ اور انگریزی زبانوں میں اخبارات و رسائل کا اجراء کیا۔ پریس کا قیام کیا اور پریس کی آزادی کے لیے پہلی جدو جہد کی اور ہندوستانیوں کے استدلالی نظریات کے فروغ کے لیے وہ سب کچھ کیا جس سے وہ زمانہ کی رفتار سے ہم آہنگ ہو سکیں اور خوش آئند مستقبل کے لائق بن سکیں۔ ان میں قومیت کا جذبہ پیدا ہو سکے۔'' 99

اس کتاب کے پہلے باب میں راجا رام موہن رائے کے عہد و ماحول، سیاسی، سماجی اور مذہبی، معاشی و اقتصادی، تعلیمی و تہذیبی اور بین الاقوامی حالات پر قدر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ سیاسی حالات میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد کا تذکرہ کرتے ہوئے یہاں کے کچھ نام و نمود بادشاہ مثلاً فرخ سیر، رفیع الدولہ، روشن اختر، محمد شاہ رنگیلے اور نادر شاہ و احمد شاہ ابدالی کے حملے کی وضاحت کرتے ہوئے راجا رام موہن رائے کے آباؤ اجداد کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ راجا رام موہن رائے کے عہد کا پس منظر بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''راجارام موہن رائے نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ہندوستان پر سامراجیت اور جا گیرداری کی جکڑ بندیاں اپنے نقطۂ عروج پر تھیں۔ چنانچہ انھوں نے ان جکڑ بندیوں سے ہندوستان کو نجات دلانے کے لیے نئی بیداری کی تخم ریزی کی اور نئی راہوں کی تلاش کے لیے مختلف تحریکیں چلائیں اور نئی تعلیم کو عام کرنے کی کوششیں کیں تاکہ ہندوستانیوں میں نئی بیداری پیدا ہو سکے اور آنے والے حالات و تقاضات کے مطابق وہ تیار ہوسکیں اور موجودہ جکڑ بندیوں سے چھٹکارہ پاسکیں۔ انھوں نے اپنے فکر وعمل سے ایک طرف اپنے زمانے کے فرسودہ فکر وخیال سے روشناس کرایا تو دوسری طرف آنے والے جدید حالات وماحول سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔'' 100

دوسرے باب میں راجارام موہن رائے کی سوانح وشخصیت کے تحت خاندانی پس منظر مثلاً پیدائش، بچپن، تعلیم، نوجوانی، ابتدائی سیر وتفریح، کاروبار اور نوکری، خاندانی جھگڑے اور مقدمات، شخصیت و کردار وغیرہ کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔ راجارام موہن رائے بے باک اور جرأت مند انسان تھے، ان کی حق گوئی، جرأت مندی اور مطالعہ کی وسعت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی شخصیت کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

''راجارام موہن رائے کے کردار وسیرت کی ایک اہم ترین خصوصیت ان کی حق گوئی و بے باکی اور جرأت مندی بھی ہے۔ ان کا مطالعہ کافی وسیع، تجربات ومشاہدات متنوع اور اخذ وفیصلہ کی قابلیت تیز تھی۔ وہ کسی بھی معاملے میں پوری سنجیدگی ومتانت، باریک بینی، غور وفکر اور جانچ و پرکھ کے بعد کوئی رائے قائم کرتے تھے اور جو رائے متعین کر لیتے تھے پوری دل جمعی اور مضبوطی سے اس پر گامزن ہو جاتے تھے اور اس بات کی قطعی پرواہ نہیں کرتے تھے کی ان کے اس عمل سے کون خوش ہے اور کون ناخوش۔ چنانچہ یہ وجہ ہے کہ ان کی پوری زندگی حق و باطل کے

معرکے کی داستان معلوم ہوتی ہے۔'' 101؎

تیسرے باب میں راجا رام موہن رائے کے سفر اور سفارت کی روداد کے علاوہ ان کے سفر آخرت کی تفصیل بھی رقم ہوئی ہیں۔ سفر انگلینڈ، سفر فرانس اور برسٹل کا سفر خاص طور سے اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے جب اپنے سفر فرانس کے بارے میں وہاں کے وزیر خارجہ کو خط لکھ کر فرانس جانے کی اجازت مانگی تھی وہ خط بھی ایک دستاویزی حیثیت کا حامل تھا۔ اس خط کے بارے میں نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''اسی خط میں انھوں نے اس بات کا بھی اعلان کیا تھا کہ سارے انسان ایک ہی خاندان سے ہیں اور مختلف ذاتیں اس کی شاخیں ہیں۔ یہ بات راجا رام موہن رائے نے اس وقت کہی تھی جب دنیا نے اقوام متحدہ جیسے ادارے کے بارے میں ابھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' 102؎

اس کتاب کا چوتھا باب اہم ہے۔ اس باب میں راجا رام موہن رائے کی اصلاحی تحریکوں جیسے کلکتہ تحریک کا دور اول، ستی مخالف تحریک، کلکتہ تحریک کا دور آخر، سماجی بیداری کی تحریک، مذہبی بیداری کی تحریک، سیاسی بیداری کی تحریک، عدالتی اور انتظامی تحریک، اقتصادی اور معاشی تحریک، صحافت اور پریس کی آزادی کی تحریک، ذہنی بیداری کی تحریک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ستی مخالف تحریک راجا رام موہن رائے کی قائم کردہ اہم تحریک تھی، نسیم اعظمی کے مطابق راجا رام موہن رائے کے بڑے بھائی جگ موہن کی بیوی اپنے شوہر کی چتا میں جل کر ستی ہوگئی تھی تو انھوں نے اس قسم کے غیر انسانی بلکہ انسانیت سوز رسم کے خلاف تحریک چلانی شروع کر دی، ان کے نزدیک ان سے پہلے بھی اس رسم کی مخالفت ہوتی چلی آ رہی تھی لیکن کسی منظّم تحریک کی شکل میں نہ تھی، لیکن ان کی یہ تحریک با منظّم تھی۔ ہندوستانی معاشرے میں عورت کی کیا حقیقت تھی اور راجا رام موہن رائے نے کس طرح اس تحریک کے ذریعہ ستی کی رسم کی مخالفت کی، اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''پورے ہندو سماج میں بیوہ عورت کو منحوس اور بدشگونی کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔ اس کا دیکھنا یا نظر پڑ جانا یا خوشی و مسرت کے موقع پر دکھائی دے دینا اشبھ تھا۔ سماج میں بیوہ کی جو درگت ہوتی تھی اس کے پیش نظر

شوہر کی موت کے بعد کی زندگی جو موت سے بھی خطرناک ہوتی تھی کو
سوچ کر ہی عورت اپنی خودسوزی کو ترجیح دیتی تھی اور مذہب کا رنگ دیکر
اس کو بڑھاوا دے دیا گیا تھا۔ اور ستی کا نام دے کر عورت کو سرعام قتل
کر دیا جاتا تھا۔ اور راجا رام موہن رائے بھی اس رسم کو عورت کی
ہتھیا (قتل) ہی مانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس موضوع پر گہرائی
سے مطالعہ کر کے اس کے خلاف باقاعدہ قلمی جہاد شروع کر دیا تھا۔ اس
موضوع پر ان کی پہلی کتاب 1818ء میں شائع ہوئی تھی جس میں
انھوں نے ستی کی رسم کو شاستری ڈھکوسلہ اور مذہبی دھوکہ دھڑی اور
دقیانوسیت کا نام دیا تھا۔'' 103؎

اس کتاب کے پانچویں باب میں راجا رام موہن رائے کی تصنیفی، تالیفی، اور تحریری سرگرمیوں اور ابتدائی تصنیفات و تالیفات، قیام کلکتہ کے دوران کی بنگلہ، اردو اور انگریزی کتاب و تراجم کے علاوہ آتمیہ سبھا کا قیام، بونی ٹیرین کمیٹی کی تشکیل اور برہمو سماج کا قیام وغیرہ کی تفصیلات دی گئی ہے۔ راجا رام موہن رائے نے مختلف قسم کی تحریکیں چلائی تھیں اور مختلف تحریری اور تالیفی کارناموں کے ساتھ بہت سارے مذہبی اور ثقافتی اداروں کا بھی قیام کیا تھا۔ آتمیہ سبھا (بزم احباب) بھی ایک ایسا ہی ادارہ تھا۔ آتمیہ سبھا کا قیام اور اس کے ذریعے راجا رام موہن رائے کی مذہبی تبلیغ سے کس طرح لوگوں کی مخالفت کا ان کو سامنا کرنا پڑا اور وہ تمام مشکلات کے باوجود اس پر مضبوطی سے قائم رہے۔ ان کی اسی خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''راجا رام موہن رائے نے اپنے کلکتہ قیام کے دوران سب سے پہلے
آتمیہ سبھا (بزم احباب) کا قیام کیا تھا۔ جس میں برسوں تک مذہبی
بحث و مباحثہ، غور و فکر، وید پاٹھ اور برہمو سنگیت کا گائن ہوتا رہا تھا اور
اسی سبھا کے توسط سے راجا رام موہن رائے نے اپنے ارد گرد ایک مختصر
مگر مخصوص لوگوں کا حلقہ جمع کر لیا تھا۔ اس سبھا کے ذریعہ مذہبی توہم
پرستی اور مورتی پوجا کی مخالفت اور وحدانیت کی حمایت کی تبلیغ بھی شروع

کی گئی تو بہت سے نئے لوگ بھی اس کے قریب ہو گئے تھے اور کئی ایک پرانے دوست بھی اس سے الگ ہو کر راجا رام موہن رائے کے دشمن بن گئے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے راجا رام موہن رائے کو عیسائی، لامذہب اور دہریہ تک کہا تھا لیکن راجا رام موہن رائے اپنے دھن کے پکے تھے اور اپنے قائم کردہ نظریات پر پوری مضبوطی اور استحکام سے تمام تر مخالفت کے باوجود قائم رہے۔'' 104؎

کتاب کا آخری باب راجا رام موہن رائے کی تعلیمی سرگرمیوں اور تعلیمی اداروں کے قیام پر منحصر ہے جس میں ہندوستانی کی تعلیمی صورت حال، انیسویں صدی میں تعلیم، ہندوستان میں جدید تعلیم کا آغاز و ارتقاء، ہندو کالج کا قیام، ویدانت کالج کا قیام، مشنری اسکول کا قیام، ہیئر اسکول کا قیام، اسکول بک سوسائٹی کا قیام، لسانی و ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ راجا رام موہن رائے کے اہم ترین کاموں میں تعلیمی اداروں کا قیام بھی ہے۔ راجا رام موہن رائے کی تعلیمی بیداری کی اہم کوششوں کو سراہتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں ذہنی بیداری اور نشاۃ الثانیہ کے اصل روح رواں راجا رام موہن رائے ہی تھے۔ ذہنی اور فکری بیداری و تبدیلی میں تعلیم ہی سب سے اہم اور موثر ذریعہ ہوتی ہے اور اس باریکی کو راجا رام موہن رائے بخوبی سمجھتے تھے کیوں کہ ان کی نگاہ باریک بیں بھی تھی اور دور اندیش بھی۔ انھوں نے جہاں ہندوستان میں جدید تعلیمی بیداری لانے کے لیے مختلف تحریکیں چلائیں، کتابیں لکھیں اور اخبارات و رسائل نکالے وہیں تعلیم کے بارے میں بھی بہت سے فکری اور عملی کارنامے انجام دیے جن میں اہم ترین کام تعلیمی اداروں کا قیام ہے۔'' 105؎

1826ء میں راجا رام موہن رائے کی محنت و کوشش سے ''ویدانت کالج'' کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کالج کے ذریعہ ہندوؤں کو جدید انگریزی و سائنسی تعلیم کی تربیت دینا اور ویدانت اور دوسرے ہندو دھرم شاستروں اور سنسکرت زبان و ادب سے روشناس کرانا مقصود تھا۔ ہندوؤں میں دقیانوسیت اور مشنریوں کے ذریعہ ہندو مذہب کے بارے میں غلط پروپگنڈے کا دفاع اس کالج کا اصل محور تھا۔ اس کالج کے مقاصد پر

روشنی ڈالتے ہوئے راجا رام موہن رائے کے خیالات کو بھی پیش کرتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''راجا رام موہن رائے غالباً پہلے ہندوستانی ہیں جو جدید انگریزی تعلیم اور مغربی و سائنسی تعلیم کے نہ صرف حمایتی تھے بلکہ بہت بڑے مبلغ اور علمبردار بھی تھے اور آنے والے زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہندو نوجوانوں کی ایسی نسل تیار کرنے کے خواہاں تھے جو وقت و حالات سے بہر حال ہم آہنگ ہوسکیں اور اس کے لیے وہ جدید مغربی اور سائنسی تعلیم کو سب سے موثر اور کارآمد ذریعہ تصور کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر حال اور ہر ذریعہ سے حاصل ہونے والی جدید مغربی اور سائنسی تعلیمی کو ہندوؤں کے لیے انتہائی مفید اور کارآمد سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھیں اغراض و مقاصد کے پیش نظر مذہب و سائنس کے باہم اشتراک و متزاج کو انھوں نے ناگزیر خیال کیا تھا اور مذہبی عقلیت پسندی اور سائنسی سوچ رکھنے والا ایک تعلیم یافتہ ہندو طبقہ تیار کرنے کے لیے ہی انھوں نے ''ویدانت کالج'' کا قیام کیا تھا۔'' [106]

راجا رام موہن رائے ایک مذہبی اور قومی رہنما ہونے کے ساتھ ایک فعال مفکر اور دانشور بھی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، انھوں نے اسلام اور قرآن کا مطالعہ بھی عمیق نظری سے کیا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے عالمی اور ملکی حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ وقت اور حالات کے مدنظر بہت ساری سماجی، مذہبی اور تعلیمی تحریکیں بھی چلائی تھیں اور کئی ادارے بھی قائم کیے تھے، انھوں نے مذہبی مناجات و عبادات کے لیے کتابیں بھی مرتب کی تھیں اور انگریزی و بنگلہ کتب کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ انہیں ساری کاوشوں کی وجہ سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ان کا نام ہمیشہ ہمیش کے لیے زندہ جاوید بن چکا ہے۔

نسیم اعظمی نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ راجا رام موہن رائے کی حیات اور خدمات کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا اور خصوصاً تعلیم کے حوالہ سے ان کی کوششوں کو واضح انداز میں جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

غرض نسیم اعظمی کے تعلیمی افکار و خیالات اور ان کی خدمات کو سمجھنے کے لیے ان کی تمام کتابوں کا

مطالعہ ضروری ہے۔ان کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر کی اصل جولانگاہ وسوچنے اور غور کرنے کا اصل میدان تعلیم ہے۔کیوں کہ انھوں نے اپنی ان کتابوں کے ذریعہ نوجوان مسلم طالب علموں کی رہنمائی، کیریئر گائیڈنس کے سلسلے میں جومشورے دیے ہیں وہ نہایت اہم اور کارآمد ہیں۔اس کے علاوہ طلباء میں نئے کورسیز کے انتخاب اور دلچسپی پیدا کرنے کے لیے جس طرح انھوں نے حوصلہ افزائی کی وہ بھی اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ عہد حاضر میں تعلیم کے سلسلے میں طلباء کوصحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے انھیں بہت سے مسائل سے گزرنا پڑتا ہے ایسے حالات میں بہت ممکن ہے کہ ان کی کتابیں رہنمائی کا کام کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اردو کے نامور دانشوروں اور نقادوں نے ان کی اس سلسلہ کی کوششوں کو خوب سراہا بھی ہے کیوں کہ آج کے دور میں ملت کی فکر کرنے والوں کی تعداد چند ہی ہیں ایسے حالات میں نسیم اعظمی کے تعلیمی نظریات وافکار سے نئی نسل میں امید کی کرن نظر آتی ہے جو اپنے مستقبل کے لیے فکرمند ہوتے ہیں،یقیناً نسیم اعظمی کی یہ کتابیں ان کی صحیح رہنمائی کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔

*****

حوالے

1 ساجد جمال عبدالرحیم، ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم۔ص1-2

2 ایضاً۔ص3

3 ایضاً۔ص3

4 ایضاً۔ص5

5 ایضاً۔ص5

6 ایضاً۔ص8

7 ڈاکٹر آفاق ندیم خاں سید معاذ حسین، تعلیمی نفسیات کے پہلو۔ص31

8 ساجد جمال عبدالرحیم، ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم۔ص8

9 ایضاً۔ص8

10 ایضاً۔ص8

11 ڈاکٹر آفاق ندیم خاں سید معاذ حسین، تعلیمی نفسیات کے پہلو۔ص32

12 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی اشارات۔ص13

13 حجت الاسلام حضرت سیدنا امام محمد بن محمد غزالی شافعی، احیاء العلوم، پیش کش: مجلس المدینہ العلمیہ (شعبہ تراجم کتب) مکتبہ المدینہ باب المدینہ کراچی، 2012، جلد نمبر 1۔ص115

14 ایضاً۔ص102

15 ظہیر حسن ظہیر، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی سے ایک ادبی ملاقات (انٹرویو) مشمولہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص102

16 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات۔ص14

17 ''اردو انسائیکلوپیڈیا'' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، جلد دوم، دوسری اشاعت 2010ء، ص36

18 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی تجزیے۔ص100

19 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات۔ص159

20 ایضاً۔ص160

21 ایضاً۔ص167

22 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیم اور تعلیمی افکار۔ص16

23 شارب رودولوی، جدید اردو تنقید: اصول و نظریات۔ص135

24 ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، شبلی اور جہان شبلی۔ص35

25 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیم اور تعلیمی افکار۔ص51

26 ایضاً۔ص148

27 ایضاً۔ص194

28 ایضاً۔ص77

29 ایضاً۔ص11

30 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی نکات۔ص17

31 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی تجزیے۔ص87

32 ''1959ء میں ضلع بستی میں ایک تاریخی صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس'' دینی تعلیمی کونسل اترپردیش، ص1

33 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی نکات۔ص20

34 ایضاً۔ص21

35 مولانا ابوالحسن علی الندوی، کاروان زندگی، مکتبہ اسلام لکھنؤ، 1997، جلد نمبر 6 ص265

36 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی تجزیے۔ص98-97

37 ایضاً۔ص96

38 ایضاً۔ص24-25

39 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیم اور تعلیمی افکار۔ص 11

40 ایضاً۔ص12

41 پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، نسیم اعظمی کا تعلیمی شعور، مشمولہ، ماہنامہ، ایوان اردو، دہلی، جنوری 2020۔ص16

42 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی اشارات۔ص13-14

43 حکیم وسیم احمد اعظمی، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی علم کی توسیع و تشہیر کا سفیر، مشمولہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015۔ص148

44 ایضاً۔ص148

45 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی نکات۔ص18-19

46 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی تجزیے۔ص 7

47 پروفیسر علقمہ شبلی، تعارف، مشمولہ، تعلیمی تجزیے، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی۔ص10

48 ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، تعلیمی تجزیے سے متعلق چند باتیں، مشمولہ، تعلیمی تجزیے، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی۔ص 11

49 مولانا نثار احمد قاسمی، سخن ہائے گفتنی، مشمولہ، تعلیمی تجزیے، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی۔ص13

50 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی تجزیے۔ص20

51 ایضاً۔ص31

52 ایضاً۔ص35

53 ایضاً۔ص36

54 ایضاً۔ص37

55 ایضاً۔ص63

56 ایضاً۔ص 102

57 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی جہات ۔ص9

58 ایضاً۔ص12

59 ایضاً۔ص17

60 ایضاً۔ص21

61 ایضاً۔ص28

62 ایضاً۔ص29

63 ایضاً۔ص169

64 ایضاً۔ص175

65 ایضاً۔ص325

66 ایضاً۔ص334

67 ڈاکٹر حسن الدین احمد، تعلیمی نکات: مینارۂ آگہی، مشمولہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ص121

68 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات ۔ص8

69 ایضاً۔ص11

70 ایضاً۔ص13

71 ایضاً۔ص15

72 ایضاً۔ص166

73 ایضاً۔ص166

74 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیم اور تعلیمی افکار۔ص11

75 ایضاً۔ص19

76 ایضاً۔ص23

77 ایضاً۔ص23

78 ایضاً۔ص32-31

79 ایضاً۔ص75

80 ایضاً۔ص91

81 ایضاً۔ص233

82 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی نکات۔ص10

83 ایضاً۔ص16

84 ایضا۔ص17

85 ایضاً۔ص59

86 ایضاً،ص41-40

87 ایضاً۔ص320

88 ایضاً۔ص327

89 ایضاً۔ص367

90 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، تعلیمی اشارات۔ص10

91 ایضاً۔ص14

92 ایضاً۔ص23

93 ایضاً۔ص53

94 ایضاً۔ص7-6

95 ایضاً۔ص354

96 ایضاً۔ص359

97 ایضاً۔ص389

98 ایضاً۔ص391

99 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، راجا رام موہن رائے اوران کے تحریکی وتعلیمی کارنامے۔ص12-11

100 ایضاً۔ص17

101 ایضاً۔ص89

102 ایضاً۔ص117

103 ایضاً۔ص144-143

104 ایضاً۔ص245

105 ایضاً۔ص281

106 ایضاً۔ص285

*****

باب پنجم

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تحقیقی وتنقیدی خدمات

(الف) تحقیقی خدمات

(ب) تنقیدی خدمات

(الف) تحقیقی خدمات

تحقیق عربی زبان کے لفظ ''حقق'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ چھان بین، کھوج اور تلاش وجستجو کے ذریعہ اس کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کے ہیں۔

فیروز اللغات میں تحقیق کے معنیٰ یوں رقم ہیں:

''اصلیت معلوم کرنا، دریافت کرنا، درستی، صحت، دریافت، تفتیش، جانچ پڑتال، سچائی، صداقت، اصلیت، یقین، تصدیق، پایہ ثبوت کو پہنچنا، درست، ٹھیک، سچا، اصلی، یقینی، جمع تحقیقات۔'' 1

وبسٹر کی لغت میں تحقیق کے مندرجہ ذیل معنیٰ بتائے گئے ہیں:

''محتاط یا سرگرم تلاش، گہری جستجو۔'' 2

آکسفورڈ ڈکشنری میں تحقیق کے معنیٰ کچھ یوں دیئے ہوئے ہیں:

''کسی مخصوص چیز یا شخص کے متعلق گہری یا محتاط تلاش کا عمل۔
کسی مضمون کی چھان بین یا مسلسل مطالعہ۔
دوسری بار یا بار بار کی تلاش۔'' 3

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق تحقیق کے لغوی معنیٰ:

''تحقیق کے لغوی معنیٰ کسی شئے کی حقیقت کا اثبات ہے۔'' 4

مولانا کلب عابد نے تحقیق کے مطلب کو کچھ یوں سپرد قرطاس کیا ہے:

''تحقیق عربی لفظ ہے۔ یہ باب تفعیل سے مصدر ہے۔ اس کے اصلی حروف ح ق ق اس کا مطلب ہے حق کو ثابت کرنا یا حق کی طرف پھیرنا۔'' 5

اس طرح مندرجہ بالا لغات اور نظریات کی روشنی میں تحقیق کے جو معنیٰ و مطالب سامنے آئے ہیں ان سب کا نچوڑ یہی نکلتا ہے کہ ''تحقیق'' کھوج، تفتیش، دریافت، چھان بین، تلاش جستجو، صداقت،

اصلیت، اور حق کو ثابت کرنے کے ہوتے ہیں۔

گیان چند جین نے اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' میں تحقیق کے اصطلاحی معنیٰ کو یوں بیان کیا ہے:

''اردو اصطلاح تحقیق کے معنیٰ سچ یا حقیقت کی دریافت ہے۔'' 6

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''ریسرچ ایک حقیقت پنہاں یا حقیقت مبہم کو افشا کرنے کا با ضابطہ عمل ہے اور اسی تعریف سے تحقیق کا مقصد بھی صاف ہو جاتا ہے۔ نا معلوم یا کم معلوم کو جاننا، یعنی جو حقائق ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہیں انھیں کھوجنا، جو سامنے تو ہیں لیکن دھندلے ہیں ان کی دھند دور کر کے انھیں آئینہ کر دینا۔'' 7

تحقیق کی بنا پر مختلف شعبوں میں ہم اپنے خیالات کو وسعت دے سکتے ہیں۔ اس کے ذریعہ گزرے ہوئے زمانہ کے حالات و کوائف کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے گردش کر سکتا ہے۔ تحقیق کی بدولت ہم اس گونا گوں تہذیبوں کو اپنا سکتے ہیں جو ناپید ہو چکی ہیں۔ کلی طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق آدمی کو پوری کائنات سے رشتہ استوار کرنے میں مدد کرتی ہے۔

آج کل کا انسان ہر بات اور ہر کام میں بدیہی ثبوت چاہتا ہے، کیوں کہ موجودہ دور میں سائنس کا بول بالا ہے، اور سائنس بنا ثبوت پیش کیے ہر کام کی نفی کرتی ہے۔ تحقیق کے ذریعہ اس نفی کا ازالہ ممکن ہو جاتا ہے۔

تحقیق طریق کار کے تئیں عبدالرزاق قریشی نے محقق کی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محقق کا مطالعہ بہت وسیع ہونا چاہیے۔ اپنے مخصوص مضمون کے علاوہ اسے متعلق مضامین کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔ مثلاً اردو کے محقق کو فارسی لازمی طور پر جاننے کی ضرورت ہے۔ عربی جاننا بھی اس کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ قدیم اردو سے متعلق اودھی، برج، ہریانی وغیرہ سے واقفیت کے بغیر تحقیق ناقص ہوگی۔ ادب کے محقق کے لیے عہد متعلقہ

کے تاریخی ،معاشی و معاشرتی حالات کا علم بھی علم ضروری ہے۔اسے
عروض،مبادیات فلسفہ وتصوف وغیرہ سے بھی واقف ہونا چاہیے۔'' 8

نسیم اعظمی نے جن موضوعات پر تحقیق کی ہے وہ پوری ایمانداری اور غیر جانب داری سے کی ہے۔انھوں نے جو کتابیں مرتب کی ہیں،اس کا مقصد کتابوں کے دیباچوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔انھیں فارسی پر اچھی خاصی گرفت تو ہے ہی ساتھ ہی عربی پر بھی عبور حاصل ہے۔اودھی زبان سے بھی قدر واقف ہیں،اودھی زبان سے واقفیت کی وجہ جونپور میں ایک لمبے عرصے تک تدریس سے منسلک رہنے سے ہوئی۔برج اور ہریانی کے تعلق سے تو علم نہ ہوسکا،البتہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انھیں عہد متعلقہ کے تاریخی،معاشی ومعاشرتی حالات کے علم پر اچھی خاصی دسترس حاصل تھی۔

نسیم اعظمی حق گو ہیں۔وہ حق بات بولنے سے بالکل کتراتے نہیں۔تعصب اور غیر جانب داری کی عینک کبھی بھی آنکھوں پر نہ لگ سکی۔صلہ وستائش سے کوسوں دور ہیں۔غرض یہ کہ ایک اچھے محقق کے جتنے بھی اوصاف ہونے چاہیے وہ تقریباً ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ڈاکٹر راہیؔ ان کے اوصاف حمیدہ پر روشنی ڈالتے ہوئے رطب اللسان ہیں:

''نسیم اعظمی بنیادی طور پر تدریسی کم ادبی شخصیت ہیں اور اپنی ذات
ستودہ صفات سے ایک دور،ایک زمانہ،ایک تاریخ ہی نہیں فہم و
ادراک،علم و دانش،علم وعرفان،عروض وسخن کا بحر بیکراں،ایک درسگاہ
عظیم،مقیم فہیم بھی ہیں۔'' 9

موجودہ دور میں اتنی صفات کے حامل شخص بہت کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔دراصل ان کا رجحان بچپن سے ہی تعلیم وتعلم کی طرف راغب تھا۔مئوناتھ بھنجن کی دانش کدہ لائبریری کی کتابوں سے انھیں بے پناہ فائدہ ہوا۔وہاں کی ادبی مجلسوں سے ادبی پختگی ملی۔ان کا مطالعہ وسیع تھا،وہ ادب کے مطالعے میں سرسری گزرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس کی گہرائی میں اتر کر تحقیق کرنے کے قائل تھے۔تحقیق کے گرتے معیار کو دیکھتے ہوئے انھیں بے پناہ تکلیف ہوتی تھی،ان کا ماننا تھا کہ صرف ریسرچ اسکالر ہی نہیں بلکہ اساتذہ بھی تحقیق جیسے اہم فن کے گرتے معیار کے لیے ذمہ دار ہیں۔

موجودہ تحقیقی کام پر ظہیر حسن ظہیرؔ کو دیے گئے انٹر یو میں ایم نسیمؔ اعظمی نے اس کے گرتے معیار کے ذمہ داروں کے بارے میں بتلایا ہے:

''ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ایسے اساتذہ اور پروفسران اب کم ہی رہ گئے ہیں جو حقیقتاً اردو زبان وادب اور تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں ۔بیشتر اردو اساتذہ اور پروفسروں کی اپنی اولادیں اردو نہیں پڑھتی ہیں اور نہ یہ خود اردو اخبارات ورسائل اور کتب خرید کر پڑھتے ہیں۔بیشتر کی اردو تعلیمی بنیادیں بھی مستحکم نہیں ہیں۔ریسرچ اسکالروں میں بھی تحقیق کے لیے جس عرق ریزی محنت و مشقت ،تلاش وجستجو اور دریافت و انکشاف کے جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے ان میں نہیں ہوتا ہے۔ان کا اصل مقصد بھی جیسے تیسے مقالہ تحریر کر کے ڈگری حاصل کرنا اور ملازمت پانا ہوتا ہے۔اساتذہ میں بھی وسیع مطالعہ کی کمی کے باعث اچھی تحقیق نہیں ہو پاتی ہے۔ہر سال ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں میں سیکڑوں تحقیقی کے مقالوں میں چند ایک ہی ہوتے ہیں جن میں تحقیق اور ریسرچ کا حق ادا کیا گیا ہو۔اب تو یونیورسٹیوں کو پی ایچ ڈی ہولڈر پرو ڈکٹ کرنے والا کارخانہ کہا جانے لگا ہے۔تحقیق کے اس گرتے معیار کے لیے تعلیمی نظام ،ادارے اور اسکالروں سے کہیں زیادہ ذمہ دار ہمارے اساتذہ اور پروفیسران ہیں۔'' 10

مندرجہ بالا انٹریو کا اقتباس اردو کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز دونوں کے لیے بہت کڑوا اور تیکھا ہے پر حقیقت مبنی ہے۔عربی کا مقولہ ہے ''الحقُ مر'' حق کڑوا ہوتا ہے جو اس اقتباس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

نسیمؔ اعظمی کے تحقیقی خدمات کا جب بغور جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس فن پر اب تک ان کی کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔آثرؔ انصاری فکر وفن کے آئینے میں،نوائے سروش، آثرؔ انصاری حیات اور خدمات، آثرؔ انصاری پر چند تحریریں۔یہ چاروں کتابیں محمد ابو بکر آثرؔ انصاری کی حیات وخدمات پر مبنی ہیں۔یہاں ان کتابوں کا تجزیہ

پیش کیا جارہا ہے۔

1. آثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں

نسیم اعظمی کی یہ کتاب ترتیب اور مرتب شدہ تصانیف کے لحاظ سے اسے اولیت کا شرف حاصل ہے۔اردو کے معتبر شاعر اور ادیب محمد ابوبکر آثر انصاری کی شاعری اور شخصیت پر لکھے گئے زعمائے ادب کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب 1998ء میں شائع ہوئی۔

اس کتاب کو مرتب نے چار ابواب کے تحت تقسیم کیا ہے جو شخصیت ،شاعری، نثری تخلیقات اور منظوم تاثرات کے عنوان سے ہیں۔ یہ کتاب موصوف کے دیباچہ کے ساتھ تیس مضامین پر مشتمل ہے اور ایک سو پنچانوے صفحات پر محیط ہے۔ ''جائزہ''، ''آثر انصاری کی ایک نظم اور''آثر انصاری کا تنقیدی شعور'' جو صاحب مرتب کے مضامین ہیں وہ بھی شامل ہیں۔اس کے علاوہ خود آثر انصاری کا تحریر کردہ مضمون ''میری کہانی'' بھی شامل اشاعت ہے۔

آثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں جن زعمائے ادب کے مضامین شامل ہیں ان میں پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر طیب انصاری، ڈاکٹر ملک زادہ منظور، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، پروفیسر عبدالمغنی ،مظہر امام، علی جواد زیدی، رام پرکاش راہی، رضا نقوی واہی، پروفیسر تاج پیامی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر ہارون ایوب، ڈاکٹر انیس ادیب، ڈاکٹر منور انجم، ایس ایم عباس، احمد نثار جونپوری وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

آثر انصاری ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ایک اچھے ادیب ونثر نگار بھی تھے۔ان کے پانچ شعری مجموعے اور نثری تصانیف ''سفرحج کے شب وروز''،''تذکرہ سخنوران مئو''،''دبستان شبلی کے نامور انشاء پرداز''،''اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی'' اس بات کی غماز ہیں۔ گوشۂ گمنامی کو ترجیح دینے کے باوجود ان کی کاوشوں کو قدر وعزت کی نظر سے دیکھی گئی۔اہل بصیرت نے ان کی فنی خوبیوں کے اعتراف میں مضامین لکھے۔خود مرتب کے مطابق یہ مضامین ماہنامہ ''نکھار'' کا ''آثر انصاری نمبر'' شائع کرنے کے ارادے سے یکجا کیے گئے تھے،لیکن کچھ ایسے حلات رونما ہو گئے کہ جس کی بنا پر یہ نمبر شائع نہ ہو سکا۔ بعد میں

کتابی شکل میں منصۂ شہود پر آیا۔اس کے دیباچہ میں یوں رقم طراز ہیں:

''دیرضرور ہوئی لیکن مجھے خوشی ہے کہ میری ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل ہوگئی۔یہ غالباً 1988ء کی بات ہے کہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ آثر انصاری جیسے کہنہ مشق اور ممتاز شاعر و ادیب جو صلہ و ستائش سے بے نیاز گوشۂ گمنامی میں اپنے فکر و فن کا چراغ جلائے بیٹھے ہیں اور پکار رہے ہیں کہ ؎

مشعل فکر ذرا اتنی بلندی سے جلاؤ
دور تک فہم و بصیرت کا اجا لا جائے۔'' 11

آثر انصاری گوشۂ گمنامی میں تھے اس لیے نسیم اعظمی نے انھیں اور ان کی خدمات کو منظر عام پر لانے کے لیے ماہنامہ ''ادب نکھار'' کا آثر انصاری نمبر شائع کرنے کا اعلان کر دیا اور ملک کے مایہ ناز مبصرین و مفکرین اور ناقدین سے ان کی شاعری اور فن کے بارے میں تاثرات ارسال کرنے کی درخواست کی اور انھیں تاثرات کو یکجا کر کے آثر انصاری نمبر مرتب کر دیا گیا لیکن اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ماہنامہ نکھار کی اشاعت متاثر ہوگئی اور ماہنامہ کی جگہ ہفتہ وار اخبار ہو گیا اور یہ نمبر التوا میں پڑ گیا۔ملک کے مشاہیر اہل قلم حضرات نے آثر انصاری کی شاعرانہ بصیرت ،ان کی تخلیقات و تصانیف پر جس طرح اپنے تاثرات قلم بند کیے تھے،انھیں یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا۔

بقاء اعظمی اور حبیب اللہ اعظمی نے آثر انصاری کی شخصیت پر بہت خوبصورتی و خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی ہے حبیب اللہ اعظمی نے ان کے بچپن سے لے کر اپنے مضمون کے لکھنے کے وقت تک کی زندگی کو بڑے توازن کے ساتھ پیش کیا ہے۔بحثیت شاعر کے سلسلے میں پہلا مضمون پروفیسر احتشام حسین کا ہے جو نہایت مختصر مگر بہت جامع ہے۔ڈاکٹر ملک زادہ منظور کا مضمون بھی بڑا متوازن اور بھر پور ہے۔تمام مضامین کے حوالہ سے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''اس مجموعۂ مضامین میں شامل زعمائے ادب اور نقادان فن کے مضامین جہاں آثر انصاری کی ادبی وشعری خدمات کا اعتراف ہیں

> وہیں ان کے علمی وادبی سرچشموں کے کئی نئے گوشوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں جس پر آنے والے وقت میں ادب کے اسکالرز ضرور توجہ دیں گے، ایسا میرا یقین ہے۔'' 12؎

''جائزہ'' آثر انصاری کی ایک نظم ہے جو آزادی کے قبل اور بعد کے حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جس کا تجزیہ نسیم اعظمی نے بڑے والہانہ اور منصفانہ انداز میں کیا ہے۔ اس نظم میں شاعر کے دل کا درد جا بجا ابھر کر سامنے آتا ہے۔ تینتالیس اشعار پر مشتمل یہ نظم اپنے موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے مکمل اور کامیاب ہے۔ اشعار کی تعداد کے لحاظ سے اس متوسط نظم کا کینوس کافی وسیع ہے۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

شکوہ ہائے جو رو استبداد تا بکے
زندگی منت کش فریاد آخر تا بکے
بات کچھ بنتی نہیں بے وجہ قال و قیل سے
جائزہ لینا پڑے گا اک ذرا تفصیل سے 13؎

''جائزہ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے مضمون نگار نے اسے بیسویں صدی کے اواخر کی معرکتہ الآرا نظم قرار دیا ہے۔ لیکن اس نظم میں انھیں جوشؔ کی گھن گرج اور اقبالؔ کی فلسفیانہ موشگافی نظر نہیں آتی، البتہ ان دونوں بڑے شاعروں کے فکری اور جذباتی اثرات اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہاں ان کی جس نظم کا تجزیہ مقصود ہے وہ بیسویں صدی کے تقریباً نویں دہے میں لکھی گئی معرکتہ الآرا نظم ''جائزہ'' ہے۔ اس نظم میں نہ تو جوشؔ جیسی گھن گرج ہے اور نہ ہی علامہ اقبالؔ جیسی فلسفیانہ موشگافی۔ پھر بھی ان دونوں بڑے شاعروں کے فکری اور جذباتی اثرات موجود ہیں۔ یہ نظم آزادی سے پہلے اور بعد کے حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جس میں آثر انصاری نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے

سیاسی، سماجی، اقتصادی حالات، تہذیبی اور اخلاقی تصورات کا تقابلی
جائزہ پیش کیا ہے۔'' 14؎

نسیم اعظمی کا دوسرا مضمون ''آثر انصاری کا تنقیدی شعور'' کے عنوان سے شامل ہے، اس میں انھوں نے تخلیق اور تنقید کے رشتے پر مدلل بحث کرتے ہوئے شاعر اور فنکار کے اندر موجود تنقیدی شعور کو منظرعام پر لانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ قلی قطب شاہ سے آثر انصاری تک کے خاص شعراء کے اشعار میں تنقیدی بصیرت کا جو اظہار ملتا ہے، اسے انھوں نے شعراء کے اشعار کے ساتھ ثبوت کے طور پر پیش کیے ہیں ان میں ملا وجہی، ولی دکنی ،سودا، میر ،غالب، آتش، آبرو، ناسخ ،اور خورشید الاسلام کے نام نمایاں ہیں۔

آثر انصاری کے مجموعہ کلام ''زبان غزل'' کی پہلی غزل اس مضمون میں مکمل طور پر نقل ہوئی ہے کیوں کہ اس غزل میں تاثرات وجذبات کی ترجمانی کرنے کے ساتھ غزلیہ تنقید میں شاعر کے تنقیدی خیالات کی عکاس نظر آتی ہے۔ آثر انصاری کی شعری اور نثری تصانیف میں موجود تنقیدی شعور کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''آثر انصاری بنیادی طور پر شاعر ہیں اور غزل گو شاعر ہیں ان کی شاعرانہ اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اس لیے خواہ مخواہ انھیں نقاد بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہاں صرف ان کی مختلف شعری اور نثری تصانیف میں موجود تنقیدی شعور کے اظہار کی نشان دہی کرنا اصل مقصد ہے اور یہ نمایاں حقیقت ہے کہ آثر انصاری کے اندر پختہ تنقیدی شعور اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ موجود ہے۔'' 15؎

کتاب کے آخری باب میں منظوم تاثرات کو جگہ دی گئی ہے، جس سے آثر انصاری کی قد آور شخصیت کو سمجھنے میں مزید معلومات فراہم ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کا آخری مضمون ''آثر انصاری کی تصانیف'' کے عنوان سے بقاء اعظمی نے سپرد قرطاس کیا ہے، جس میں آثر انصاری کی تمام تخلیقات وتصنیفات کا اجمالی تعارف اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ سال اشاعت اور تقسیم کار کا بھی ذکر در آیا ہے۔ امیر احمد

صدیقی ''آثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مرتب کی اس کاوش کو قابل تحسین بتلایا ہے:

''ایم نسیم اعظمی صاحب کا یہ کام یقیناً قابل تحسین ہے کہ انھوں نے بڑی کاوش کے ساتھ آثر انصاری کے سلسلے میں گرانقدر مضامین حاصل کیے اور انھیں ایک کتابی صورت دے کر موصوف کی شاعرانہ اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔اس کتاب سے آثر انصاری صاحب کے مقام و مرتبہ کو متعین کر نے میں مدد ملے گی۔'' 16

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نسیم اعظمی نے آثر انصاری کی شاعری اور نثری خدمات پر ملک کے نامور ناقدین اور نئے قلم کاروں کے وقتاً فوقتاً لکھے گئے مضامین کو مرتب کر کے ان کی ہمہ جہت تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

2. نوائے سروش

یہ کتاب دراصل آثر انصاری کی حمد و نعت کا مجموعہ ہے جسے نسیم اعظمی نے مرتب کیا ہے۔آثر انصاری کے پانچوں شعری مجموعوں کو دیکھا جائے تو اس میں غزل، نظم، رباعی، اور قطعات تو باقاعدہ طور پر شامل ہیں لیکن ان کی حمد و نعت سے یکسر خالی ہیں۔نسیم اعظمی نے ان کی حمد و نعت کو بڑی مشقت سے اکٹھا کر کے دیباچہ کے ساتھ شائع کیا ہے

لفظ نعت اردو میں ان اشعار کے لیے مختص ہے جو صرف اور صرف سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی شان مدوحہ میں کہے گئے ہوں۔عربی میں اس کے لیے مدح کا لفظ مستعمل ہے جس کا اطلاق نثر اور نظم دونوں پر ہوتا ہے۔

کسی انسان کی تعریف و توصیف اگر اس کی زندگی میں بیان کی جائے تو اس کو مدح کہتے ہیں اگر یہی اس کے مرنے کے بعد کی جائے تو اس کو مرثیہ کہتے ہیں، لیکن سید المرسلین رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی ذات اقدس اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے۔آپؐ انسان کامل ہیں، آپؐ کی حیات طیبہ اور بشری صفات اعلیٰ و ارفع ہیں، آپؐ کی مدح و ثناء قرآن کریم میں اللہ نے جا بجا فرمائی ہے۔قرآن کریم آپؐ کے اخلاق

اور سیرت طیبہ کا بہترین آئینہ ہے۔ حفیظؔ جالندھری لکھتے ہیں:

ثناء خواں جس کا قرآں ہے ثناء ہے جس کی قرآں میں
اسی پر میرا ایماں ہے وہی ہے میرے ایماں میں

اللہ کے رسولؐ کے زمانے میں جب کفار قریش کے اشعار ہرزہ سرائی سے لبریز ہوا کرتے تو آپؐ نے اس ہرزہ سرائی کا جواب دینے کے لیے حسان بن ثابتؓ، عبداللہ بن رواحہ کو جوابی اشعار لکھنے کا حکم دیا جس کا مرکزی لب لباب مدح رسالت ہی ہوتا تھا۔ آپؐ نے بعض اوقات مسجد نبوی میں بیٹھ کر مدحیہ اشعار (نعتیہ اشعار) کی سماعت فرمائی۔ آپؐ کی مدح میں سب سے پہلے جس نے زبان کھولی وہ آپؐ کے مشفق و مربی، محسن عم ابوطالب تھے۔

اردو شاعری کو بھی نعت گوئی میں دیگر زبانوں کی طرح ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس صنف شاعری میں اردو شعراء نے آپؐ کی الفت و محبت کے حوالے سے ایک الگ پہچان بنائی ہے۔

اردو شعراء نے ہر دور میں آپؐ کی شایان شان اپنے اپنے انداز سے مدح و توصیف کا نذرانہ پیش کیا اور ثناء خوان رسول کی مبارک فہرست میں انھیں شرف بازیابی بھی میسر ہوا۔ انھیں شعراء کی فہرست میں ایک نام آثرؔ انصاری کا بھی ہے۔

نام محمد ابوبکر، تخلص آثرؔ (عبدالرحمٰن اچڑؔم نے تخلص آثرؔ رکھا تھا) مومن انصار برادری سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اپنے تخلص آثرؔ کے ساتھ انصاری لکھنے کا لاحقہ لگایا اور آثرؔ انصاری کے نام سے مشہور بھی ہوئے۔

محمد ابوبکر آثرؔ انصاری کی ولادت مشرقی اتر پردیش کے صنعتی شہر مئو ناتھ بھنجن کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں 1923ء میں ہوئی۔ ان کے والد محمد مصطفےٰ صفاؔ انصاری کا شمار مئو کے استاذ شعراء میں ہوتا تھا اور دادا مولانا سلطان احمد (بانیِ مدرسہ دارالعلوم۔ مئو) کے کا شمار اپنے دور کے اہم عالموں میں ہوتا تھا۔ ان کے گھر پر شعر و ادب کی محفلیں گرم ہوا کرتی تھیں۔ تلامذہ حضرات اصلاح لیتے۔ ایسے علمی و ادبی ماحول میں آثرؔ انصاری کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ 2005ء میں اس دنیا سے رحلت فرمائی۔

آثرؔ انصاری نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی شاعری کو جلا بخشنے میں غزلیہ

شاعری کا اہم کردار رہا ہے۔ان کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ۔ان کی غزلوں میں خود غزل اپنی دلکشی، دل ربائی اور حسن و جمال کے ساتھ ساتھ اپنی گونا گوں خصوصیات اور منفرد لب ولہجہ سے مزین نظر آتی ہیں۔ وہ ایک قادرالکلام اور باشعور فنکار ہیں۔ان کا کلام قدیم و جدید کے امتزاج کا ایک حسین سنگم معلوم ہوتا ہے۔

آثر انصاری نے حمد و نعت بہت کم لکھی ہیں، انھوں نے اس صنف سخن کو مذہبی عقائد کے اظہار کے طور پر ہی اپنایا ہے۔ان کے نزدیک حمد یہ و نعتیہ شاعری کی حیثیت ضمنی ہے جو دیگر شعرائے اردو کا بھی طریقہ رہا ہے۔اب تک ان کا صرف ایک حمد یہ و نعتیہ شاعری کا مجموعہ ''نوائے سروش'' کے نام سے ان کے ہر دلعزیز شاگرد ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے اپنے پر مغز دیباچہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔آثر انصاری کی جتنی بھی حمد و نعت دستیاب ہو سکی ہیں وہ اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، آثر انصاری کی شخصیت اور حمد یہ و نعتیہ کلام کے بارے میں ''نوائے سروش'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''آثر انصاری کی شخصیت اردو دنیا کے لیے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے لیکن اب تک ان کی جتنی بھی شعری اور نثری تصانیف شائع ہوئی ہیں وہ انھیں معیاری غزل گو، بہترین نظم نگار اور صاحب طرز نثار کی حیثیت سے ہی پیش کرتی ہیں۔آثر انصاری ایک اعلیٰ پایہ کے حمد نگار اور نعت گو بھی ہیں اس سے شاید کم ہی لوگوں کو واقفیت ہے لہٰذ حمد و نعت کا یہ مختصر ترین انتخاب آثر انصاری کی حمد یہ اور نعتیہ شاعری کا جہاں تعارف کرائے گا وہیں اردو کی معیاری شاعری میں اضافہ بھی کرے گا۔'' 17

نسیم اعظمی کے نزدیک آثر انصاری اردو کے نعت گو شعراء میں ایک ایسے خوش نصیب شاعر ہیں جن کی لکھی ہوئی نعتیں ان کے جیتے جی ادبی محفل میں شہرت دوام حاصل کر چکی تھیں۔نسیم اعظمی کے مطابق ان کی نعت بیشتر مروجہ شعری ہیئت میں سپرد قرطاس ہوئی ہیں، یعنی زیادہ تر غزل، مثنوی اور قطعہ کے فارم میں ملتی ہیں۔وہ نعت کی حقیقی روح اور شعری و فنی معیار سے واقف ہیں۔سرور کونینؐ سے محبت و الفت کو جب شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں تو قاری کے قلوب و اذہان میں تلاطم بپا ہو جاتا ہے، وہ صرف پڑھتا ہی نہیں بلکہ نعت

کے دوامی کیف وسرور سے بھی لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔آثر انصاری کی قلبی پکاران کے قلم کی دھنک رنگ سے ان کے وجود کو بھی جلوہ گر کیے رہتا ہے۔ وہ صرف اپنی قلم سے نعت کے فن کو قرطاس کے سپرد ہی نہیں کرتے بلکہ وہ قارئین وسامعین کے قلوب میں نعتوں کے روحانی سرمائے کو منتقل کردینے کے ہنر سے واقف نظر آتے ہیں جس سے کہ ان کی نعت صرف ایک شخص کی نہیں بلکہ پوری امت کی فریاد بن جاتی ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

رحم کیجیے مرے سرکار مدینے والے
ہم ہیں نا واقف اسرار مدینے والے
آپ ہی روزِ جزاء ساقیِ کوثر ہوں گے
آپ ہیں سید ابرار مدینے والے
سارے عالم کے لیے باعث تخلیق ہیں آپ
سارے نبیوں کے ہیں سردار مدینے والے

آثر انصاری کی حمدیہ ونعتیہ شاعری کی امتیازی خصوصیات اور شعری وفنی حسن کے بارے میں نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''ان کی حمد ونعت میں عقیدت کی زیریں لہریں اور جذباتی کیفیات شعری وفنی حسن سے ہم آہنگ ہوکر عقیدت وشاعری کی اعلیٰ قدروں کا مجموعہ بن گئی ہیں اور یہی آثر انصاری کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔'' 18؎

الغرض آثر انصاری کے تئیں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انھوں نے بارگاہِ رسالت مآب میں اخلاص و محبت سے اپنی فکری بصیرتوں اور فنی صلاحیتوں سے اس صنف کو بام عروج تک پہنچانے میں کشادہ ذہنی اور وسیع النظری کا جو بین ثبوت پیش کیا ہے،اسے نسیم اعظمی نے منظر عام پر لایا۔ جسے اردو شعروادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

3. آثر انصاری حیات اور خدمات

نسیم اعظمی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر ویر بہادر سنگھ پروانچل یونیورسیٹی جونپور نے 2000ء میں انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔ دراصل ان کا پہلے 1989ء میں ریسرچ کے لیے بنارس ہندو یونیورسیٹی میں رجسٹریشن ہوا تھا اور موضوع ''اردو تنقید آزادی کے بعد'' طے پایا تھا۔ پروفیسر حنیف نقوی کی نگرانی میں انھوں نے بہت سا ابتدائی کام بھی کرلیا تھا کہ اچانک والد کے انتقال کے سبب ذہن منتشر ہونے کے بنا پر ریسرچ کے کام کو چھوڑ دیا۔ 1995ء میں انھوں نے دوبارہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کا ارادہ کیا، اس بار ''آثر انصاری حیات اور خدمات'' کے موضوع پر آثر انصاری اور ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر منور انجم لکچرر ڈی سی ایس کے پی جی کالج مئو سے تذکرہ کیا، جس پر دونوں حضرات نے خوشی کا اظہار کیا۔ ویر بہادر سنگھ پروانچل یونیورسیٹی جونپور میں رجسٹریشن کی کاروائی کے بعد انھوں نے ریسرچ کا کام ڈاکٹر منور انجم اور ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی کی مشترکہ نگرانی میں کیا۔ یہ مقالہ تقریباً ڈگری تفویض ہونے کے پانچ سال بعد شائع ہوا۔ تاخیر سے شائع ہونے پر نسیم اعظمی کو بے حد افسوس ہوا تھا کیوں کہ ان کی خواہش تھی کہ آثر انصاری کی حیات میں شائع ہو جاتا تو وہ انھیں دکھاتے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ مقالہ اگرچہ بہت پہلے لکھا گیا تھا جس پر 2000ء میں ویر بہادر سنگھ پروانچل یونیورسیٹی جون پور نے راقم کو ڈاکٹر آف فلاسفی (Ph.D) کی ڈگری عنایت کی تھی۔ اسے بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیے تھا مگر بعض نا گزیر حالات کے پیش نظر ایسا ممکن نہ ہو سکا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے کیونکہ اس درمیان الحاج آثر انصاری (وفات 7رجنوری 2005ء) اور ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی اس دنیا سے رحلت فرما گئے اگر یہ دونوں بزرگ باحیات ہوتے تو شاید اس کتاب کی اشاعت پر انھیں کافی خوشی ہوتی مگر افسوس صد افسوس کہ ایسا ممکن نہ ہو سکا۔''[19]

موجودہ زمانے میں اردو کے بہت سارے ایسے قدآور ادباء وشعراء موجود ہیں جن پر تحقیقی مقالات لکھے جا سکتے ہیں، ایسے ادباء وشعراء کو نظر انداز بعض وجوہات کی بنا پر کر دیا جاتا ہے، جب کہ حقیقت

یہ ہونی چاہیے کہ اگر ان کے کارنامے ہیں جن پر تحقیقی مقالہ لکھا جا سکتا ہے تو انھیں ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ آثر انصاری کے تئیں بھی کچھ ایسا ہوا کہ مئو کے نام ونمود شعراء وادباء کو مسلکی تنگ نظری کی بنا پر خوب سراہا گیا اور انھیں نظر انداز کیا گیا، لیکن نسیم اعظمی نے ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور وہاں کے ادب شناس لوگوں کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا جو مسلکی تنگ نظری سے آزاد تھے۔ اپنے مقالہ کی ابتدا میں انھوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ آثر انصاری کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ چناچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اردو میں جہاں بہت قد آور ادباء وشعراء پر بے شمار تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں وہیں کچھ ایسے اہم اور قابل ذکر شعراء وادباء کو بالکل نظر انداز بھی کیا گیا ہے جنہوں نے ہمارے شعروادب کی ترقی میں اپنا خون جگر صرف کر کے اسے گل وگلزار بنانے میں کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ بیس ویں صدی کے انہیں شعراء میں آثر انصاری کا بھی شمار ہوتا ہے۔'' 20؎

''آثر انصاری حیات اور خدمات'' چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں علمی و ادبی ماحول، سیاسی وسماجی ماحول اور تہذیبی وتمدنی ماحول کا بہت تفصیلی جائزہ مگر تاریخی شواہد کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ باب دوم میں سوانح وشخصیت کا جائزہ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ جس میں نام ونسب، خاندانی شجرہ، سیرت و شخصیت، مذہب ومشرب، اخلاق وعادات، سلسلہ شعروسخن، تصنیفات وتالیفات، انعامات واعزازات اور تلا مذات، تقریباً تمام پہلو درآئے ہیں۔ باب سوم شاعری پر منحصر ہے جس میں غزل گوئی، نظم نگاری اور قطعہ نگاری کا تاریخی وتنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کی روشنی میں آثر انصاری کی شاعری کے صحیح مقام ومرتبے تلاش کیے گئے ہیں۔ باب چہارم آثر انصاری کی نثر نگاری پر مبنی ہے، جس میں تذکرہ نگاری اور تنقید نگاری کے تاریخی تناظر میں ان کی نثر نگاری کا مقام ومرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ اس مقالہ میں اختتامیہ اور کتابیات بھی موجود ہے۔

کتاب کے اول باب میں نسیم اعظمی نے مئوناتھ بھنجن کی علمی، ادبی، تہذیبی، سیاسی وثقافتی پس منظر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے لیے انہوں نے ڈاکٹر مومن محی الدین، قاضی اطہر مبارکپوری، ڈاکٹر

سید مجاور حسین، عبدالسلام مبارکپوری، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا سید سلیمان ندوی، مشہور مورخ مولانا ضیاء الدین برنی، رام گوپال، پنڈٹ جواہر لال نہرو، ڈاکٹر سید عابد حسین، آرسی دت، مولانا الطاف حسین حاؔلی کی تحریروں کا مطالعہ کیا اور حوالوں کے ساتھ پیش کیا۔

اس شہر کی علمی، ادبی اور شعری سرگرمیوں کے ماحول کو جلا بخشنے میں یہاں سے شائع ہونے والے جن اخبارات ورسائل کا اہم کردار رہا ہے ان کی تفصیلات دی ہے مثلاً اس دیار کا کا پہلا رسالہ ''العلم'' جو مولانا مبین چریا کوٹی (1860-1956) زیرادارت شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ''المعروف'' ''ہم چشم'' اور ''ادب نکھار'' نامی رسالہ بھی شائع ہوتے رہے۔ ''ادب نکھار'' کے مدیران ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اور بقاء اعظمی تھے۔ یہاں کے پبلی کیشنز کے تحت ''نکھار ادبی ایوارڈ'' سے کئی شعراء وادباء کو سرفراز کیا گیا۔ یہاں کے علمی، ادبی اور صحافتی ماحول کے فروغ میں مئو کے ماہنامہ ''آثار جدید'' ''نوائے دارالعلوم'' ''دیروز ویکلی'' اور '' بنکر کی دنیا'' وغیرہ رسائل واخبارات کے ساتھ مدارس اور اسکول وکالج کے نمایاں خدمات کا ذکر بھی اس باب میں شامل ہے۔

اخبار ورسائل کے تذکرے کے بعد انھوں نے انجمن پنجاب کے مشاعروں سے ترقی پسند تحریک کے زریں دور تک کے کلاسیکی غزل گو شعراء کے کلام کی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہوئے آثؔر انصاری کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور ان کے اشعار نقل کرتے ہوئے انھیں روایت میں جدت کا متلاشی کلاسیکی شاعر کہا ہے مثلاً لکھتے ہیں:

> ''آثؔر انصاری کا شمار روایت میں جدت کا متلاشی کلاسیکی شعراء میں ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نہ کسی ازم یا خارجیت کی پابند ہے اور نہ ہی روایت سے بغاوت کے بہانے ننگا ہونے کی منظر کشی کرتی ہے بلکہ روایت میں جدت کی بہترین مثال ہے اور ان کی اس کلاسیکی شاعری کے ڈانڈے ناصر کاظمؔی، فراقؔ گورکھپوری، حسرتؔ موہانی، اصغرؔ گونڈوی اور داغؔ دہلوی وغیرہ شعراء کے توسط سے میر تقی میرؔ تک جا ملتے ہیں۔'' 21؎

مئو ناتھ بھنجن کے سیاسی و سماجی ،تہذیبی و تمدنی ماحول کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے لین پول ،مسٹر بین،حکیم شبیر،ڈاکٹر مومن محی الدین ،گیا نند پانڈے،سید سلیمان ندوی،ڈاکٹر سید عابد حسین،ابولکلام آزاد،ڈاکٹر محمد حسن،مولانا عبیداللہ سندھی، پنڈٹ جواہر لال نہرو،عبدالملک سالک جیسے مقتدر صاحب نقدو نظر شخصیتوں کی تصانیف کے حوالوں سے آثر انصاری کے عہدو ماحول کی عمدہ عکاسی کی کوشش کی ہے۔

پہلا باب قدرطویل ہوگیا ہے،اس کی طوالت کی وجہ بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''لہٰذا پہلا باب قدرطویل بھی ہوگیا ہے اور ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا کیوں کہ کوئی بھی عہد و ماحول اچانک نہیں پیدا ہو جاتا ہے بلکہ اس کے بننے میں ایک مخصوص تاریخی تسلسل کارفرما ہوتا ہے اور اس تاریخی تسلسل کو سمجھنا ضروری ہے۔'' 22؎

اس کتاب کا دوسرا باب سوانح وشخصیت پر مبنی ہے،جس میں نام ونسب سے متعلق انھوں نے آثر انصاری کی کتاب ''تذکرہ سخنوران مئو'' اور مضمون ''میری کہانی'' کی روشنی میں چھ صفحات لکھے ہیں۔جس سے نام ونسب کے ساتھ تعلیم وتربیت پر مفصل معلومات فراہم ہوجاتی ہے۔اس کے بعد خاندانی شجرہ رکھا گیا ہے جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آثر انصاری کے آباواجداد مذہب اسلام قبول کرکے پارچہ بافی کا پیشہ اختیار کیا اور مومن انصاری برادری سے منسلک ہوکر انصاری کہلائے۔نسیم اعظمی کو خاندانی معلومات اکٹھا کرنے میں کافی دشواری اٹھانی پڑی تھی،جس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''کسی شاعر یا ادیب کے حالات زندگی کا بیان بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔لیکن راقم کو اس بارے میں کافی دشواریوں سے گزرنا پڑا ہے۔کیوں کہ آثر انصاری کے حالات زندگی کے بارے میں نہ تو اب تک کوئی کتاب شائع ہوسکی ہے اور نہ ہی کہیں اور سے کوئی مواد مل سکا لے دے کے ''تذکرہ سخنوران مئو'' میں انہی کے ہاتھوں کا لکھا مختصر ترین تعارف اور ایک مختصر تعارفی وسوانحی مضمون ''میری کہانی'' کے علاوہ کہیں سے کچھ بھی دستیاب نہ ہوسکا اس لیے ان کی زندگی کی ابھی بہت

سی لڑیاں سامنے آنے سے رہ گئی ہیں پھر بھی جو کچھ بن پڑا ہے اسے
پوری چھان بین کے بعد صحیح طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی
ہے۔'' 23؎

یہاں نسیم اعظمی کی تحقیق کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے حقائق کی کھوج و دریافت میں کن مشکلات کا سامنا کیا ہے۔

نسیم اعظمی نے آثر انصاری کی شکل و شباہت کا نقشہ بڑے اچھے پیرائے میں کھینچا ہے جس سے ان کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتی ہے کیوں کہ یہ ناچیز بھی ان کی شکل و شباہت سے قدر واقف ہے۔ اس لیے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انھوں نے ان کی شخصیت کے خدوخال اور ان کی سیرت و کردار کے چند پہلوؤں کے ذریعہ ان کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر کو پیش کیا ہے۔ یہاں پر ان کے پانچ جملے نقل کیے جاتے ہیں:

''آثر انصاری کا قد لمبا، رنگ گندمی، بدن چھریرا، آنکھیں بڑی بڑی اور
روشن، پیشانی اوسط نہ کم نہ زیادہ، آواز مدھم مگر باوزن اور باوقار۔''
''آپ صرف لکھتے پڑھتے وقت عینک کا استعمال کرتے ہیں جو اس بات
کی علامت ہے کہ نزدیک کی روشنی کمزور ہے مگر آپ کی دور بینی اور
دروں بینی کا زمانہ قائل ہے۔''
''آپ کی باتوں میں صداقت کے تیکھے پن اخلاقی جرأت اور ادبی
چاشنی کی آمیزش ہوتی ہے۔''
''آپ بیک وقت سخی اور کفایت شعار دونوں ہیں۔''
''آپ کی شکل و شباہت اور گفتار و کردار میں بڑء یکسانیت ہے اور یہی
آپ کی خاص پہچان بھی ہے۔'' 24؎

نسیم اعظمی کے مطابق آثر انصاری کا خاندان علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی حالات سے دلچسپی رکھنے والے خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ تحریک خلافت اور کانگریس کی تحریک آزادی میں ان کے والد کافی دلچسپی رکھتے تھے، وہ خود شاعر بھی تھے اور صفا تخلص کرتے تھے۔ آثر انصاری کو بھی جذبۂ آزادی اور شعر و شاعری کا

خمیر وراثت میں ملا تھا۔نسیم اعظمی کہتے ہیں مولانا محمد علی جوہر،مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی،مولانا حسرت موہانی،مولانا محمودالحسن اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی مذہبی اور سیاسی زندگی سے انھیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا جس کا اعتراف جا بجا ملتا ہے۔شروع شروع میں کانگریس پارٹی کے رکن بھی رہے پھراس پارٹی کے ردعمل کے طور پر انھوں نے کمیونسٹ پارٹی سے ناطہ جوڑ لیا۔

آثر انصاری رنگ سازی (پارچہ بافی کے تعلق سے رنگ سازی) کے کام سے منسلک تھے۔یہ کام ان کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ان کی شاعری میں جا بجا عشقیہ اشعار ملتے ہیں جس کی بنا پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا مزاج عاشقانہ اور طبیعت حسن پرستانہ تھی۔لیکن نہ تو ان کی کتابوں سے اور نہ ہی ان کے اوپر لکھے گئے تحقیقی مقالے اور مضامین سے یہ بات ثابت ہوسکی۔البتہ نسیم اعظمی نے ان کے اس جذبہ کے اظہار کی تکمیل کے بارے میں جب بھی جاننے کی کوشش کی تو انھوں نے صرف اتنا کہا:

> ''خدا کا شکر ہے کہ میں بیوی اور اولاد کے بارے میں خوش قسمت ہوں۔'' 25

اس ضمن میں مزید روشنی ڈالتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

> ''آثر انصاری کی غزلوں کے بے شمار عشقیہ اشعار ان کے شدید عشقیہ جذبات، عاشقانہ مزاج اور حسن پرستانہ طبیعت کی چغلی کرتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ آثر انصاری کو ان کی آئیڈیل بیوی مل گئی ہے جو بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے عشقیہ جذبات کا مرکز خیال بھی ہے اور اگر ایسا ہے تو یقیناً یہ رومان پسند شاعر خوش قسمت بھی ہے جب کہ عموماً ایسا نہیں ہوتا ہے۔'' 26

آگے آثر انصاری کے مسلک کے بارے میں بتایا کہ وہ حنفی مسلمان تھے اور نامصائب حالات میں بھی مذہب کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ان کے مطابق اخلاق وعادات میں کسی قسم کی بناوٹ نہیں تھی۔ان کی شخصیت کی پاکیزگی اور دلکشی میں اسلامی تعلیمات اور بزرگان دین کی صحبتوں کا خاص اثر رہا۔خودداری اور سادہ مزاجی ان میں اپنے نقطۂ عروج پر دکھائی دیتی تھی۔وہ لکھتے ہیں:

''اردو شعراء میں میر تقی میرؔ، مولانا حسرتؔ موہانی اور علامہ اقبالؔ کی طرح اگر کسی غزل گو شاعر میں خودداری اور سادہ مزاجی اپنے نقطۂ عروج پر دکھائی دیتی ہے تو وہ صرف آثرؔ انصاری تھے۔'' 27؎

نسیمؔ اعظمی نے اس باب میں آثرؔ انصاری کے بارہ اہم تلامذات کا مختصراً اجمالی تعارف پیش کیا ہے ،جن میں ڈاکٹر منور انجم، ڈاکٹر شفیق اعظمی، ڈاکٹر وکیل اشہرؔ، ڈاکٹر مختار احمد دلؔ حسینی ،احسان اعظمی ،اظہرؔ انصاری، بسملؔ انصاری، ماسٹر خلیل الرحمٰن تمناؔ، ماسٹر رام کمار سنگھ فہیمؔ، مولوی عبدالمنان ایمنؔ، وحید الزماں سحر کامرانی اور آخر میں خود ڈاکٹر ایم نسیمؔ اعظمی کا بھی ہے۔ جس سے آثرؔ انصاری سے ان کا شرف تلمذ کا بین ثبوت بھی مل جاتا ہے۔ ان بارہ اہم تلامذات میں جنھیں سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی ،ان کے بارے میں ڈاکٹر امین انعامدار لکھتے ہیں:

''ان میں (میری ناقص معلومات کے مطابق) جو شہرت اور مقبولیت ڈاکٹر ایم نسیمؔ اعظمی کو حاصل ہے وہ دوسروں کو حاصل نہیں ہوسکی۔ اگر چہ شاعری میں ان کی دلچسپی کم ہے لیکن نثری ادب اور تعلیمی میدانوں میں آپ کی گرانقدر خدمات لائق تحسین وصد مبارکباد ہیں۔'' 28؎

اس کتاب کا باب سوم آثرؔ انصاری کی شاعری پر محیط ہے، جس میں تین ذیلی عنوان غزل گوئی، نظم نگاری اور قطعہ نویسی پر منحصر ہے۔ اس باب کے شروع میں نسیمؔ اعظمی نے غزل کے گام بہ گام تدریجی اور ارتقائی منزلوں کو جو چار صدیوں سے عرب اور ایران سے آکر پھیلی ہوئی ہے، اس کی روداد امیر خسروؔ سے آثرؔ انصاری تک کی تفصیل کو اختر انصاری، پروفیسر آل احمد سرور، سید ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر وزیر آغا، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، نیاز فتحپوری، میر تقی میرؔ، مولانا حالیؔ، حکیم عبدالحئ، محمد اسلم سیفی جیسے مستند ادب شناس اہل قلم کے حوالوں سے نہایت فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ اپنے موقف کو وضاحت سے پیش کیا ہے، انھوں نے آثرؔ انصاری کی پوری شاعری کو چھ ادوار میں منقسم کیا ہے۔

انھوں نے آثرؔ انصاری کی شاعری میں غزل کے بنیادی اور روایتی موضوع عشق ومحبت ہی کو بتایا ہے۔ نسیمؔ اعظمی کے مطابق ان کی غزلوں میں یہ موضوع اردو شاعری کا روایتی ہی نہیں رہتا بلکہ ان کا خود کا حقیقی

بن جاتا ہے۔اسیس کے خیال میں ان کے یہاں نت نئے تجربات ومشاہدات فکری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کرایک انفرادی تنوع بن جاتے ہیں، جس سے ان کی غزلیں روایت کی اثر پذیری کے دریچے کھولنے لگتی ہیں اور کلاسیکی رچاؤ کی علامت کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔انھوں نے آثر انصاری کی شاعری کے بتدریج ارتقاء پر مدلل بحث کرتے ہوئے ان کی غزلیہ شاعری کو نہ محض روایتی بتلایا اور نہ ہی تقلیدی۔ان کی غزلوں میں تین انفرادی ان امتیازی خصوصیات کا ذکر کیا ہے جس سے اردو غزل کی تاریخ میں آثر انصاری کی انفرادی عظمت تسلیم کرنے والوں کے لیے کافی ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ''آثر انصاری کی غزلیہ شاعری کو نہ محض روایتی کہا جا سکتا ہے نہ ہی تقلیدی ہونے کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔کیوں کہ ان کی غزلوں میں تین ایسی انفرادی خصوصیات ہیں جو اردو غزل کی تاریخ میں ان کی انفرادی شاعرانہ عظمت تسلیم کروانے کے لیے کافی ہیں۔
>
> (1)حسن وعشق میں عصری حسیت اور جمالیات کی حسن کاری۔
>
> (2)ہندوستانی ارضیت اور تہذیبی عناصر کی ترجمانی۔
>
> (3)مواد و ہیئت میں لطیف توازن۔'' 29؎

آگے انھوں نے آثر انصاری کی نظم نگاری کا جائزہ پیش کیا ہے،جس میں پہلے نظم کی تعریف ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر احتشام حسین، اور ڈاکٹر وزیر آغا کے قیمتی آرا اقتباسات کی روشنی میں کی گئی ہے۔اس کے بعد تاریخی شواہد کی روشنی میں نظم کے بتدریج ارتقاء پر قدر تفصیل بات ہوئی ہے۔نظم نگاری کے فروغ میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کا ذکر کرتے ہوئے نظم میں ہیئت اور نئے تجربات پر انھوں نے بات کی ہے۔انجمن پنجاب، نظم سوسائٹی اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو نظم نگاری نے جو کروٹیں لی ہیں اس پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی ہے۔جو ادب کے قاری کے لیے مفید اور کارآمد ہیں۔

نسیم اعظمی کے مطابق آثر انصاری نے اپنی شاعری کا آغاز نظم ''جوانوں کے نام'' کی تخلیق سے کیا تھا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے ''انگریزوں بھارت چھوڑو'' 1942ء کی تحریک کے زیر اثر ان کی شعری تصنیف ''آئینہ در آئینہ'' ہے جس میں ستائیس نظمیں شامل ہیں۔ان کے خیال

میں ان کی سب سے طویل نظم ''جائزہ'' ہے۔

آگے انھوں نے آثر انصاری کی نظموں کے اسلوب کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا اسلوب روایتی اور کلاسیکی ہے۔موضوعات عصری تقاضوں کے پیش نظر وسعت و ہمہ گیری سے لبریز ہے۔ان کا انداز بیان سادہ اور سلیس ہے۔جس طرح انھوں نے غزل کی طرف توجہ دی اس طرح نظم کی طرف متوجہ نہ ہوئے، جس کے سبب ان کی شعری تخلیق میں نظم ثانی درجہ اختیار کرگئی۔نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اگر آثر انصاری نے اپنی غزل گوئی کی طرح نظم نگاری پر بھی پوری سنجیدگی اور دلجمعی سے توجہ دی ہوتی تو وہ غزل کی طرح نظم نگاری میں بھی ایک نمایاں مقام و مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے کیوں کہ ان کے اندر کلاسیکیت اور روایت میں تازہ کاری کے ساتھ اعلیٰ پایہ کی نظم نگاری کے بہتر امکانات موجود تھے۔'' 30

نسیم اعظمی نے اس باب کا آخری ذیلی عنوان قطعہ نگاری رکھا ہے،جس میں قطعہ کی معنویت اور اس کی روایت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور اردو کے مشہور قطعہ نگار شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے آثر انصاری کی قطعہ نگاری کو واضح طور پر ان کے خیالات و موضوعات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد نے قطعہ پر جو اعتراض کیے تھے:

''قطعہ ایک نامکمل سی صنف ہے اس کے نام سے تکمیل کی کمی ظاہر ہے۔صوری حیثیت سے مطلع و مقطع کے نہ ہونے کی وجہ سے اس میں کچھ کمی سی معلوم ہوتی ہے۔'' 31

نسیم اعظمی بھی پروفیسر کلیم الدین احمد کی رائے کو بڑی حد تک درست مانتے ہیں لیکن اس اقتباس سے جو مطلب نکالا جانے لگا ہے اس سے انھیں اختلاف ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''پروفیسر کلیم الدین احمد کی رائے بڑی حد تک درست بھی ہے۔لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ قطعہ میں بہتر شاعری کے امکانات مفقود ہیں۔اردو میں اچھے اور معیاری قطعات کے نمونے تو ابتداء سے ہی

پائے جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی مختصر ہے کہ تعداد کی کمی کی بنیاد پر
انہیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔'' 32

اس کتاب کا باب چہارم جو آخری باب ہے، آثر انصاری کی نثر نگاری سے متعلق ہے۔ اس باب میں دو ذیلی عنوان ہیں جو تذکرہ نگاری اور تنقید نگاری پر مبنی ہیں۔ تذکرہ نگاری کے تئیں سب سے پہلے اردو تذکرہ نگاری کا اجمالاً تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ میر تقی میر کے نکات الشعراء سے آب حیات تک تقریباً چون تذکروں کا ذکر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے کیا ہے، ان چون تذکروں میں جسے خاص شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کا تذکرہ نسیم اعظمی نے کیا ہے اور فرمان فتحپوری، امتیاز علی عرشی، سید فتح علی گردیزی، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، پروفیسر کلیم الدین احمد، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جیسے اہم صائب الرائے حضرات کے حوالوں سے بیش بہا قیمتی معلومات سپرد قرطاس کیے ہیں۔ اس کے بعد آثر انصاری کا تذکرہ ''سخنوران مئو'' کی ادبی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

آثر انصاری کا تذکرہ ''سخنوران مئو'' جو فنی اور تکنیکی اعتبار سے ایک مکمل تذکرہ ہے، اس تذکرہ کے بارے میں نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''آثر انصاری کا تذکرہ ''سخنوران مئو'' اردو تذکرہ نگاری میں اس لیے
اہمیت کا حامل ہے کہ خطۂ اعظم گڑھ کا وہ علاقہ جو صدیوں سے
علمی، ادبی، صنعتی اور تہذیبی مرکز رہا ہے وہاں کے شعراء کا تذکرہ لکھ کر آثر
انصاری نے انہیں شعروادب کی تاریخ میں محفوظ کردیا ہے۔'' 33

اس باب کا دوسرا اور آخری عنوان تنقید نگاری پر مشتمل ہے۔ نسیم اعظمی نے اردو میں تنقید نگاری کی باقاعدہ ابتداء کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی کے ''مقدمہ شعروشاعری'' کو زیر بحث لایا ہے۔ لیکن ان کا ماننا یہ بھی ہے کہ اس سے پہلے اردو میں تنقید کا وجود ہی نہیں تھا قطعی اور کلی طور پر درست نہیں ہے، اردو تذکروں میں قدیم مشرقی انداز تنقید کے نقوش کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے انھوں نے ان کی تاریخی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

نسیم اعظمی نے آثر انصاری کی نثری تصانیف ''سخنوران مئو''، ''دبستان شبلی کے نامور انشاء

پرداز''، ''اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی'' اور'' سفر حج کے شب و روز'' کو تنقیدی نقطہ نظر سے جانچا پرکھا ہے ہیں۔آثر انصاری کے تنقیدی شعور پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''آثر انصاری کی تنقید کا انداز ہ اردو کا قدیم انداز نقد ہے۔وہ زندگی کے سبھی معاملوں میں اپنی تہذیب، اپنی روایت اور کلاسیکیت سے خود کو الگ نہیں کر پاتے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور تذکرہ نگاری اور تنقید ہر جگہ اردو کی تہذیب اور روایت بولتی دکھائی دیتی ہے۔'' 34

اردو شعر و ادب کی بنیاد صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو وہ مشرقی اساس پر ہی قائم نظر آتی ہے۔مغربی اثرات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں تو ہیں لیکن اس کے باوجود مشرقی طرز تنقید اردو شعر و ادب کی بنیادی اساس سے جڑے رہنے کی وجہ سے اس کا باقی رہنا بھی فطری عمل ہے۔آثر انصاری کے ذہنی افق میں مشرقی روایت اور تہذیب اپنی جگہ مسلم ہے۔ان کی مشرقی تہذیب کے بارے میں نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''آثر انصاری کی تنقید میں مشرقی انداز سے ادب کی جانچ پرکھ کرنے کی جو کوشش ملتی ہے وہ بہر حال اپنی جگہ اہم ہے اس لیے ان کا طرز تنقید پرانی بوتل میں نئی شراب کی مثل ہے اور موجودہ دور کے نقادوں میں آثر انصاری بحیثیت نقاد اہمیت کے حامل ہیں۔'' 35

اس کتاب کے آخر میں اختتامیہ ہے جس میں آثر انصاری کے شعری و نثری اقتباسات کو نسیم اعظمی نے اتنے فنکارانہ چابک دستی سے پیش کیا ہے کہ ان کی تمام جملۂ خصوصیات نمایاں ہو جاتی ہے۔نسیم اعظمی نے اس کتاب کی تحقیق میں بہت محنت صرف کی اور اسے سائنٹفک طریقہ سے اسے جانچا اور پرکھا ہے ان کی اس تحقیقی کاوش کے بارے میں ڈاکٹر عتیق الرحمٰن لکھتے ہیں:

''یہ کتاب نسیم اعظمی صاحب کی تحقیقی کاوش کا بہترین نمونہ ہے جس میں ان کی تحقیقی دقت نظری اور سائنٹفک طریقۂ کار نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔'' 36

ڈاکٹر محبوب راہی نے نسیم اعظمی کے اس پی ایچ ڈی کے مقالہ کے بارے میں بڑے بے باک

انداز میں ارباب ذوق ادب کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ان کی تحقیقی خوبیوں کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ظاہر ہے یہ عصر حاضر میں دانشگاہوں میں جاری بدعنوانیوں، رشوت ستانیوں، اقرباپروریوں اور غلط بخشیوں کے متعفن ماحول میں بوالہوسوں کے اشعار حسن پرستی کے ہاتھوں آبروئے شیوۂ اہل نظر کی نیلامی کے نتیجے میں کا تا اور لے دوڑی کی مصداق غصب کردہ سند کا حاصل پی ایچ ڈی کا مقالہ نہیں کہ بقول غالبؔ ''کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے'' بلکہ بہتر اعتبار فخر وانبساط کے ساتھ چھپوا کر ارباب نقد ونظر سے داد وستائش کے حصول اور سرخروئی کا سبب تھا لہٰذا خوب کی ایم نسیمؔ اعظمی نے محض پی ایچ ڈی کی سند کے حصول تک بات نہ رکھی (جو ظاہر ہے موصوف کا منتہائے مقصد ہوگا بھی نہیں) اور اپنے استاد مرحوم آثرؔ انصاری کے ظاہر اور مخفی کارہائے نمایاں کو ارباب ذوق ادب کے روبرو پیش کر دیا اور یونیورسیٹیوں میں جاری غلط کاروں کے منہ پر زناٹے دار طمانچہ رسید کیا یہ کہہ کر کہ ''دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا۔'' 37

آثرؔ انصاری حیات اور خدمات کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ نسیمؔ اعظمی نے اس مقالے میں اپنی صلاحیتوں، دیانتداریوں، طرز استدلال اور دور حاضر کے معیار نقد کے مطابق آثرؔ انصاری کی حیات وتخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے جو تجزیہ پیش کیا ہے اس سے ان کی تحقیقی انہاک اور جستجو کا پتہ چلتا ہے اور حقائق کو دیانت داری سے پیش کرنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔

4. آثرؔ انصاری پر چند تحریریں

نسیمؔ اعظمی کی تحقیقی تصانیف میں ''آثرؔ انصاری پر چند تحریریں'' بھی اہم ہے۔ یہ ان کی مرتب کردہ ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو آثرؔ انصاری (مرحوم) کے فن اور شخصیت پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ ان کے استاد محترم ڈاکٹر انیس ادیبؔ نے لکھا ہے اور پیش لفظ خود مرتب کا تحریر کردہ ہے۔ اس مرتب کردہ مضامین کے

مجموعے میں کل چھبیس مضامین ہیں جن میں تین مضامین ''آثر انصاری کی شعری جمالیات''، ''غزل کا فن اور آثر انصاری'' اور ''آثر انصاری کچھ یادیں کچھ باتیں'' نسیم اعظمی کے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب 2011ء میں منظر عام پر آئی۔

آثر انصاری کے انتقال کے بعد متعدد اخبارات و رسائل میں ان کی شاعری اور شخصیت پر مضامین شائع ہوئے تھے، ان تمام مضامین کو اکٹھا کر کے شائع کرنے کے لیے ان کے صاحبزادوں نے نسیم اعظمی سے کہا، انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی۔ جیسا کہ کتاب کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''محترم آثر انصاری کے انتقال کے بعد ان کی شاعری اور شخصیت سے متعلق خبارات و رسائل میں چند ایک مضامین شائع ہوئے تھے جس سے متاثر ہوکر آثر انصاری مرحوم کے صاحبزادوں نے ناچیز سے کہا تھا کہ کچھ لوگوں سے مزید مضامین لکھوا کر ان مضامین کا انتخاب بھی شائع ہو جاتا تو بہتر ہوتا چنانچہ ان کے جذبوں کے پیش نظر میں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور اپنے ہمدرد قلمکاروں سے بعض اچھے مضامین لکھوائے مگر ان کے صاحبزادگان کا جذبہ وقت کے ساتھ سرد پڑتا گیا اور میرے قلمکار کرم فرماؤں کا تقاضا بڑھتا گیا چنانچہ اسی تقاضے کی تکمیل کے طور پر مضامین کا مجموعہ ''آثر انصاری پر چند تحریریں'' کے نام سے کتاب کی شکل میں آپ کے پیش نظر ہے۔'' 38

اس کتاب میں نسیم اعظمی کا ایک مضمون ''آثر انصاری کی شعری جمالیات'' کے عنوان سے ہے، اس میں انھوں نے شعری جمالیات کی اصطلاح پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اغراض ومقاصد کو بھی بیان کیا ہے، جس سے اردو کے شعری جمالیات کی تمام ادبی خصوصیات کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ ان کے مطابق شعری جمالیات کے مدنظر جو مقام ومرتبہ فراقؔ اور مجروحؔ کو حاصل ہے وہی مرتبہ آثر انصاری کو بھی حاصل ہونا چاہیے تھا لیکن انھیں یہ مرتبہ نہ مل سکا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''آزادی کے بعد فنی چابک دستی کے ساتھ شعری جمالیات کے برتاؤ

کے پیش رو کی حیثیت سے فراقؔ گورکھپوری اور مجروحؔ سلطان پوری کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن جمالیاتی اعتبار سے آثرؔ انصاری کا بھی شمار انھیں کے ساتھ کیا جانا چاہیے تھا مگر آثرؔ انصاری کی عزلت پسندی، صلہ و ستائش کی تمنا سے بے نیازی اور گمنامی نے اگر چہ ان کی شاعری کو شہرت نہیں عطا ہونے دی جس کے وہ واقعی مستحق تھے مگر ان کے شعری سرمایۂ گرانقدری کا انکشاف ضرور ہو کر رہے گا کیوں کہ آج کے سائنسی اور تحقیقی عہد میں کوئی حقیقت دیر تک اہل علم سے پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی۔'' 39؎

اس کتاب میں نسیمؔ اعظمی کا دوسرا مضمون ''غزل کا فن اور آثرؔ انصاری'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں اردو اصناف شاعری کی سب سے مشہور و معروف صنف ''غزل'' کی امتیازی اور مرکزی حیثیت پر تاریخی پس منظر پیش کرتے ہوئے بات کی گئی ہے۔ فارسی کے بڑے غزل گو شاعر حافظؔ شیرازی کے فن پر بات کرتے ہوئے نسیمؔ اعظمی نے بتایا کہ ایران میں غزل کو کبھی مقبولیت خاص و عام کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی جو اسے ہندوستان میں ہوئی، بلکہ یہ ایران سے جب ہندوستان میں داخل ہوئی تو اس نے کئی نشیب و فراز دیکھے، جس کی بنا پر اس صنف میں پختگی آئی، اور یہ ہندوستان میں اپنے آغاز سے آج تک اردو شاعری کا تاج بنی ہوئی ہے۔

نسیمؔ اعظمی نے آثرؔ انصاری کی غزلیہ شاعری کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے انھیں غزلیہ تہذیب اور اس کی کلاسیکی روایت کا سچا امین قرار دیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''آثرؔ انصاری غزل کی شاعری اور اس کے فن کے سچے آشنا شاعر ہیں اس لیے انھیں اردو غزل کا محض واجبی شاعر کہہ کر نہیں گزرا جا سکتا کیوں کہ ایسا کرنے سے غزل اور آثرؔ دونوں کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ وہ غزل کی تہذیب اور اس کی کلاسیکی روایات کے سچے امین بھی ہیں اور ہنگامۂ دروں خانہ کے سچے راز داں بھی ہیں۔ وہ غزل کے سارے حسن و قبح پر دسترس رکھتے ہیں۔ وہ غزل کے آغاز و ارتقاء اور اس میں پیش

آنے والے مختلف فکری فنی نشیب و فراز ۔اس پر ہونے والے
اعتراضات اوراس کی غلو آمیز تعریفات کے درمیان ایک متوازن اور
واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔'' 40

''آثر انصاری ۔کچھ یادیں کچھ باتیں'' جو خود نسیم اعظمی کا مضمون ہے،اس میں انھوں نے اپنے ادبی حالات وکوائف کو اجاگر کیا ہے،اور آثر انصاری کے حالات وزندگی اوران واقعات کو خاص طور پر بیان کیا ہے جس سے ان کی ادبی زندگی کو جلا ملی تھی ۔آثر انصاری کی ولادت سے لے کر آخری ایام زندگی تک کے تقریباً سارے نشیب وفراز کو بحسن خوبی پیش کیا ہے، چاہے وہ سیاسی ہوں یا سماجی ، مذہبی ہوں یا ادبی ۔

غرض نسیم اعظمی نے آثر انصاری کی نعتیہ شاعری کو مرتب کیا، ان کی زندگی میں لکھے گئے معتبر اہل قلم حضرات کے مضامین اکٹھا کر کے انھیں کتابی شکل دی ۔ان کے اوپر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد با قاعدہ طور پر تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے چھان بین کے بعد اسے بھی کتابی صورت میں پیش کیا۔ان کے انتقال کے بعد متعدد اخبار ورسائل کے مضامین اور ہمدرد قلمکاروں سے فرمائش کر کے بعض اچھے مضامین لکھوائے اور انھیں بھی مرتب کیا۔مجموعی طور پر محمد ابوبکر آثر انصاری کے چھ دہائیوں میں جو علمی ، ادبی ، شعری تحقیقی اور تنقیدی کارنامے تھے انھیں منظر عام پر لا کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

*****

حوالے

1 مولوی فیروزالدین، فیروزاللغات

2 عبدالرزاق قریشی، مبادیات تحقیق۔ص16

3 ایضاً۔ص16

4 ڈاکٹر گیان چندجین، تحقیق کا فن۔ص9

5 ایضاً۔ص9

6 ایضاً۔ص711 ایضاً۔ص13

8 عبدالرزاق قریشی، مبادیات تحقیق۔ص22

9 ڈاکٹر راہی ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بحثیت صحافی، نثر نگار اور شاعر'' مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص328

10 ظہیر حسن ظہیر، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی سے ایک ادبی ملاقات (انٹرویو) مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص109

11 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، آثر انصاری فکر و فن کے آئینے میں۔ص8

12 ایضاً۔ص9

13 ایضاً۔ص149

14 ایضاً۔ص149

15 ایضاً۔ص185-86

16 امیر احمد صدیقی (مبصر) آثر انصاری فکر و فن کے آئینے میں، مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی شخصیت اور جہات ، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص493

17 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، نوائے سروش۔ص7

18 ایضاً۔ص9

19 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، آثر انصاری حیات اور خدمات۔ص14

20 ایضاً۔ص12

21 ایضاً۔ص47

22 ایضاً۔ص13

23 ایضاً۔ص13

24 ایضاً۔ص25-124

25 ایضاً۔ص135

26 ایضاً۔ص135

27 ایضاً۔ص138

28 ڈاکٹر امین انعامدار، ''آثر انصاری: حیات اور خدمات ایک تجزیہ''مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص184

29 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، آثر انصاری حیات اور خدمات۔ص178

30 ایضاً۔ص258

31 پروفیسر کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر۔ص105

32 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، آثر انصاری حیات اور خدمات۔ص262

33 ایضاً۔ص281

34 ایضاً۔ص316

35 ایضاً۔ص321

36 ڈاکٹر عتیق الرحمٰن، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی ادبی خدمات،''مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ص336

37 ڈاکٹر محبوب راہی (مبصر) آثر انصاری: حیات اور خدمات، مشمولہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، 2015ء۔ ص445

38 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، آثر انصاری پر چند تحریریں۔ ص17

39 ایضاً۔ ص134

40 ایضاً۔ ص156-57

*****

(ب) تنقیدی خدمات

لفظ تنقید عربی زبان سے اسم مشتق ہے۔ جس کے معنی جانچنا، کھوجنا، پرکھنا اور حسن و قبح کے فرق کی پہچان کرانے کے ہوتے ہیں۔

جامع فیروز اللغات میں تنقید کے معنی یہ رقم ہیں:

''جانچ پرکھ، تمیز، ایسی جانچ جو اچھے برے کھرے کھوٹے میں تمیز کرے۔ تبصرہ۔ نقد۔ نقطہ چینی۔'' 1

تنقید کے معنی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جانچ پرکھ کے ہیں۔ جب ہم اسے اپنی سادہ اور سہل زبان میں بیان کریں تو اچھے اور برے، کھرے اور کھوٹے کے درمیان تفاوت کر کے اس کے محاسن و معائب اور صحیح مقام متعین کرنے کے ہوتے ہیں۔

اصطلاحی معنی کی روشنی میں یہ سپرد قرطاس کیا جا سکتا ہے کہ تنقید، فن پارے کے اس تجزیاتی عمل کا نام جس سے خوبیاں اور خامیاں عیاں ہو جائے، فن اور فن کار کا صحیح تعین ہو جائے۔ نقاد کا کام کسی بھی فن پارے کو فکری سطح پر لا کر اس کے وسیع تناظر میں عمل کرنے کا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ فن پارے کی تنقید کا کام عموماً تخلیق کار کے علاوہ کوئی دوسرا کرتا ہے۔ فرانسس بیکن نے وزن کرنے اور غور کرنے کو ضروری قرار دیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''تردید کرنے یا غلط ثابت کرنے کے لیے نہ پڑھو اور نہ ہر چیز کو سچ سمجھ لو اور اس پر اعتبار کر لو۔ محض گفتگو کرنے کے لیے بھی نہ پڑھو بلکہ وزن کرنے اور غور کرنے کے لیے پڑھو۔'' 2

اصطلاحی رو میں تنقید ادبی تخلیق کا تجزیہ کرنا اور مستحسن و اقبیح کا غیر جانب دارانہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔

فن یا فن پارے کو بغیر کسی تعصب اور بغیر کسی جانب داری کے اس کے مقام و مرتبہ کو تعین کرنے کو بعض نقاد تنقید کہتے ہیں۔ ان میں ایک نام میتھو آرنلڈ کا بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

دنیا میں جو بہترین باتیں معلوم ہیں یا سوچی گئی ہیں انہیں غیر جانب

دارانہ طور پر جاننے اور عام کرنے کی خواہش کا نام ہی تنقید ہے۔'' 3

آل احمد سرور تنقید کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' تنقید کے بغیر ادب ایسا جنگل ہے جس میں پیداوار کی کثرت ہے، موزونیت اور قرینہ کا پتہ نہیں۔'' 4

آل احمد سرور کے اس اقتباس سے پوری طرح متفق ہونا پڑتا ہے کہ صحیح معنوں میں تنقید فن اور فن پارے کو موزونیت اور قرینہ کی طرف گامزن کرتی ہے۔ ادب ایک گلشن ہے اور تنقید اسے گلشن بنائے رکھنے میں بے حد مددگار ثابت ہوتی ہے۔ تنقید دو طرح کی ہوتی ہے ایک نظریاتی اور دوسری عملی تنقید۔

نظریاتی تنقید

وہ تنقید ہے جس میں سپرد قرطاس ہوئی تحریروں میں فن اور ادب کے تعلق سے کوئی خیال، رجحان یا نظریہ پیش ہو، اور اس سے فن پارے اور فن کار کے متعلق کیوں اور کیسا ہونے کی بات بھی بیان ہوئی ہو۔ اس ضمن میں مولانا الطاف حسین حآلی کی تصنیف '' مقدمہ شعر و شاعری'' کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے کہ اس میں غزل کے تعلق سے لکھا ہے کہ شاعری کیسی ہونی چاہیے اور کیسی نہیں ہونی چاہیے۔ شاعری کے لیے تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ کو ضروری بتلایا گیا ہے۔ اشعار کو مستحسن ہونے کے لیے سادگی، اصلیت اور جوش کی طرف توجہ ملحوظ کرائی گئی ہے۔

نظریاتی تنقید کے بارے میں مزید وضاحت ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس طرح کی ہے:

'' نظری تنقید میں اصولوں کی بحث ہوتی ہے یعنی اس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ادب اور آرٹ کیا ہے؟ ان کی اہمیت اور ضرورت کیوں ہے؟ ان کا حسن کاری سے کیا تعلق ہے؟ ان کو زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے یا نہیں۔'' 5

اس طرح سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظریاتی تنقید میں فن پارے کے مسائل کو سمجھنے، اس کے حل بتلانے اور اصولوں کی صورت میں نئی رائے پیش کرنے کے ہوتے ہیں۔

عملی تنقید

وہ تنقید ہے جس میں کسی خاص نقطۂ نظر یا زاویہ نظر سے اصول نقد کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے فن پارے کو جانچنے اور پرکھنے کا عمل ہے۔ مثلاً ڈرامہ، ناول، افسانہ یا شعری تصنیف کا تجزیہ کرنا مارکس کے نظریہ ادب کے پیش نظر عملی تنقید ہے۔ حآلی کی تصنیف مقدمہ شعر و شاعری میں جو اصول و نظریات بیان ہوئے ہیں وہ اصناف شاعری پر عملی تنقید کا اعلی وارفع نمونہ ہے۔ اسی طرح علامہ شبلی نعمانی نے تقابلی تنقید کی صورت میں جو ''موازنہ انیسؔ و دبیرؔ'' میں پیش کیا ہے وہ بھی عملی تنقید کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی عملی تنقید کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''عملی تنقید اس کو کہتے ہیں جس میں کوئی نقاد بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں کسی وقت کے ادب اور آرٹ کے کسی مخصوص شاہ کار کو دیکھتا ہے، پرکھتا ہے اور ان کا جائزہ لیتا ہے۔ یعنی وہ ان پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے۔'' 6

اس طرح سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کو مخصوص اصول وضوابط کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کا نام عملی تنقید ہے۔

تنقید نگاری کی باقاعدہ ابتداء کے احوال سے اتنا ہم سب قدر واقف ہیں کہ مولانا الطاف حسین حآلی کی تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' کو اردو کی تنقیدی کتب میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی اردو ادب میں تنقید کے ابتدائی نقوش کسی نہ کسی صورت میں موجود تھے، لیکن وہ دھندلے تھے۔ یہ دھندلے نقوش ہمیں شعراء کے کلام، دیوان کے دیباچوں، مشاعروں، مکاتیبوں، تذکروں اور اساتذہ کرام کی اصلاحوں میں ملتے ہیں، جو آگے چل کر اردو تنقید کی عمارت کے بنیادی پتھر بنے جن سے اردو تنقید کی تعمیر ہوئی۔ نسیم اعظمی اس ضمن میں روشنی ڈالتے ہوئے رطب اللسان ہیں:

> ''یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو میں تنقید نگاری کی باقاعدہ ابتداء مولانا الطاف حسین حآلی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ کہنا اس سے پہلے اردو میں تنقید کا وجود ہی نہیں تھا یہ قطعی درست نہیں ہے۔

کیوں کہ اردو تذکروں میں قدیم مشرقی انداز تنقید کے نقوش اشارے اور مواد بھرے پڑے ہیں اور جن کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ فائز دہلوی کی کلیات کا مقدمہ جس میں شاعری کے فن، اصول اور اصناف پر بحث کی گئی ہے اردو کے ابتدائی تنقیدی کارناموں کی شہادت ہے۔ اسی طرح محمد باقر آگاہ نے اپنے اردو دیوان کے دیباچہ میں بڑی جامعیت کے ساتھ اصناف شاعری کا جائزہ پیش کر کے اپنے تنقیدی شعور و بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے جو اردو تنقید کے ابتدائی سرمایوں میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔'' 7

ہندوستان کے تقریباً تمام ادب کے ابتدائی مراحل شاعری سے ہی منسلک نظر آتے ہیں، اور یونان و عرب کی طرح یہاں بھی تنقید کی ابتداء شعراء کے تنقیدی شعور کے ذریعہ وجود پذیر ہوئی۔ ڈراموں پر لکھی گئی پہلی کتاب ''ناٹیہ شاستر'' کو یہاں کی ادبی تنقید کا باقاعدہ آغاز کا محور تسلیم کرنا درست معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں بھی ادب کے ابتدائی نقوش شاعری سے ہی وجود پذیر ہوئے اور یونان و عرب کی طرح ہندوستان میں تنقید کی ابتداء شعراء کے تنقیدی شعور کے ذریعہ Self criticism سے ہوتی ہے۔ قدیم کلاسیکی شعراء میں باقاعدہ تنقیدی شعور تھا اور ان کے اپنے عہد کے تنقیدی اصول تھے۔ ہندوستان میں ادبی تنقید کا باقاعدہ آغاز ڈراموں پر لکھی گئی پہلی کتاب ''ناٹیہ شاستر'' سے ہوتا ہے ------ جہاں تک شاعری کی تنقید کا سوال ہے سنسکرت میں بھی شاعری کے تقریباً وہی وصول پائے جاتے ہیں جو یونانی اور عربی شاعری کی تنقید میں موجود ہیں۔ اس پورے ادبی اور تنقیدی تاریخی تناظر میں ڈرج ذیل باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں:

(1) ہر تخلیق کار میں تنقیدی شعور موجود ہوتا ہے

(2) تخلیق اور تنقید کا وجود ساتھ ساتھ ہوتا ہے

(3) ہر ادب کا پہلا نقاد شاعر یا ادیب ہوتا ہے۔'' 8

اردو شاعری میں تنقید کے ابتدائی نقوش قلی قطب شاہ سے لے کر موجودہ دور کے تقریباً سبھی شعراء کے دیوان وکلیات میں بہت سارے ایسے اشعار موجود ہیں جس کے ذریعہ ان کی تنقیدی بصیرت کا اظہار واضح انداز میں موجود ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ کسی کے یہاں پختہ ہیں تو کسی یہاں کمزور۔ وجہؔی کی قطب مشتری میں تنقید کے ابتدائی نقوش کی جھلک صاف طرح سے دکھائی پڑتی ہے، انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ کچھ ایسی باتیں منظر عام پر لائیں جس کا پتہ اس دور میں اور موجودہ دور میں بھی پتہ نہ چل سکا۔ وجہی کے خیالات اتنے اہم اور قابل اعتناء تھے کہ آج کل کی تنقید بھی اس اصول وضوابط پر اپنی توجہ مرکوز کرتی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس
بھلا ہے جو اک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کرے بات میں
پڑیا جائے کیوں جز لے کر ہات میں
جسے بات کے ربط کا فان نیں
اسے شعر کہنے سوں کچ کام نیں
کرتو کئی بولنے کا ہوس
اگر خوب بولے تو یک بیت بس

ان کے علاوہ دوسرے شعراء کے بھی شعر ملاحظہ ہوں جو تنقید کے ابتدائی نقوش کی رہنمائی ہمارے لیے کرتے ہیں۔

ولؔی

یہ ریختہ ولؔی کا جاکر اسے سناؤ
رکھتا ہے فکر روشن جو انورؔی کے مانند

ہے ولؔی کی زبان میں شیرینی
اثر شعر سم ہے سم کی قسم

سوؔدا

استاد کی ہے ان کے انھوں کو یہ نصیحت
لفظی نہ تناسب ہو تو کچھ مت کرو تحریر
نہیں آفاق میں دلکش سخن بے تاثیر
گر اثر ہو تو کریں دل کو مسخر اشعار

میر تقی میرؔ

میرؔ شاعر بھی اور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب
کیا جانے دل کو کھینچتے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ ایسا طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

غالبؔ

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

آتشؔ

فکر بلند نے مری ایسا کیا بلند
آتشؔ زمین شعر سے پست آسماں ہوا

ناسخؔ

معنی ثمر، حرف ورق، صنعتیں ہیں گل
ناسخؔ ہے کلک فکر نہال سخن کی شاخ

شعراء کی ادبی چشمک سے بھی تنقید کو بڑھاوا ملا، ہوتا یوں تھا کہ ادبی چشمک کی بنا پر شعراء آپس میں

ایک دوسرے کی غلطیاں نکالنے میں ہمہ تن تلاش وجستجو میں رہا کرتے تھے خواہ وہ وجہیؔ اور غوصیؔ ہوں، انیسؔ و دبیرؔ ہوں، انشاؔء و مصحفیؔ ہوں یا غالبؔ و ذوقؔ۔ جہاں کہیں کوئی بھی غلطی نظر آتی تو اسے سر عام لایا جاتا، جس کسی کی غلطیاں ہوتیں یا نہ ہوتیں بہر کیف اپنے حریف پر سبقت لے جانے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑتا۔ جس کے نتیجہ میں تنقید کے اچھے اچھے پہلو منظر عام پر آئے۔

استاد الشعراء بھی تنقید جیسی اہم اکائی سے باور کرانے میں پیش پیش رہے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے شاگردوں کے کلام پر اصلاح اس بات کے بین ثبوت ہیں۔ اسی طرح تقریظ بھی ہمیں تنقیدی نقوش سے روشناس کراتی نظر آتی ہے۔ خطوط کے ذریعہ بھی اس کے نقوش کا پتہ چلتا ہے، کیوں کہ یہ مکتوب اور مکتوب الیہ کے بیچ ایک مکالمات پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے زمانہ میں زیادہ تر ادب سے دلچسپی رکھنے والے مکتوب الیہ کا استفسار یا کسی بھی فن پارے پر اس کی اپنی یا کسی دوسروں کی رائے موجود رہتی تھی وہ رائے بھی تنقید کے نقوش کی ضامن ہوا کرتی ہیں۔ اسی طرح سے اردو کے تذکروں میں بھی تنقید کے ابتدائی نقوش جا بجا نظر آتے ہیں۔

اردو کے زیادہ تر تذکروں میں شاعری کے اصول ومحاسن پر کہیں نہ کہیں بحث ضرور ملتی ہے جو اردو تنقید کی عمارت کے بنیادی پتھر کہے جاسکتے ہیں۔ تذکروں میں جو اصول ومحاسن پر خام مواد موجود ہے وہ اردو تنقید نگاری کے ابتدائی نقوش کہے جاسکتے ہیں۔

1867ء میں جب ''انجمن پنجاب'' کے ذریعہ منعقد اجلاس میں محمد حسین آزاد نے ادب وشاعری کے تنقیدی اصول ونظریات پر روشنی ڈالی اور اپنی نایاب کتاب '' آب حیات'' میں اردو شعراء کے تئیں اپنا تنقیدی اظہار خیال پیش کیا یہ بھی تنقید کے سلسلے میں اولین تنقیدی نمونے ہیں۔ پھر 1893ء میں حالیؔ نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں تنقید کے اصولوں سے جس طرح بحث کی ہے جو علحیدہ کتابی صورت میں مقدمہ شعروشاعری کے نام سے شائع ہوئی وہ پہلی اردو کی باقاعدہ تنقیدی تصنیف قرار پائی، اس طرح اردو میں حالیؔ سے تنقید کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔

تنقید کا لغوی معنیٰ جانچ پرکھ یا برے بھلے کی تفریق معلوم کرنے کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ادب

میں تنقید اس کو کہتے ہیں جس میں کسی فن کار یا فن پارے کے بارے میں اصول وضوابط کے مدنظر اس کے محاسن ومعائب کا اندازہ لگایا جائے اور رائے قائم کی جائے۔ عام لوگوں کے ساتھ کبھی کبھار خود ادبی نقاد گمراہی میں مبتلا ہو کر ادبی تنقید کا معنی ومفہوم غلط لے کر اس کو غلط طریقے سے استعمال کر کے ایک اچھے خاصے ادب پارے سے صرف خامیاں نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عمل کو تنقید نہیں بلکہ تنقیص کا نام دیا جائے گا، کیوں کہ تنقید برائے اصلاح ہوتی ہے نہ کہ برائے ہتک عزت۔

نسیم اعظمی نے مشرقی اور مغربی تنقید کے سبھی دبستانوں کا بغور مطالعہ کیا ہے لیکن نظریاتی تنقید پر ان کی باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں ملتی البتہ عملی تنقید کے تئیں اب تک تین گراں قدر تصانیف ''نقد سخن''، ''اردو کے چند فکشن نگار: تنقید وتجزیہ'' اور ''اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید وتجزیہ'' منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کتابوں میں شعری تنقید، فکشن تنقید اور تخلیق کار کے تئیں تنقید کے جو نمونے پائے جاتے ہیں ان کے مطالعہ سے ان کا تنقیدی نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔

ان کی تصانیف کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ تنقید کے اصولوں سے شعر و ادب اور فکشن کے ادب پاروں کی جانچ پرکھ کرتے ہیں مگر کسی مخصوص ادبی نظریے یا ادبی گروہ یا کسی تنقیدی دبستان کے پابند نظر نہیں آتے جس سے ان کی تنقید برائے تنقید معلوم ہوتی ہے۔

نسیم اعظمی نے عمومی تنقیدی ڈگر سے ہٹ کر ان شخصیات پر تنقید لکھی جن کے یہاں عمدہ اور پختہ افکار و خیالات ہیں۔ اس ضمن میں ''حقانی القاسمی'' نے اپنے مضمون ''ایم نسیم اعظمی کی میزان نقد میں مئو کے معاصرین'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے:

> ''ایم نسیم اعظمی نے عمومی تنقیدی ڈگر سے ہٹ کر ان شخصیات پر تنقید لکھی ہے جن کے یہاں اوریجنل افکار و خیالات ہیں، ماخوذ ومستعار نہیں اور جو نام نہاد تحریکات کے دائروں میں اسیر نہیں ہیں۔ جن کے پاس خودی بھی ہے اور خدا بھی ہے۔ ایم نسیم اعظمی کی بیشتر تنقیدی تحریروں میں بڑی شخصیات کے ساتھ وہ حاشیائی افراد بھی ہیں جن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔'' 9

یہاں ان کی تنقیدی کتابوں کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے جس کے مطالعہ سے ان کے تنقیدی نظریات پر روشنی پڑے گی۔

1. نقدِ سخن

نسیمؔ اعظمی کی تصنیف ''نقدِ سخن'' ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے 1995ء کے بعد وقتاً فوقتاً شعر و شاعری کے موضوع پر لکھے تھے۔اس تنقیدی مضامین کے مجموعے کا نام اردو کے معروف غزل گو ماہرؔ عبدالحئی نے ''نقدِ سخن'' تجویز کیا تھا۔نقدِ سخن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے 2010ء میں شائع ہوئی۔

''نقدِ سخن'' دو ابواب پر مشتمل ہے۔باب اوّل میں میرؔ، غالبؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، جمیلؔ مظہری، مجروحؔ سلطان پوری، وامقؔ جونپوری، فضاؔ ابن فیضی، اثرؔ انصاری، اظہرؔ انصاری، محبوب راہیؔ، منور راناؔ، فرازؔ حامدی، ساحرؔ شیوی، جونؔ ایلیا اور ماہر عبدالحئی جیسے معروف اساتذہ و شعراء پر مضامین ہیں۔باب دوم خاص نظموں سے متعلق ہے۔اس میں ولیؔ کی نظم ''در تعریف شہر سورت'' اقبالؔ کی نظم ''ساقی نامہ''، حرمت الاکرام کی نظم ''کلکتہ اک رباب''، کیفی اعظمی کی نظم ''دوسرا بنواس''، اثر انصاری کی نظم ''جائزہ''، شعیب شمس کی نظم ''نیلی گہرائیاں''، حنیفؔ ترین کی نظم ''باغی سچے ہوتے ہیں'' کا تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔

کتاب کے باب اوّل کا پہلا مضمون ''میر تقی میرؔ کا شعری تصوف'' کے عنوان سے ہے۔میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہر ارباب فکر و فن نے کیا ہے لیکن نسیمؔ اعظمی نے بڑے مدلل طور پر میرؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی صوفیانہ شاعری کو رواجی قرار دیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی شاعری کا وہ حصّہ جس میں صوفیانہ افکار و خیالات کی ترجمانی پائی جاتی ہے محض نظریاتی ہے اور میرؔ کی داخلیت اور دروں بینی سے ان کا تعلق محض واجبی ہے۔اس لیے میرؔ کی صوفیانہ شاعری کو اردو شاعری کی روایت کا حصّہ تصور کرنا بہتر ہوگا جس کا میرؔ کی حقیقی زندگی سے کوئی عملی سروکار نہیں تھا۔'' [10]

نسیم اعظمی نہ صرف انھیں داخلی طور پر صوفی ماننے سے انکار کرتے ہیں بلکہ وہ اس بات پر بھی اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے والد علی متقی اگر معروف صوفی ہوتے تو یقیناً اس عہد کے تذکرہ نگاروں کے یہاں ان کا نام ضرور آیا ہوتا، اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے اپنے والد علی متقی کو اپنے عہد کا اہم صوفی بتایا ہے۔ لیکن میر کے والد اگر اپنے دور یا کم از کم آگرہ کے ہی عام صوفی بھی ہوتے تو ان کا تذکرہ اس دور کے صوفیاء کے حالات میں کہیں نہ کہیں ضرور ملتا، مگر اس دور کے تمام تاریخی، نیم تاریخی، تہذیبی اور صوفیائی ماخذ میر کے باپ دادا کے وجود سے خالی دکھائی دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر نے اپنے آباواجداد کی بزرگی کے جو احوال قلم بند کیے ہیں وہ محض ان کی ذہنی اُپج کا نتیجہ ہیں جن کا تاریخی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' 11

نسیم اعظمی نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے میر تقی میر کی زندگی سے مختلف واقعات کو نقل کیا اور اپنے اس مضمون کے ذریعہ محققین کو ترغیب دی ہے کہ میر پر از سر نو تحقیق کی ضرورت ہے۔

نقد سخن کا دوسرا مضمون ''مرزا غالب کی فکری تشکیک کے چند پہلو'' کے عنوان سے ہے۔ بقول مصنف:

> ''غالب کی فکری تشکیک کے عناصر کا سب سے پہلے عبدالرحمٰن بجنوری نے پتہ لگایا تھا اور لبن کے ڈراموں میں پائے جانے والے تشکیلی عناصر سے غالب کی فکری اور شعری عناصر سے مماثلت تلاش کر کے غالب کی فکری تشکیک کو ایمان کا اہم رتبہ قرار دینے کی کوشش کی تھی۔'' 12

اس طرح غالب کے لب ولہجہ کی ندرت اور فکر و فن کی انفرادیت سے بحث کرتے ہوئے مصنف کتاب نے غالب کو اردو کا پہلا مفکر شاعر قرار دیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کی شاعری کو جو بقاء واستحکام حاصل ہے وہ ان کی فکری تشکیک کی ہی دین ہے۔

''اکبر الہ آبادی کی ظریفانہ شاعری''اس کتاب کا ایسا موضوع ہے کہ ادب کے قاری کے لیے عام اور اکبر کے فن کے لیے خاص ہے۔اکبر کی ظریفانہ شاعری کے حوالہ سے انھیں ظریفانہ شاعری کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اکبر الہ آبادی کی ظریفانہ اور طنزیہ شاعری کو ایک معیار تصور کیا جاتا ہے۔کیوں کہ اکبر نے جس انداز و معیار کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی ہے ایسی اکبر الہ آبادی سے پہلے اور بعد میں بھی کہیں مثال نہیں ملتی اور یہی ان کے اردو کے سب سے بڑے ظریفانہ شاعر ہونے کا سب سے بڑا اور ناقابل تردید ثبوت بھی ہے۔''13؎

''علامہ اقبال کی نظموں کے جمالیاتی پہلو'' کو پیش کرتے ہوئے مصنف نے دقیق نظری سے کام لیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کی شاعری اور ان کی نظموں میں ان کی فکری اور فنی اظہار کی امتیازیت کی طرح ان کے احساس جمالیات میں بھی وسعت و ہمہ گیری کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔'' 14؎

اسی طرح ''علامہ جمیل مظہری کی تغزلی جمالیات'' میں علامہ مظہری کی غزل گوئی میں فکر و فن کی رعنائی و حسن کے ساتھ ساتھ ان کی تغزلی جمالیات کو ہر جگہ وہ نمایاں دیکھتے ہیں اور اسے ان کی غزل گوئی کا بنیادی وصف بتاتے ہیں۔

جمیل اپنی سخنوری بھی فسوں گری ہے مصوری ہے
بنا کے تصویر مہ جبینوں کی رنگ بھرتا ہوں آرزو کا

''مجروح سلطان پوری کی شعری جمالیات'' میں مجروح کی شاعری کا سرمایہ محض غزلیات پر ہی مشتمل بتاتے ہیں جو غزل کی اختصاریت کی طرح مختصر بھی ہے۔مجروح کی غزلیہ شاعری کی دو بنیادی اور اہم ترین خصوصیات کو اجاگر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

’’1۔ ڈکشن (Diction) جسے خالص ہنرمندی کا نام دیا جاسکتا ہے۔

2۔ جمالیات (Aesthetics) جس کو عاشقانہ تجربات ومشاہدات میں پائی جانے والی دلکشی وحسن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔‘‘15

’’وامق جونپوری کی نظم نگاری‘‘ کے عنوان سے جو مضمون شامل کتاب ہے اس میں انھوں نے ان کی عوامی شاعری کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ امیر خسروؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی نے جو روایت قائم کی تھی بیسویں صدی میں اس کی مثال وامقؔ جونپوری اور بیکلؔ اتساہی کی شاعری میں ملتی ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں:

’’اردو شاعری میں امیر خسروؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی کی قائم کردہ عوامی اپیل کی روایت مختلف زبانوں میں مختلف نشیب وفراز سے گزرتی ہوئی آج بھی نہ صرف باقی ہے بلکہ بڑی حد تک ارتقاء پذیر بھی ہے جس کی بیسویں صدی میں سب سے بہترین مثال وامقؔ جونپوری اور بیکلؔ اتساہی کی شاعری ہے۔‘‘ 16

آگے انھوں نے وامقؔ کی نظموں کو خاص طور پر ’’بھوکا بنگال‘‘، ’’مینا بازار‘‘ اور ’’آنکھیں‘‘ وغیرہ کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وامقؔ نے اپنی شاعری میں عوامی اپیل بڑے پر زور انداز میں کی ہے ساتھ ہی ان کی نظموں کو اس سلسلہ میں نمونہ کے طور پر پیش بھی کیا ہے۔

اپنے مضمون ’’رباعی کا فن اور فضاؔ ابن فیضی‘‘ میں فضاؔ ابن فیضی کی رباعیات پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ان کی رباعیوں میں زندگی کی کڑوی اور کھردری سچائی کے ساتھ ساتھ ناہمواریٔ حالات کا مؤثر اظہار، فکروفن کی رنگینی ورعنائی اور لب ولہجہ کی لطافت وندرت کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور ان کی اس رباعی کو بطور خاص ذکر کیا ہے۔

حق بات کی تائید کروں تو مجرم
حالات پہ تنقید کروں تو مجرم
وہ جرم کی تخلیق کریں تو معصوم

ہم جرم کی تردید کریں تو مجرم

اس کتاب میں انھوں نے آثر انصاری پر بھی ایک مضمون ''غزل کا فن اور آثر انصاری'' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں انھوں نے آثر انصاری کو غزل کے فن اور اس فن کے سچے آشنا شاعر قرار دیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''آثر انصاری غزل کی شاعری اور اس کے فن کے سچے آشنا شاعر ہیں اس لیے انہیں اردو غزل کا محض عام یا واجبی شاعر کہہ کر نہیں گزرا جا سکتا کیوں کہ ایسا کرنے سے غزل کی صفت اور آثر انصاری دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔'' 17؎

اپنی غزلوں کو نیا انداز دینے کے لیے
میں روایت کی حسیں قدریں مٹا سکتا نہیں
غزل ثقافت و تہذیب کا حسیں سنگم
روایتوں میں بھی جدت ضرور چاہیے ہے

''ناتمام سفر'' کا شاعر اظہر انصاری کو ایک بہترین غزل گو، ڈاکٹر محبوب راہی کو ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر، منور رانا کی شاعری کو عصر حاضر کی بہترین شاعری، ڈاکٹر فراز حامدی کو عصر حاضر کا ایک کامیاب دوہا نگار تسلیم کرتے ہیں جن کے فنی و فکری اجتہاد سے دوہے کی ادبی، شعری اہمیت و افادیت میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

''ساحر شیوی کی شین ریو نگاری'' کے تعلق سے شین ریو کو ایک مختصر جاپانی نظم بتاتے ہیں جو ہیئت اور فارم کے لحاظ سے تو بالکل ''ہائیکو'' کی طرح تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ ایک مزاحیہ صنف ہے۔ زندگی اور سماج کا کوئی بھی موضوع اس میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں اس صنف شاعری پر طبع آزمائی کرنے کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''اردو میں اس صنف شاعری کو متعارف کرانے اور مقبولیت عطا کرنے والوں میں سید معراج جامی (پاکستان) اور ساحر شیوی (ہندوستان) کا

نام سرفہرست ہے۔‘‘ 18؎

دنیا دھوکہ ہے/دور اس سے رہنے کے لیے/کس نے روکا ہے
اردو کی یہ شان/جو بھی اس کو اپنائے/بن جائے
انسان

’’جون ایلیا منظر پس منظر اور شاعری‘‘ میں لکھتے ہیں کہ دنیا کے اہم ترین شاعروں کی طرح جون ایلیا کا شعری سرمایہ معیار و مقدار دونوں لحاظ سے کافی وسیع اور وقیع بھی ہے۔ ان کی شاعری میں فکر وفن، مواد ہیئت، زبان واسلوب، لب ولہجہ بہت دلکش نظر آتے ہیں۔

’’ماہؔر عبدالحئی ہری سنہری خاک کا شاعر‘‘ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہر عبدالحئی کی شاعری کے معاملہ میں انہیں اس میں ماضی کا عرفان وادراک، حال کا خلفشار وانتشار اور بحران، مستقبل کا امکان و احتمال نظر آتا ہے یعنی ماہؔر کی شاعری ان کے نزدیک ہمہ گیر اور زمانے کے دوش بدوش چلتی نظر آتی ہے۔

یہ تھا نقدِ سخن کے باب اوّل کا مختصر تجزیہ جس میں نسیم اعظمی نے ہر مضمون کے عنوان کے مطابق شاعروں کے خوبصورت اشعار کے ساتھ تشریحی پس منظر بھی پیش کیا ہے اور ہندو پاک کے ہر مکتب فکر کے شعراء کو جگہ دی ہے، جن میں روایت پرست، ترقی پسند اور جدید لب ولہجہ کے شعراء بھی شامل ہیں۔

نقدِ سخن کے دوسرے باب میں چند معروف شعراء کی مشہور نظموں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جس کا پہلا مضمون ’’ولؔی کی نظم در تعریف شہر سورت‘‘ ہے۔ اس نظم کو نسیم اعظمی نے اردو کی باقاعدہ اوّلین جغرافیائی نظم قرار دیا ہے۔

علامہ اقبالؔ کی مشہور نظم ’’ساقی نامہ‘‘ میں نسیم اعظمی کی تنقیدی بصیرت پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس ساقی نامہ کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علامہ اقبالؔ کے یہاں برجستگی اور زبان وبیان کے ساتھ ساتھ جذبہ واحساس کی شدت ہے جو اس کی انفرادیت بھی ہے اور معراج بھی مثلاً وہ لکھتے ہیں:

’’سادگی، برجستگی، زبان وبیان، اسلوب ولہجہ، جذبہ واحساس کی شدت

وروانی نے ساقی نامہ کو ایک ایسا کامیاب اور حیرت انگیز شعری تخلیق بنا دیا ہے جو اس ساقی نامہ کی انفرادیت بھی ہے اور معراج بھی۔'' 19ء

ان کے مطابق اس ساقی نامہ میں اقبالؔ نے اپنے ساقی سے ایک ایسے مئے عرفان کی تمنا کی ہے جس کے اندر انسانی سوز وساز کا ایک بے پناہ جہان آباد ہے۔

حرمت الاکرام کی اہم شعری تخلیق ''کلکتہ اک رباب'' پر نسیم اعظمی نے ایک مضمون لکھا ہے۔اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں کلکتہ جیسے مرکزی شہر کی معاشرتی اور سماجی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔بقول مصنف اس میں داخلی اور خارجی زندگی کی ایک ایسی کشمکش جاری رکھی گئی ہے کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں پاتا ان کے خیال میں نظم کا یہی دلفریب تجسس اس نظم کی جان ہے۔

نسیم اعظمی نے اپنے ایک مضمون کیفی اعظمی کی شاہکار نظم ''دوسرا بنواس'' کے حوالہ سے کیفی اعظمی کی تخلیقی بصیرت کا جائزہ لیا ہے۔ان کے مطابق یہ نظم ہندوستان میں سیکولرزم اور آپسی اتحاد کی علامت بابری مسجد کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ان کا کہنا ہے ان کے یہاں امید ورجا اور مایوسی کا حسین سنگم موجود ہے نہ تو وہ بالکل ناامید ہوتے ہیں کہ آس ختم کر کے بیٹھ جائیں اور نہ ہی اتنا پر امید رہے ہیں کہ صرف عمدہ عمدہ خواب اپنی آنکھوں میں سجائیں۔

نسیم اعظمی نے آثر انصاری کی نظم نگاری کی فنی ومعنوی خوبیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی نظم ''جائزہ'' کو کامیاب نظم بتایا ہے۔جس میں آزادی سے قبل اور بعد کے ہندوستان کے سیاسی،سماجی اور معاشرتی حالات کی ترجمانی بڑے ہی مؤثر اور دلنشیں انداز میں کی گئی ہے۔اس نظم سے کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

شعیب شمس کی ایک کامیاب شعری تخلیق ''نیلی گہرائیاں'' پر بھی انھوں نے تجزیہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں جزائر انڈومان نکوبار کی ساحلی زندگی پورے تاریخی،جغرافیائی اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ فطری اور سادہ انداز میں پیش کی گئی ہے۔نسیم اعظمی نے اس نظم کے متعلق لکھا ہے:

''جس طرح ٹی -ایس -ایلیٹ نے اپنی مشہور زمانی نظم ''خرابہ''(THE WASTERLAND) میں اپنے قاری کوایک انوکھےاور حیرت انگیز تجربوں کے ساتھ ایک مصنوعی اور غیر حقیقی شہر میں پہنچادیتا ہے۔اسی طرح شعیب شمس کی ''نیلی گہرائیاں'' کا مطالعہ کرتے وقت قاری ایک انوکھے،عبرت خیز شہر کی حقیقی اور فطری سیر کا لطف اٹھائے بغیر نہیں رہ پاتا اور یہی اس نظم کا سب سے بڑا وصف بھی ہے اور نقطۂ عروج بھی۔'' 20ے

اس کتاب کا آخری مضمون ڈاکٹر حنیف ترین کی نظم ''باغی سچے ہوتے ہیں'' کا تجزیہ پیش کیا ہے اور حنیف ترین کو اپنے دور کا حساس ترین شاعر بتایا ہے۔یہ نظم عالمی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔نسیم اعظمی نے اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت سارے روشن اور تاریک پہلوؤں کے ساتھ ساتھ حقائق پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس نظم کو عہد حاضر کا اہم معیاری شعری وتخلیقی کارنامہ بتایا ہے۔

کتاب کے مضامین سے کتاب کی اہمیت اور افادیت کے ساتھ ساتھ مصنف کی دقت نظری،عرق ریزی اور تلاش جستجو کے راستے کی صعوبتوں کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ڈاکٹر شہناز صبیح اپنے مضمون ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی ہمہ جہتی'' میں لکھتی ہیں:

''نقد سخن میں شامل تقریباً تمام مضامین ڈاکٹر ایم۔نسیم اعظمی کے تنقیدی شعور کی ہمہ جہت استعداد کا بین ثبوت ہیں اور ان کی یہ تنقیدی تحریریں اردو ادب کے معاصر تنقید نگاروں میں انہیں معتبر مقام کا مستحق قرار دیتی ہیں۔'' 21ے

نسیم اعظمی نے اپنی اس کتاب ''نقد سخن'' میں تمام موضوعات کے تجزیاتی مباحث میں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ رویہ اپنانے کی کوشش کی ہے۔نیز مختلف فن پاروں کے بارے میں اپنی تنقید آرا بھی پیش کیے ہیں۔

2. اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ

''فکشن کا لفظ ناول اور افسانہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اردو میں فکشن کے لیے افسانوی ادب کی اصطلاح بھی برتی گئی ہے،مگر چونکہ افسانہ ہمارے یہاں مختصر افسانہ کے لیے مخصوص ہوگیا ہے اس لیے افسانوی ادب کہا جائے تو پڑھنے والے کا دھیان مختصر افسانے کے سرمائے کی طرف جائے گا۔ ہم نہ صرف شارٹ اسٹوری کے لیے افسانے کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں بلکہ لانگ شارٹ اسٹوری Long short story کے لیے طویل افسانہ کی اصطلاح بھی برتتے ہیں،اس لیے میرے نزدیک ناول اور افسانہ دونوں کے سرمائے کے لیے فکشن اور فکشن کا ادب استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔''22 (پروفیسر آل احمد سرورؔ)

نسیم اعظمی کی تنقید کے سلسلے میں یہ دوسری کتاب ہے۔اس کتاب میں فکشن تنقید پر چوبیس مضامین اور مصنف کا ابتدائیہ ''اردو افسانہ- منظر پس منظر'' کے عنوان سے بھی شامل ہے۔ان کا یہ ابتدائیہ سرسٹھ صفحات پر مشتمل ہے جو فکشن کے حوالہ سے پر مغز اور جامع ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ انھوں نے فکشن تنقید کا مطالعہ بڑی گہرائی اور گیرائی سے کیا ہے۔ وہ مشرقی و مغربی افسانوی ادب کو بڑے اچھے اور سلیقہ سے برتنے کے ہنر سے واقف ہیں، ناولوں اور افسانوں پر بڑی مدلل اور متوازن رائے قائم کرتے ہیں۔فکشن کے ادب پاروں کے فنی و جمالیاتی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہوئے اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔عمومی طور پر یہ واضح ہے کہ تنقید نگار کسی ایک مخصوص مکتبہ فکر کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں اور اس کا اثر ان کے فن پارہ کی جانچ پرکھ سے بھی عیاں ہو جاتا ہے جب کہ نسیم اعظمی کسی بھی مکتبہ فکر یا دبستانی اصولوں کے پابند نظر نہیں آتے ہیں۔ بلکہ ان کے سارے تنقیدی مضامین میں کوئی نہ کوئی نظریہ نظر آتا ہے مطلب یہ کہ وہ تمام نظریات کی اہمیت کے قائل ہیں اور ادب کے مطالعہ میں عام نظریات کی اہمیت کو تسلیم بھی کرتے ہیں لیکن کسی ایک نظریہ یا اصول کو پابندی سے نہیں

اپناتے۔

اس کتاب کے مضامین اس طرح سے ہیں۔ پریم چند کا سدابہار داستانوی تشخص، پریم چند کا نظریہ فن وادب، مجنوں گورکھپوری اور اردو فکشن، عزیز احمد کے افسانوی امتیازات، سعادت حسن منٹو کی افسانوی انفرادیت، زندگی کی حقیقتوں کا افسانہ نگار: کرشن چندر، تعلیم سائنس وحکمت اور کرشن چندر، اردو کا لاجواب افسانہ نگار: راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اردو افسانہ اور کردار نگاری، قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری اور بیوروکریٹ معاشرت، قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری اور شعور کی رو کی تکنک، خواجہ احمد عباس: صحافت سے افسانہ نگاری تک، صالحہ عابد حسین اور ان کی افسانہ نگاری، بلونت سنگھ کے افسانوی طریقہ کار کی شناخت، سریندر پرکاش کے افسانوی امتیازات، ڈاکٹر علیم مسرور کے ناول ''بہت دیر کردی'' کا اجمالی جائزہ، ڈاکٹر علیم مسرور کا ادبی نقطہ نظر (بہت دیر کردی کے حوالے سے)، سہل ممتنع کا افسانہ نگار: سعید فریدی، ساجد رشید کی حقیقت اور افسانہ نگاری، شفق کا افسانوی افق، گھریلو سچائیوں کا افسانہ نگار: شاکر کریمی، ایس ایم عباس کی افسانہ نگاری، ایک بنکر نمائندہ افسانہ نگار: شرافت حسین، اکیسویں صدی اردو افسانہ اور اشتیاق سعید۔

کتاب کے ابتدائیہ میں موصوف نے برصغیر کی کہانیوں کی قدیمی روایات کا تذکرہ کرتے ہوئے اردو فکشن کی اصل روح پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انھوں نے ''اردو افسانہ۔ منظر پس منظر'' میں ''قصہ گوئی سے داستان گوئی''، ''اردو میں افسانہ نگاری کے ابتدائی نقوش اور آغاز''، ''اردو افسانہ بیسویں صدی میں''، ''اردو افسانہ اور ترقی پسند تحریک''، ''اردو افسانہ 1980ء کے بعد''، ''چند اہم خواتین افسانہ نگار''، ''اردو افسانہ اکیسویں صدی میں'' جیسے اہم ذیلی عنوانات پر بھی تنقیدی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔

انھوں نے کتاب کے دیباچہ کو ابتدائیہ کے عنوان سے لکھا ہے۔ ابتدائیہ میں کہانی کے ارتقاء پر تحقیقی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے جس سے فکشن کے بارے میں بہت اہم مواد فراہم ہوتا ہے۔ اس ابتدائیہ میں ''گناڈھیہ'' سے لے کر ''کتھا سرت ساگر'' کا بھی ذکر کیا گیا ہے جسے بعد میں فورٹ ولیم کالج میں ''بیتال پچیسی'' کے نام سے ترجمہ ہو کر مرتب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

''گناڈھیہ (315ق م) کو ہندوستان کا قدیم ترین کہانی کار مانا جاتا ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے اپنے زمانے میں بہت سی کہانیوں کی تخلیق کی تھی اور اس کی بہت سی کہانیاں لوگوں کے توسط سے دوسرے علاقوں اور دور دراز کے ملکوں میں بھی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ 1063ء سے 1088ء کے دوران پنڈت سوم دیوجین نے انھیں کی کہانیوں کو ''کتھا سرت ساگر'' کے نام سے مرتب کیا تھا اور یہی کہانیاں انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج (کولکتا) کے تحت 1813ء میں ''بیتال پچیسی'' کے نام سے مظہر علی ولا اور للو لال جی نے ترجمہ کر کے مرتب کی ہیں جو اپنے دور میں کافی مشہور و مقبول بھی ہوئی تھیں۔'' 23

''قصہ گوئی سے داستان سرائی تک'' میں قصہ سننے اور سنانے کی روایات پر بات کی گئی ہے، نوطرز مرصع، سب رس، باغ و بہار اور رانی کیتکی کی کہانی کو مدنظر رکھتے ہوئے اور فورٹ ولیم کالج کے منصوبہ کے تحت جو داستانیں تصنیف ہوئی تھیں اسے بروئے کار لاتے ہوئے فکشن نگاری کے ابتدائی نقوش کو واضح کیا گیا ہے۔ ناول پر عملی تنقید کرتے ہوئے انھوں نے اردو ناول کو مغربی صنف ماننے سے انکار کیا ہے بلکہ ان کا ماننا ہے کہ ناول پر چونکہ داستانوں کے روایتی اثرات موجود ہیں اس لیے ناول کو وہ اردو داستانوں سے ترقی پانے والی ایسی صنف مانتے ہیں جو موضوع و مواد اور واقعات کی حقیقت میں داستانی عناصر کی آمیزش سے وجود پذیر ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس طرح داستانی عناصر کی رعایت کے باوجود اردو ناول اپنے ابتدائی دور میں ہی زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان و مفسر تو بن گیا تھا لیکن داستان کے تخیل، تصور، مبالغہ آرائی اور شعریت سے بھی بالکل آزاد نہیں ہو سکا تھا اس لیے اردو ناولوں میں بہت سی داستانی کارفرمائی برقرار رہی بنابریں اردو ناول کو مغرب سے برآمد کی گئی خالص مغربی صنف ادب تصور کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بلکہ اردو داستانوں کی انگریزی اثرات سے متاثر ہو کر ترقی پانے والی ایک ایسی نثری صنف ہے جو موضوع و مواد اور

واقعات کی حقیقت میں تخیل وتصور اور دوسرے داستانی عناصر کی آمیزش سے وجود پذیر ہوئی ہے۔'' 24؎

نسیم اعظمی نے صنف افسانہ پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔افسانہ پر عملی تنقید کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ چونکہ افسانہ میں ایک ہی پہلو یا واقعہ یا خیال کو موضوع بنایا جاتا ہے اس لیے افسانہ میں امر واقعہ کے ماجرائی بیان کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے:

''اس میں انسانی زندگی یا معاشرت کے کسی ایک پہلو، زاویہ، واقعہ، یا خیال واحساس کو ہی موضوع بنایا جاتا ہے اور اس میں تخیل کی آمیزش سے افسانہ بنادیا جاتا ہے۔ اس لیے افسانہ میں امر واقعہ کے ماجرائی بیان کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اسے فنی لحاظ سے افسانہ کی ہیئت اختیار کرنے کے لیے واردات قلب یا تجربہ کا حصہ بننا پڑتا ہے۔''25؎

اس مضمون میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر فکشن میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔آزادی سے پہلے اور بعد کے رجحانات جو اردو فکشن کے تئیں تھے ان کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے زیر اثر آنے والے فکشن اور فکشن نگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے فکشن کے اصول وضوابط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔آخر میں 1980ء کے بعد اردو افسانہ کا جائزہ لیتے ہوئے اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

اردو زبان وادب میں جب کبھی بھی ناول نگاروں کا تذکرہ یا جائزہ لیا جاتا ہے تو سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد اور منشی پریم چند کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔اردو کے چند فکشن نگار: تنقید وتجزیہ میں انھوں نے منشی پریم چند کے ساتھ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے افسانوں کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔

پریم چند اردو ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی تاریخ میں ایک ایسے ادیب ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقات میں حقیقی زندگی کی عکاسی کی ہے۔محنت کشوں، مظلوموں، غریبوں اور کسانوں کا استحصال کرنے

والوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ دیہاتوں کی زندگی کے تضادات، وہاں کے مجبور و ناتواں اور مفلس و بے کس لوگوں کے مسائل سے وہ بخوبی واقف تھے۔ نسیم اعظمی نے پریم چند پر عملی تنقید کرتے وقت ان کی کہانیوں میں حقیقی مسائل اور دیہاتی زندگی کے تضادات کی افہام و تفہیم پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

''پریم چند بڑے حساس، باریک بیں اور دوررس واقع ہوئے تھے اس لیے وہ کبھی بھی ظاہری اور خارجی چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوتے تھے بلکہ اس کی تہہ میں جا کر اصلیت کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے ہندوستانی دیہاتوں کی زندگی کے تضادات کی افہام و تفہیم کے لیے وہاں کے مجبور و ناتواں اور مفلس و بے بس لوگوں کی داخلی زندگی کی گہرائیوں میں اتر کر حقائق کی تلاش کی اور انھیں حقائق سے اپنی کہانیوں کا تانا بانا تیار کیا اور امکانی و حقیقی اور ظاہری زندگی کے مابین پائے جانے والے تضادات، کشمکش اور تفریق سے اپنی کہانیوں میں شدت و توانائی پیدا کی جس سے ان کے افسانوں میں ایک ایسی اچھوتی کشش در آئی جو پریم چند کے ہم عصروں اور پیش رؤں کسی میں بھی اس انداز سے پیدا نہ ہو سکی۔'' 26؎

نسیم اعظمی نے پریم چند کی شخصیت اور خدمات کا سیر حاصل جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ پریم چند نے اپنے زمانہ کی عام روش سے ہٹ کر حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے ناولوں اور افسانوں میں ہندوستانی سماج اور معاشرت کی عکاسی کی ہے جو ان سے پہلے نہیں ملتی۔ اپنے انہیں خیال کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پریم چند کی شخصیت بڑی متنوع اور ہمہ گیر ہے۔ انھوں نے اردو فکشن کو بام عروج تک پہنچانے میں جو نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں وہ ہماری ادبی تاریخ کا انتہائی روشن باب بن گیا ہے۔ اردو افسانہ نگاری اور ناول نویسی کو اپنے زمانے کی عام روش سے ہٹا کر جس حقیقت پسندانہ انداز میں ہندوستانی سماج و معاشرت کی تصویر کشی کی ہے وہ پریم چند سے پہلے تقریباً مفقود تھی۔'' 27؎

مجنوں گورکھپوری پر ایک مضمون ''مجنوں گورکھپوری اور اردو فکشن'' کے عنوان سے ملتا ہے۔ اس مضمون میں نسیم اعظمی نے مجنوں کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے مغربی افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے علاوہ ان کی تنقید کا مطالعہ کرتے ہوئے انھوں نے حقیقی زندگی کے واقعات کی نشاندہی کی ہے اور بتایا کہ مجنوں نے اپنے عہد کی تاریخ، معاشرت اور زندگی سے ہم آہنگ کرنے اور اسے مقصدی بنانے سے زیادہ زندگی کو از سر نو تخلیق کرنے اور کہانی پن کی ضرورت پر زور دیا۔ مجنوں گورکھپوری کی تنقید پر اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے جہاں اردو افسانے کے دور آغاز میں افسانے لکھے اردو افسانے کی ابتدائی تنقید میں راہنمایانہ کردار ادا کیا اور شاید مجنوں پہلے اردو نقاد ہیں جنھوں نے افسانہ اور ناول کو حقیقی واقعات پر مبنی ہونے اور اپنے عہد کی تاریخ و معاشرت اور زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ ساتھ مقصدی بنانے سے کہیں زیادہ اس میں زندگی کی از سر نو تخلیق کرنے اور کہانی پن کی موجودگی پر خاص زور دیا۔'' 28؎

اردو ادب کی تاریخ میں عزیز احمد کی شناخت بیک وقت مترجم، شاعر، نقاد، ماہر اقبالیات، اسلامیات، ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے بطور خاص ہے لیکن وہ بنیادی طور پر ناول نگار ہیں۔ نسیم اعظمی نے ان پر ایک مضمون ''عزیز احمد کے افسانوی امتیازات'' کے عنوان سے لکھا ہے، اپنے مضمون میں انھوں نے ان پر عملی تنقید کرتے ہوئے ان کے افسانوں میں نفسیاتی عناصر کا مطالعہ کیا اور ان کے افسانوں میں عصری طرز زندگی وہاں کے لوگوں کے مزاج اور نفسیات کا جس تجرباتی انداز سے پیش کیا ہے اس سے ان کی کہانیوں میں حقیقت پسندی واضح ہوتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''دنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف جغرافیائی پس منظر رکھنے والے مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی زندگی سے متعلق تخلیق کیے گئے افسانوں میں ان کی نفسیات پر ان کی نظر گہری بھی ہوتی ہے اور باریک بھی۔ انھوں نے برصغیر کے علاوہ مغربی ممالک کے رہن سہن،

> طرز بودو باش، مزاج ومعیار اور نفسیات وطبیعت کا جس انداز سے اپنے افسانوں میں اپنے عملی تجربات ومشاہدات کے طور پر پیش کیا ہے اس سے ان کی کہانیوں اور کہانی کے کرداروں میں نئے انداز کا حقیقت پسندانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔'' 29

سعادت حسن منٹو اردو ادب کے ایک منفرد اور نمایاں افسانہ نگار ہیں۔نسیم اعظمی نے ان کے افسانوں پر بھی عملی تنقید کی ہے،ان کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے مضمون ''سعادت حسن منٹو کی افسانوی انفرادیت''میں ان کے افسانوں کے فن پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انھوں نے عام اور روزمرہ زندگی کے تجربات ومشاہدات کو بے باکانہ اور فنکارانہ انداز پیش کیا ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے عام اور روزمرہ کی زندگیوں میں جو کچھ دیکھا سنا اور محسوس کیا اسے اپنے افسانوں میں انتہائی بے باکی اور فنکاری سے پیش کرکے ہر لحاظ سے اپنے افسانوں میں جدت وانفرادیت کو قائم ودائم رکھا اور یہی مواد، موضوع ،تکنک ، بیانیہ، انداز، مکالمہ، زبان و بیان اور کردار و ماحول کی انفرادیت نے انھیں اردو کا مشہور، مقبول، ممتاز ومنفرد افسانہ نگار بنادیا ہے ۔ اس لیے منٹو کی افسانوی انفرادیت بہر حال مسلم ہے۔''30

قرۃالعین حیدر کا نام اردو فکشن میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ان کے افسانے اور ناول اعلی طبقوں کی عکاسی کرتے ہیں۔شعور کی رو کی تکنیک ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔نسیم اعظمی نے ان کے ناول نگاری پر عملی تنقید کرتے ہوئے بتایا کہ قرۃالعین حیدر نے شعور کی رو کی تکنیک استعمال کرکے اپنے عہد کے فلسفیانہ رجحانات کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ شعور کی رو کی تکنیک میں عام طور پر چار اجزاء ہوتے ہیں۔جس صنف میں یہ بروئے کار لائی جاتی ہے اس میں ایک سے زیادہ افراد کے شعور کو نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے۔قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں شعور کی رو کی تکنیک کا جائزہ لیتے ہوئے اس تکنیک کی مختلف صورتوں کی وضاحت نسیم اعظمی نے اس طرح کی ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''انھوں نے اردو ناول نگاری میں شعور کے رو کی تکنک کو جس انداز میں
اور جس کامیابی سے پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ جدید نفسیات کی
یہ اصطلاح جسے شعور کے رو کی تکنک (Technique of
Streem of consciousness) کہا جاتا ہے اور جسے
مختلف طریقوں سے تخلیقی ادب میں برتا جا سکتا ہے مثلاً براہ راست داخلی
کلام(Mono togue) کی صورت میں۔
بالواسطہ داخلی کلام(Indirect Interior Mono togue)
کی شکل میں۔
ہمہ بیں مصنف کے بیان (Omniscient Author's
Discription) کے انداز میں۔
خودکلامی(Solitogny) کے طریقے سے۔'' 31

مذکورہ بالا فکشن نگاروں کی تخلیقات کی عملی تنقید کے علاوہ انھوں نے کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، صالحہ عابد حسین، سریندر پرکاش اور شاکر کریمی وغیرہ کے ناولوں اور افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا ہے اور ان کی تخلیقات میں حقیقی زندگی کے مسائل، کرداروں کی نفسیات اور اس عہد کی معاشرت و سماجی مسائل وغیرہ کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ پیش کیا ہے جن سے ان فکشن نگاروں کی تخلیقات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ڈاکٹر ارشاد سیانوی اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے مطالعہ کی گہرائی اور وسعت پر روشنی ڈالی ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''کتاب ''اردو کے چند فکشن نگار'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ
ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے اردو فکشن کے ممتاز فکشن نگاروں کا تہداری سے
مطالعہ کیا ہے اور ان کے حوالے سے متعدد کتابوں کے اوراق الٹنے پلٹنے
کے بعد ہی قلم کو جنبش دی ہے۔'' 32

نسیم اعظمی کی کتاب ''اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو فکشن نگاروں کے ناولوں اور افسانوں کی عملی تنقید کرتے وقت مصنف کے عہد، اس عہد کی تاریخ،

سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل وغیرہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ حالانکہ وہ خود کہتے ہیں کہ وہ کسی نظریے سے وابستہ نہیں لیکن باوجود اس کے ان کی تنقید سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی تنقید پر ترقی پسند تحریک کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ادب کے مطالعہ کے دیگر پہلوؤں کو بھی نظر میں رکھتے ہیں یعنی کرداروں کی نفسیات کے مطالعہ کی اہمیت کو بھی وہ پیش نظر رکھتے ہیں اور ادب کے جمالیاتی پہلوؤں کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ انھوں نے جتنے بھی فکشن اور فکشن نگاروں کے بارے میں لکھا ہے وہ سارے موضوع اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے نئے اور اچھوتے ہیں۔ اس طرح سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں فکشن اور فکشن نگاروں پر تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی اسلوب وضوابط کو مدنظر رکھا ہے اور کھل کر اظہار رائے بھی دیا ہے، جس سے اردو فکشن اور فکشن نگاروں کے تنقیدی باب میں گرانقدر اضافہ کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔

3. اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید وتجزیہ

''اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید وتجزیہ'' نسیم اعظمی کی تنقید کے موضوع پر تیسری کتاب ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدائیہ میں انھوں نے کتاب کے تعلق سے تعارف پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے پروفیسر مولا بخش (شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا مضمون (جو مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے) ''اختر الایمان تنقید میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کا اختصاص'' کے عنوان سے شامل ہے، اس مضمون میں انھوں نے اختر الایمان کی نظم نگاری کے حوالہ سے بات کرتے ہوئے نسیم اعظمی کی تحقیقی محنت اور جستجو کی ستائش کرتے ہوئے ان کی کتاب کو اختر الایمان کی تنقید کے سلسلے میں اضافہ قرار دیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''نسیم اعظمی حد درجہ محنتی اور ادب کے تئیں اپنی دیوانگی کا ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ حد درجہ علیل ہونے کے باوجود بھی وہ ادب کی نت نئی قرأت کے لیے خود کو وقف کیے رہتے ہیں۔ اختر الایمان پر اب تک دو یا تین کتابیں ہی منظر عام پر آئی ہیں شاید اسی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے ایک ایسے نظم نگار شاعر کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے، جس کے ذریعے اردو نظم نگاری کے خدوخال واضح کیے جاسکیں اور ساتھ ہی

اختر الایمان کی تنقید کی روایت میں اضافہ ہو سکے۔'' 33؎

ابتدائیہ میں نظم نگاری کے بنیادی خدوخال سے آگاہ کراتے ہوئے اختر الایمان کی نظمیہ شاعری پر مختصراً گفتگو کی ہے جس سے ان کی نظمیہ شاعری کو پڑھ کر سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ان کے مطابق جدید نظم نگاری کے ضمن میں ن۔م راشد اور میرا جی کا نام سرفہرست ہے۔ان کے خیال میں اُن لوگوں نے اپنی شاعری کو آزاد فضا میں سانس لینے کی جو انتھک کوششیں کی تھیں اختر الایمان نے اسی آزاد فضا میں سانس لیتے ہوئے اپنے تخلیقی سفر کی مختلف منزلوں تک رسائی حاصل کی اور جدید نظم نگاروں میں اپنا ایک اہم مقام بنایا۔اپنے انہیں خیالات کو پیش کرتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

> ''جدید نظم نگاری کے ذکر میں ن ۔م. راشدؔ اور میرا جیؔ کا نام بھی کم حیثیت کا حامل نہیں ہے۔یہ دونوں شعراء اختر الایمان کے پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ راشدؔ اور میرا جی نے اردو نظم نگاری کو آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے جو راہ ہموار کی تھی اختر الایمان نے اسی پر گامزن ہو کر اپنے تخلیقی سفر کی مختلف منزلوں تک رسائی حاصل کی اور جس سے ان کا نام جدید اردو نظم نگاروں میں سب سے اہم اور قابل قدر بن گیا۔'' 34؎

اس کتاب کا باب اول اختر الایمان کی حیات وشخصیت پر مبنی ہے جس میں اختر الایمان کے سوانحی کوائف اور حیات وشخصیات کے چند اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے، جس سے ان کے بہت سے ایسے زندگی کے اہم گوشے واضح ہو جاتے ہیں جو قارئین اور خاص کر طلباء کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہیں۔ملازمت کے تعلق سے ان کی فلمی دنیا سے وابستگی اور فلمی منظر نامے ومکالمے لکھنے کے بارے میں نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے بی ۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم ساز کمپنی کے لیے پہلی ایسی فلم ''قانون''لکھی جس میں کوئی گانا نہیں تھا۔انھوں نے پونے اور ممبئی میں رہ کر تقریباً سو سے زائد فلموں کے لیے منظر نامے اور مکالمے لکھے جن

میں ''مغل اعظم''، ''پاکیزہ''، ''وقت''، ''میرا سایہ''، ''قانون''،
''آدمی''، ''مجرم''، ''اپرادھ''، ''چاندی سونو''، اور ''دھرم پتر'' جیسی
کامیاب اورمشہور ومقبول فلمیں بھی شامل ہیں ایک فلم کی ہدایت کاری
بھی کی تھی۔'' 35

دوسرا باب اختر الایمان کے شعری مجموعوں گرداب(1943ء) تاریک سیارہ(1946ء)سب رنگ(1948ء)آب جو(1959ء)یادیں(1961ء)بنت لمحات(1969ء)نیا آہنگ(1977ء)سروساماں(1983ء)زمین زمین(1990ء)زمستاں سرد مہری اور کلیات اختر الایمان، نیز ان کی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' کے تفصیلی تعارف اوراشاعت سے متعلق تحقیقی نقطہ نظر سے سپرد قرطاس ہوا ہے۔نسیم اعظمی کے مطابق خودنوشت اردو نثر کی ایک ایسی صنف ہے جس کا تعلق سوانحی ادب سے ہوتا ہےاورادب سے تعلق رکھنے والا اپنی زندگی کے حالات وتجربات قلم بند کرتا ہے۔انھوں نے اختر الایمان کی خودنوشت کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے اسے منصوبہ بند طریقہ سے نہیں لکھی تھی، جس کے سبب یادداشت کی زیادتی ،واقعات کی بے ترتیبی اور عجلت پسندی در آئی ہے۔اس کے باوجود اس خودنوشت کی تحریر کی سادگی اور پرکاری کی وجہ سے اس میں دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے اس کی اشاعت محمود ایاز کے زیرادارت شائع ہونے
والے ششماہی مجلّہ ''سوغات'' میں قسط وار ہوئی تھی۔ یہ خودنوشت غیر
منصوبہ بند طریقے سے جلدی میں لکھی گئی معلوم ہوتی ہے اس لیے یہ
خودنوشت کم یادداشت زیادہ ہے۔واقعات کی بے ترتیبی،تکراراورعجلت
پسندی کے احساس کے باوجود اندازتحریر کی سادگی و پرکاری نے اسے
دلچسپ کتاب بنادیا ہے۔'' 36

نسیم اعظمی کی اس کتاب کا باب سوم ''شاعری وفن'' کے عنوان سے ہے جس میں پانچ ذیلی عنوان ''نظم نگاری''، ''مختصر نظمیں۔۔۔ایک جائزہ''، ''نظمیہ شاعری اورتغزلی اثرات''، ''شعری زبان'' اور ''تصور شعروشاعری'' شامل ہے۔یہ پورا باب نظم نگاری کی مختصراً تاریخ ،اس کی اہمیت وافادیت اوراختر الایمان کی

نظموں کی فنی وفکری خوبیوں کا احاطہ کرتا ہے۔نسیم اعظمی نے ان کی نظموں کا فنی مطالعہ پیش کرتے ہوئے ان کی نظموں کی انفرادی وفنی خوبیوں کی نشاندہی کی ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اختر الایمان کی نظموں کی بنیادی اور اہم ترین خوبی یہ ہے کہ ان کی نظموں میں ارتقائے خیال مصرعوں اور سطروں کے بجائے لفظوں میں ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی انفرادی اور فنی خوبی ہے جو اردو کے دوسرے نظم گوشعراء میں تقریباً نہیں ملتی۔'' 37

اس کتاب کا باب چہارم ''اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزیہ'' کے عنوان سے ہے جس میں انھوں نے اختر الایمان کے دس شعری مجموعوں میں سے چند نظموں مثلاً موت، مسجد، پرانی فصیل، تنہائی میں، تاریک سیارہ، ترغیب اور اس کے بعد، ایک لڑکا، یادیں، میر ناصر حسین، کل کی بات، بنت لمحات، باز آمد-ایک منتاج، کرم کتابی، سبزۂ بیگانہ، سب رنگ، کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام، ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر، اپاہج گاڑی کا آدمی، زمستاں سرد مہری کا'' کل انیس نظموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے ان کی نظموں کی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔

اختر الایمان کی شخصیت اور شاعری کے حوالہ سے بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے بھی لکھے گئے، اس کے باوجود ان کی شاعری کی تفہیم کے سلسلے میں تشنگی کا احساس ہوتا تھا۔نسیم اعظمی نے ان کی نظموں کی تفہیم کی کامیاب کوشش کی ہے۔ظہیر حسن ظہیر اس سلسے میں لکھتے ہیں:

''اختر الایمان کی زندگی اور ان کی شاعری وشخصیت کے حوالے سے مختلف کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ان کی شاعری اور فن پر ایم. فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے بھی تحریر کیے جا چکے ہیں لیکن ان کی شاعری کی تفہیم ابھی پورے طور پر نہیں ہو سکی ہے۔ چنانچہ عہد حاضر کے معروف ناقد و محقق ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب نے ان کی نظموں کی تفہیم کی کامیاب کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں ان کی تازہ تصنیف ''اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزیہ'' ایک

قابل قدر کتاب ہے۔'' 38؎

اس کتاب ''اختر الایمان کی نظم نگاری تنقید و تجزیہ'' میں نسیم اعظمی نے اختر الایمان کی شاعری کی عملی تنقید کرتے ہوئے غیر جانب داری کے ساتھ اختر الایمان کی نظم نگاری کا تجزیہ اوران کی نظموں کی فنی وادبی خوبیوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

نسیم اعظمی نے اپنی کتابوں میں اردو ادب کے جن شعراء، فکشن نگاروں اور تنقید نگاروں کی تخلیقات کا مطالعہ پیش کیا ہے وہاں پوری تحقیقی انہماک اور تلاش و جستجو کے بعد کیا ہے انھوں نے اپنی تنقیدی مطالعہ میں اردو ادیبوں کی تخلیقات میں ان کے عہد کے ماحول اور سماجی و معاشرتی مسائل پر بھر پور روشنی ڈالی ہے اور اپنے مطالعات میں ادیب کی نفسیات، ادب پارے کی فنی خوبیوں اور تاریخی پس منظر کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔غرض ان کے یہاں ایک اچھا تنقیدی شعور ہے۔ انھوں نے ایک ذمہ دار محقق اور ناقد کی طرح اپنی تحقیق و تنقید میں گہرائی و گیرائی سے تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے اور غیر جانبداری سے ادیب کے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی و معاشرتی مسائل کی بھر پور عکاسی کی ہے اور جمالیاتی وادبی قدروں اور نفسیاتی مسائل کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

*****

حوالے

1 مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات

2 پروفیسر کلیم الدین احمد، فرہنگ ادبی اصطلاحات۔ص52

3 پروفیسر نور الحسن نقوی، فن تنقید اور اردو تنقید نگاری۔ص7

4 پروفیسر آل احمد سرور، تنقید کیا ہے۔ص99

5 ڈاکٹر عبادت بریلوی، تنقیدی زاویے۔ص68

6 ایضاً۔ص68

7 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، اثر انصاری حیات اور خدمات۔ص290

8 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، اثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں۔ص176

9 حقانی القاسمی، ایم نسیم اعظمی کی میزان نقد میں مئو کے معاصرین۔ص190

10 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، نقد سخن۔ص27

11 ایضاً۔ص23

12 ایضاً۔ص34

13 ایضاً۔ص42

14 ایضاً۔ص57

15 ایضاً۔ص68-67

16 ایضاً۔ص83

17 ایضاً۔ص105

18 ایضاً۔ص145

19 ایضاً۔ص192

20 ایضاً۔ص228

21 ڈاکٹر شہناز صبیح ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تنقیدی ہمہ جہتی''مشمولہ ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات''

مرتبہ ظہیر حسن ظہیر، ص239

22 پروفیسر آل احمد سرور، فکشن کیا، کیوں اور کیسے، مشمولہ ''اردو فکشن''، مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور۔ ص2-1

23 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، اردو کے چند فکشن نگار (تنقید و تجزیہ)۔ ص7

24 ایضاً۔ ص16

25 ایضاً۔ ص20

26 ایضاً۔ ص76

27 ایضاً۔ ص85

28 ایضاً۔ ص102

29 ایضاً۔ ص112

30 ایضاً۔ ص136

31 ایضاً۔ ص213

32 ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تصنیف ''اردو کے چند فکشن نگار'' پر ایک نظر، مشمولہ، سہ ماہی، تخلیق و تنقید (مئوناتھ بھنجن) اکتوبر تا دسمبر 2018ء۔ ص56

33 پروفیسر مولا بخش، اختر الایمان تنقید میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کا اختصاص، مشمولہ ''اختر الایمان کی نظم نگاری :تنقید و تجزیہ''، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی۔ ص17

34 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزی۔ ص19

35 ایضاً۔ ص23

36 ایضاً۔ ص67

37 ایضاً۔ ص102

38 ظہیر حسن ظہیر، اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزی مصنف ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی (تبصرہ)، مشمولہ، ماہنامہ، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ستمبر 2017ء۔ ص73-72

باب ششم

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی صحافتی خدمات اور ''ادبی گزٹ'' کا اشاریہ

صحافت نگاری

صحافت کا لفظ ''صحیفے'' سے نکلا ہے ،اور صحیفہ کے لغوی معنی ہوتے ہیں کتاب یا رسالہ کے۔ واقعات یا حقائق سے راست آگہی کا نام دراصل صحافت ہے۔ روزمرہ کے حالات و واقعات جو مقررہ وقفوں کے بعد شائع ہوتے ہیں صحافت کے ہی ضمن میں آتے ہیں، ان مقررہ وقفوں سے شائع ہونے والے واقعات یا حقائق کے مواد میں اخبار، رسائل اور صحیفے آتے ہیں اور جو لوگ ان اخبار، رسائل سے منسلک ہوتے ہیں انھیں صحافی کہا جاتا ہے۔

دنیا کے واقعات و حالات کی تازہ ترین صورت حال سے روشناس کرانا صحافت کا سب سے پہلا اور اہم مقصد ہوتا ہے۔ اس اہم مقصد کو بروئے کار لانے میں معروضیت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے کچھ اصول وضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے صحافت کے اہم مقاصد کو درج ذیل نکات کے ذریعہ بھی بخوبی سمجھا جاسکتا ہے:

* تازہ ترین صورت حال جو رونما ہوتے رہتے ہیں اس سے عوام کو واقف کرانا۔
* واقعات وحالات کو پیش کرنے میں معروضیت کو بروئے کار لانا۔
* واقعات وحالات کے تئیں راست بازی سے کام لینا۔
* خبروں اور واقعات کا پس منظر بیان کرنا۔
* کسی نظریہ کی حمایت کرنا اور نہ ہی مخالفت کرنا، بلکہ من وعن بیان کرنا۔
* رائے عامہ کو ہموار کرنا۔
* بہتر معاصرے کی تشکیل کرنا۔

اردو صحافت کے آغاز وارتقاء کے تعلق سے کوئی ٹھوس بات رقم نہیں کی جاسکتی ، کیوں کہ اس کے آغاز سے متعلق کئی متضاد دعوے موجود ہیں۔ بعض مصنفین نے اس کے آغاز کا سہرا مولوی محمد باقر دہلوی کے سر باندھا ہے۔ یہی وہ پہلے صحافی تھے جو تحریک آزادی کے لیے شہید ہوئے ، انگریزوں نے انھیں توپ کے

ساتھ باندھ کراڑادیا تھا۔ان کا''اردواخبار'' دہلی سے 1836ء سے 1857ءتک جاری رہا۔

کلکتہ سے ہری دت کا جاری کیا ہوا''جام جہاں نما'' 1822ء میں برصغیر ہندوپاک کا پہلا اردو اخبار تھا۔اس اخبار کی زبان سادہ اور انداز بیان سلجھا ہوا رہتا تھا۔اس کے پہلے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے۔اردو صحافت کا آغاز صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو اسی اخبار کے پرچم تلے ہوا۔

صحافت ایک معزز پیشہ ہے،اس لیے اس سے منسلک ہونے والے اشخاص کو اتنا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ جو بھی واقعات وحالات رونما ہوں اس میں اپنی رائے قائم نہ کی جائے اور نہ ہی اسے توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے کیوں کہ ایسا کرنے سے صحافت جیسے معزز پیشے پر بدنما داغ لگتا ہے۔

اس کی اہمیت وافادیت شروع سے ہی مسلم ہے چونکہ اس کی قوت دراصل عوام کی قوت ہوتی ہے، اس میں کسی حکومت یا قانون کا دخل انداز نہیں ہوتا ہے۔حکومتیں یا عوامی ادارے اس کا احترام کرتے ہیں، معاشرہ میں صحافت کی اہمیت وافادیت اس کی صداقت اور راست بازی ہے۔لیکن آج کل صحافت خاص کر عوامی صحافت حکومتوں اور لیڈروں کے زیرسایہ ہی اپنا کام کرتی ہے، ان ہی کا گرگاتی ہے، انھیں کے اشارے پر واقعات وحالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتی ہے،اس سے منسلک عوامی صحافی حکومت کی سرخ روئی حاصل کرنے کے لیے آج کل ان کے سامنے اتنے سرنگوں ہو چکے ہیں کہ شاید ہی صحافت کی پوری تاریخ میں کبھی اتنے سرنگوں ہوئے ہوں۔

صحافت کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

1:۔عوامی صحافت

2:۔ادبی صحافت

3:۔زرد صحافت

عوامی صحافت ہر نوع کی خبروں پر مشتمل ہوتی ہے اور عوام سے تعلق رکھتی ہے،اس ضمن میں روزنامہ ہفت روزہ آتے ہیں۔ادبی صحافت میں کسی سنجیدہ موضوع پر علمی بصیرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔رسالہ، سہ ماہی یا سالانہ،اخباری مضامین اور کالم اس کے زمرے میں آتے ہیں۔زرد صحافت ایسی صحافت ہے جس

میں زنا بالجبر، اغوا وغیرہ کی خبروں اور واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین زورؔ صحافت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روز مرّہ کے حالات و واقعات کو قلم بند کر کے پھر چھاپ کر قارئین تک پہنچانا عام صحافت کہلاتی ہے اور یہ صحافت تیسرے روز ہی باسی ہو جاتی ہے، مگر قوم کی اصلاح کے لیے کسی سنجیدہ موضوع پر علمی بصیرت کا اظہار کرنا ادبی صحافت کہلاتی ہے اور یہ صحافت بہت ہی دیر پا ثابت ہوتی ہے۔'' 1؎

نسیمؔ اعظمی ادبی صحافت سے منسلک تھے۔ صحافت کے تعلق سے ظہیر حسن ظہیرؔ نے ان سے ایک ادبی ملاقات (انٹرویو) میں پوچھا: آپ کا صحافت سے گہرا تعلق رہا ہے، آپ عصر حاضر کی ادبی صحافت سے کس حد تک مطمئن ہیں؟ اس پر انھوں نے یوں جواب دیا:

''عام صحافت ہو یا ادبی صحافت، اب سب کچھ کمرشیل ہو گیا ہے۔ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا یہ سب اہل ثروت کی چیز ہو گئی ہیں۔ بیسویں صدی کے اختتام تک شاید ہی ہندوستان کا کوئی ایسا شہر یا قصبہ رہا ہو جہاں سے چھوٹے بڑے رسائل و جرائد اور اخبارات نہ نکلتے رہے ہوں۔ ان چھوٹے اور مقامی و علاقائی اخباروں کی اپنی الگ اہمیت و افادیت تھی۔ صحافت میں تجارت و سیاست کی بالادستی نے صحافتی اقتدار کو مجروح کیا ہے مگر ادبی صحافت ابھی بھی اپنی روایتی اقدار اور معیار کو بچائے ہوئے ہے۔ اس لیے ادبی صحافت قدرِ اطمینان بخش ہے۔'' 2؎

صحافت نگاری کے میدان میں نسیمؔ اعظمی نے اس وقت قدم رکھا تھا جب ان کی عمر صرف سترہ برس کی تھی۔ چونکہ دوران تعلیم نصابی کتب کے علاوہ اپنے ذوق و شوق کے مطابق جی بھر کر علمی و ادبی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا اپنے آپ کو عادی بنا لیا تھا جس کی وجہ سے ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے ماہنامہ ''نکھار'' نامی قلمی رسالہ کا اجراء کیا جس نے دو تین شماروں کے بعد اکتوبر 1975ء میں باقاعدہ ادبی رسالہ کی حیثیت اختیار کر لیا۔ اس رسالہ کی سرپرستی حبیب اللہ (چیئرمین) اور محمد افضل نورانی نے فرمائی۔

اس کی باقاعدہ طباعت اسلامی لیتھو پریس چاند پورہ مئو سے شروع ہوئی۔ مولوی عبدالباقی (ایم۔ایل۔اے) نے 10/اکتوبر 1975ء کو جامعہ عالیہ عربیہ کے ہال میں اپنے ہاتھوں اس کی رسم اجراء ادا کی۔

1977ء میں یہ رسالہ رجسٹرڈ ہوا مگر اب ایک لفظی نام سے ترقی کر کے دو لفظی بن گیا اور ''نکھار'' کے بجائے ''ادب نکھار'' ہوگیا۔ رجسٹرڈ ہونے کے بعد یہ رسالہ کافی ترقی کرتا گیا۔ پورے ہندوستان میں اس کے قارئین اور قلم کاروں کا ایک حلقہ قائم ہوگیا، بہت سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ رسالہ پوری آب وتاب کے ساتھ 1989ء تک جاری رہا۔ جب مئو ضلع بنا تو ''ماہنامہ ادب نکھار'' کے بجائے ''ہفت روزہ ادب نکھار'' ہوگیا اور 1991ء تک جاری رہا۔ ڈاکٹر محبوب راہیؔ لکھتے ہیں:

''چودہ برسوں تک دنیائے شعر وادب کو اپنے روشن معیارات کی تب و تاب سے چکا چوند کرنے اور تاریخ صحافت کے روشن صفحات پر جلی حروف میں اپنا نام درج کرواکر 1989ء میں اس ماہ نامہ کو ہفت روزہ ادب نکھار کی شکل میں حیات تازہ عطا کی گئی۔ نیز دو سال 1991ء تک ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے اپنے قلب وجگر کے لہو سے سینچ کر اسے شادابی عطا کی۔'' 3

اس رسالہ کے مدیر نسیمؔ اعظمی تھے اور مدیر اعزازی آثرؔ انصاری تھے۔ پروفیسر عنوان چشتی، فضؔا ابن فیضی، ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، ڈاکٹر سعادت علی صدیقی، ڈاکٹر علقمہ شبلی، پروفیسر حمید سہروردی، ڈاکٹر اسلم آزاد اس کی مجلس مشاورت کے اراکین تھے۔ کنور مہیندر سنگھ بیدی، سحر کرشن موہن، رام پرکاش راہیؔ، سالک لکھنوی اور رضا نقوی واہیؔ نے خصوصی تعاون وسرپرستی بھی کی۔

ڈاکٹر شفیق اعظمی نے ''ادب نکھار'' کو اردو کے اچھے ادبی رسالوں میں شمار کیا ہے:

''ادب نکھار کا شمار اردو کے اچھے ادبی رسالوں میں ہوتا تھا۔ کسی وجہ سے اب وہ بند ہو چکا ہے، لیکن اردو کے ادبی رسالوں کا ذکر جب بھی کہیں بھی ہوگا تو اسے ضرور یاد کیا جائے گا۔'' 4

ادب نکھار نکالتے وقت نسیمؔ اعظمی کو بہت سی دشواریوں سے گزرنا پڑا، طرح طرح کے مصائب سے

دوچار ہوئے، خود کی طبیعت کی ناسازی تو کبھی گھریلو حالات نے انھیں پریشان کر رکھا تھا، اس کے باوجود ان ساری الجھنوں اور مصیبتوں سے نبرد آزما ہو کر پورے اطمینان اور دلجمعی سے رسالہ نکالتے رہے۔ 1977ء سے پہلے یہ رسالہ بھی دیگر رسالوں کی طرح گروہ بندی کا شکار ہونے لگا تھا، بہت سے ادب کے کرم فرماؤں نے خط لکھ کر گروہ اور تحریک سے منسلک ہونے کی باز پرس بھی ان سے کی۔ اس کے باوجود انھوں نے حوصلہ اور ہمت سے کام لیا، بڑی صفائی اور چالاکی کا مظاہرہ پیش کیا اور اپنے رسالہ پر کسی قسم کا حرف نہیں آنے دیا۔ جولائی 1977ء کے رسالہ ''ادب نکھار'' کے اداریہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ اکثر ادبی رسائل بڑی دھوم دھام سے نکلتے ہیں اور بہت جلد ہی کسی نہ کسی گٹ بندی کا شکار ہو جاتے ہیں اور تھوڑے دن چیخنے چنگھاڑنے کے بعد ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں اور پھر کسی ذہن کے اوپر ان کا دھندلا سا عکس بھی باقی نہیں رہتا کیوں کہ وہ اپنی حیات کے دوران کوئی ایسا دیرپا اثر نہیں چھوڑے ہوتے ہیں۔
>
> ہماری ایک ادنی سی سعی جو نکھار کے روپ میں آپ کے سامنے ہے اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی کرنے کی کوشش کی جاتی رہی اور جس کا عمل جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ہم نے کرشن نمبر کا اعلان کیا تو ہمارے بہت سے کرم فرماؤں نے ہمیں خط تحریر کیا کہ آپ کس نظریے کے تحت یہ نمبر نکال رہے ہیں۔ کیا آپ ترقی پسند تحریک سے اپنی وابستگی کا رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں؟ خدانخواستہ اگر ایسا ہے تو آپ کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں کیوں کہ یہ تحریک نہ ہمارے ادب کو کچھ دے سکی ہے اور نہ ملک اور قوم ہی کو۔۔۔
>
> ہم بڑی صفائی اور چلا کر کہنے کے انداز میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارا تعلق کسی ایک تحریک، گروہ یا جماعت سے نہیں، ہم تمام صحت مند ادبی قدروں کا احترام کرتے ہیں اور بغیر کسی جذباتی لگاؤ کے کشادہ ذہن سے

سوچتے ہیں اور پرچے میں ہر ایک کو جگہ دیکر اسے ایک میزان کی صورت میں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں اور فیصلہ ان پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔'' 5

نسیم اعظمی کے اس اقتباس سے ان کے اس رسالہ کی نوعیت اور مقاصد کا علم ہوتا ہے۔

1975ء سے 1991ء کے درمیان میں نسیم اعظمی کا یہ رسالہ ''نکھار''، ''ادب نکھار''، ''ہفت روزہ ادب نکھار'' اردو ادب کی گونا گوں شکل میں اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ نکلتا رہا۔ بالآخر 1991ء میں یہ ہفت روزہ ادب نکھار ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گیا مگر اپنے حوصلہ مند ایڈیٹر کو حیات جاودانی بخش گیا کہ تا ہنوز وہ ادب کی دنیا میں متعارف ہیں۔

''ادب نکھار'' کے خصوصی شمارے سالنامہ 1979ء ''کرشن چندر'' نمبر اور ''رضا نقوی واہی'' نمبر اہمیت کے حامل نمبر ہیں۔ ڈاکٹر اختر بستوی (صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی) نے اپنے ایک ریسرچ اسکالر ''شفیق اعظمی'' کو جن کے تحقیق کا موضوع ''کرشن چندر کی افسانہ نگاری'' تھا، اس رسالہ کا کرشن چندر نمبر اور اس کے ایڈیٹر سے ملنے کو کہا، جیسا کہ وہ خود رقم طراز ہیں:

انھوں نے بتایا کہ کرشن چندر پر کئی رسالوں نے اپنے خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ ایک نمبر ''ادب نکھار'' (مئو) کا بھی شائع ہوا تھا، آپ مئو چلے جایئے اور اس کے ایڈیٹر سے مل لیجئے، اگر مل گیا تو آپ کا کام آسان ہو جائے گا۔'' 6

''ادب نکھار'' کے انیس سال بعد 2010ء میں انھوں نے ایک عالمی اردو مجلّہ ''ادبی گزٹ'' کا اجراء کیا جو 2016ء تک جاری رہا، اور یہ عالمی اردو مجلّہ تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے کل سات شمارے منظر عام پر آئے۔ عالمی پیمانے پر ''ادبی گزٹ'' نے اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم کر لی تھی اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو قلم کاروں کا اس کو تعاون بھی حاصل تھا۔

ادبی گزٹ کا جب پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تو بہت سے محقق، ناقد اور فکشن نگار وغیرہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس عالمی مجلّہ ادبی گزٹ کے بارے میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی قیمتی آراء بھی

دی۔ مثلاً چند ناقدین کی آراء کو یہاں درج کیا جارہا ہے تاکہ اس رسالہ کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے:

پروفیسر گوپی چند نارنگ:

''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب! ''ادبی گزٹ'' کا پہلا شمارہ ملا۔ بہت مبارکباد۔ مئوناتھ بھنجن جیسے دور افتادہ جگہ سے ایسے عمدہ ادبی رسالے کا اجراء آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی فعالیت اور اردو کی جڑوں کے جڑوں کے پھیلاؤ اور گہرائی کا کھلا ثبوت ہے۔'' 7

پروفیسر شارب رودولوی:

''تسلیم و نیاز ''ادبی گزٹ'' کا پہلا شمارہ ملا۔ اس عنایت کے لیے آپ کا منون ہوں، رسالہ اپنے علمی و ادبی معیار کے ساتھ صوری حیثیت سے بھی بہت دلکش ہے۔ مئوناتھ بھنجن سے آپ نے اتنا خوبصورت رسالہ شائع کر کے ایک مثال قائم کردی۔'' 8

ڈاکٹر سلیم اختر:

''ادبی گزٹ نمبر 1 ملا بے حد شکریہ عزت افزائی کا۔ پہلے شمارہ کی بنیاد پر ادبی گزٹ کے روشن مستقبل کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ مجھے مقالات نے بالخصوص بہت متاثر کیا۔ موضوعات، انداز اور اسالیب کا جو تنوع نظر آیا اس نے بطور خاص متاثر کیا۔'' 9

جیلانی بانو:

''ادبی گزٹ'' اس لیے مجھے پسند زیادہ ہے کہ کسی ادبی شخصیت یا گروپ میں شامل نہیں ہے آج سب ہی ادبی رسالے عام شماروں کے بجائے شخصیت نمبر شائع کر رہے ہیں۔ رسالے کی ضخامت کو بڑھانے کے لیے کچھ اور علمی تحریروں کو شامل کر لیتے ہیں۔'' 10

نسیم اعظمی نے عالمی اردو مجلّہ ''ادبی گزٹ'' نکالنے سے پہلے اردو ادب کے مشہور ترین ادباء و ناقدین سے رائے حاصل کی تھی جس میں شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں اپنا بیش قیمتی مشورہ دیتے ہوئے پرچہ

نکالنے کی تجویز پر مبارکباد دیا اور ’’ادبی گزٹ‘‘ کا اشتہار ’’خبر نامہ شب خون‘‘ میں شائع کیا۔لیکن جب پہلا شمارہ ’’ادبی گزٹ‘‘ کا انھیں موصول ہوا تو نہایت مایوس ہوئے کیوں کہ ان کی ناقدانہ نظر نے بھانپ لیا کہ اس رسالہ کے اکثر مضامین مطبوعہ اور اوسط معیار سے گرے ہوئے ہیں۔جس کی خاص طور پر نسیم اعظمی سے تلقین کیے ہوئے تھے۔پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی ’’ادبی گزٹ‘‘ کے پہلے شمارے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’آپ کے پرچے نے انتظار تو بہت دکھایا لیکن مایوس اس سے بھی زیادہ کیا۔اکثر مضامین مطبوعہ ہیں اور سب کے سب اوسط معیار سے گرے ہوئے ہیں۔تنوع اور تازگی ہے ہی نہیں۔وہی نام وہی موضوعات ، اسی طرح کی نظمیں اور نثریں جو درجہ سوم کے پرچوں کی زینت بنتی رہتی ہیں۔آپ کے یہاں ان کا وفور ہے۔
> صاحب اگر ’’ادبی گزٹ‘‘ جیسا انوکھا نام رکھنا تھا تو کچھ گزٹ کے خواص پیدا کرتے۔۔۔اس وقت تو یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ یہ پرچہ بیسویں صدی کا ہے کہ اکیسویں صدی کا۔‘‘ 11؎

یہ حقیقت ہے کہ نسیم اعظمی نے پہلے پہل موصول ہوئے سارے مضامین کی خوب چھان پھٹک نہیں کی تھی جس کی طرف شمس الرحمٰن فاروقی نے خاص توجہ مبذول کرائی تھی۔دوسرے شمارہ سے انھوں نے ان کے قیمتی مشورے کو بروئے کار لایا اور معیاری مضامین کی طرف خواص توجہ دی۔اس ضمن میں کرامت علی کرامت دوسرے شمارہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’ادبی گزٹ‘‘ کے پہلے شمارے کی طباعت بہت خراب تھی علاوہ ازیں اولین شمارہ ہونے کی وجہ سے آپ کو اچھے مضامین نظم و نثر موصول نہیں ہوئے تھے۔میرا خیال ہے کہ شمارہ 2 میں یہ کمی بڑی حد تک پوری ہوگئی۔‘‘ 12؎

نسیم اعظمی نے اپنے اس رسالہ ’’ادبی گزٹ‘‘ کے ہر شمارہ کے اداریہ میں اردو زبان سے بے پناہ محبت و عقیدت پیش کرتے ہوئے اس کی احیاء پر خاص طور پر زور دیا ہے۔انھوں نے اپنے بے باک اداریہ

کے ذریعہ ہرخواص وعام کواردوزبان اوراس کی تعلیم کی تشویشناک حالات سے آگاہ کرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اردو مادری زبان کے بچوں کوسائنسی، تکنیکی اور دیگر عصری علوم وفنون سے آراستہ وپیراستہ کرنے کے جہاں خواہاں نظر آتے ہیں وہیں وہ ادب اطفال کی ضرورت کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں تاکہ اردو میڈیم کے بچوں کی سائنسی و تکنیکی مزاج سازی میں اس سے مدد لی جا سکے۔ ساتھ ہی ان کی مادری زبان میں سائنسی ادب پر بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت محسوس کررہے ہیں۔ادبی گزٹ کے اداریہ میں وہ لکھتے ہیں:

''اردو زبان کے سائنسی اور تکنیکی فروغ میں جہاں ایسے ادب اور کتب کی ضرورت ہے جو مختلف سائنسی علوم وفنون سے متعلق رکھتے ہوں وہیں ایسے ادب اطفال کی بھی ضرورت ہے جو اردو مادری زبان کے بچوں کی سائنسی و تکنیکی مزاج سازی میں معاون بن سکیں کیوں کہ آج کے بچے ہی مستقبل کے ذمہ دار شہری ہیں اس لیے ان نوخیز نسلوں کی بہتر، مفید اور ایڈوانس عصری تعلیم کے ساتھ اردو زبان و تہذیب سے آراستہ کرنے کے لیے ان کی مادری زبان اردو میں بچوں کے سائنسی ادب پر بھی خصوصی توجہ دینی ہوگی۔'' 13؎

کسی بھی ادبی رسالہ کو بلندی پر لے جانے کے لیے عموماً زر، محنت اور معیاری تخلیقات کی ضرورت ہوتی ہے۔زر اور محنت رسالہ کے معیاری ہونے میں ثانوی درجہ رکھتے ہیں، لیکن معیاری تخلیقات رسالہ کو بلندی کے مقام پر پہنچاتی ہے۔رسالہ میں معیاری تخلیقات کا تعین کرنا مدیر کے علمی اور ناقدانہ بصیرت پر مبنی ہوتا ہے۔آج کل ہر انسان کو عروضی ہونے کا زعم ہے جس کے سبب زیادہ تر رسائل اور جرائد میں تخلیقات خواہ علمی استعداد سے معمولی ہی ہو جگہ دے دی جاتی ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے پہلے شمارہ پر جو تنقید کی تھی اس کے بعد سے نسیم اعظمی نے اپنے اس عالمی مجلّہ ادبی گزٹ میں مضامین کو خوب چھان پھٹک کر شائع کیا۔ ادبی گزٹ میں شامل معیاری تخلیقات، ادبی حلقوں میں اس رسالہ کی مقبولیت اور نسیم اعظمی کے بے باک اداریوں کے بارے میں ڈاکٹر الف ناظم لکھتے ہیں:

''ادبی گزٹ'' جیسا ضخیم رسالہ نکال کر تو انھوں نے ادبی دنیا کو حیرت

> میں ڈال دیا ہے۔اس رسالے کے اگر چہ ابھی چند شمارے ہی منظر عام پر آسکے ہیں تا ہم بہت جلد اس نے ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر کے صف اول کے معیاری رسائل میں اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔معیاری تخلیقات اور اعظمی صاحب کے بے باک اداریوں نے ''ادبی گزٹ'' کو دستاویزی حیثیت عطا کر دی ہے۔'' 14

سالانہ عالمی اردو مجلّہ ''ادبی گزٹ'' 2010ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔اس کے صرف سات ضخیم شمارے ہی شائع ہو سکے تھے۔علمی و ادبی مضامین،منظومات،افسانے اور تبصروں پر مشتمل یہ رسالہ زیادہ دنوں تک محبان اردو کا محبوب نہ بن سکا اور اپنے قلیل مدتی سات سالہ ادبی سفر طے کرتا ہوا 2016ء میں بند ہوا۔ اس عالمی اردو مجلّہ کے بند ہونے کا سبب ان کی طبیعت کی خرابی تھی،ہوا یوں تھا کہ ان کا ایک گردہ خراب ہو گیا تھا اور داکٹروں کے مشورہ پر اسے نکلوانا پڑا،جس کے سبب وہ اپنے عالمی اردو مجلّہ ''ادبی گزٹ'' پر زیادہ توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔ 2017ء سے ان کی زیر نگرانی میں ان کی بیٹی عدیلہ نسیم اور ہر دالعزیز شاگرد ظہیر حسن ظہیرؔ سہ ماہی رسالہ ''تخلیق و تنقید'' نکال رہے ہیں۔

غرض نسیمؔ اعظمی ایک اچھے استاد،ایک مفکر تعلیم اور ایک اچھے ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ایک ذمہ دار صحافی کے فرائض بھی بخوبی انجام دیے ہیں۔اگر چہ کہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے انھیں یہ رسالہ بند کرنا پڑا لیکن جتنے رسالے انھوں نے شائع کیے وہ اپنے معیاری مضامین اور ان کی بے باکانہ اداریوں کی وجہ سے اردو ادب کے دیگر معیاری رسالوں کی طرح ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

*****

حوالے

1 ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری، روداد اردو۔ ص 83

2 ظہیر حسن ظہیر، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی سے ایک ادبی ملاقات (انٹرویو) مشمولہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ ص 101-100

3 ڈاکٹر محبوب راہی، ایم نسیم اعظمی کی عمیق و بسیط علمی و ادبی خدمات کا کثیر الجہات منظر نامہ، مشمولہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ ص 32

4 ڈاکٹر شفیق اعظمی، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ایک اچھا انسان مخلص ادیب، مشمولہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ ص 50

5 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ماہنامہ ادب نکھار، مئوناتھ بھنجن، جولائی، 1977۔ ص 4

6 ڈاکٹر شفیق اعظمی، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ایک اچھا انسان مخلص ادیب، مشمولہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ ص 52

7 پروفیسر گوپی چند نارنگ، خیال اپنا اپنا، مشمولہ، سالنامہ عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ، نمبر 2، جنوری 2011ء۔ ص 8

8 پروفیسر شارب ردولوی، خیال اپنا اپنا، مشمولہ، سالنامہ عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ، نمبر 2، جنوری 2011ء۔ ص 9-8

9 ڈاکٹر سلیم اختر، خیال اپنا اپنا، مشمولہ، سالنامہ عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ، نمبر 2، جنوری 2011ء۔ ص 11

10 جیلانی بانو، خیال اپنا اپنا، مشمولہ، سالنامہ عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ، نمبر 3، جنوری 2012ء۔ ص 11

11 پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، خیال اپنا اپنا، مشمولہ، سالنامہ عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ، نمبر 2، جنوری 2011ء۔ ص 8

12 خیال اپنا اپنا، مشمولہ، سالنامہ عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ، نمبر 3، جنوری 2012ء۔ ص 9

13 ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ابتدائیہ، مشمولہ، سالنامہ عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ، نمبر 6، جنوری 2015ء۔ ص 6

14 ڈاکٹر الف ناظم، وسعت فکر و خیال کا شاعر ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، مشمولہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتبہ ظہیر حسن ظہیر۔ ص 311

اشاریہ

اشاریہ عربی زبان کے لفظ اشارہ سے مشتق ہے۔لفظ اشارہ کے ''ہ'' کو حذف کر کے ''یہ'' بطور لاحقہ نسبت لگایا گیا ہے۔عموماً اشاریہ سازی کے فن کو رسائل و جرائد کے ساتھ منسلک کیا جاتا رہا ہے جب کہ صرف رسائل و جرائد تک ہی اس فن کا استعمال محدود نہیں ہے۔اشاریہ سازی سے علمی و تحقیقی میدان میں طبع آزمائی کرنے والوں کو بڑا فائدہ اور سہولت فراہم ہوتی ہے۔بہت سی اہم تخلیقات اور مضامین جن تک رسائی عام محقق یا قاری کی نہیں ہو پاتی ہے تو ایسی صورت میں اشاریہ سے حتی المقدور رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔

اشاریہ کو انگریزی میں Index کہا جاتا ہے۔یہ لاطینی زبان کے لفظ انڈیکیٹر سے نکلا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں کسی کتاب کی فہرست،مضامین یا دیگر ابتدائی مواد۔

اشاریہ کے معنی اردو کی لغت ''فیروز اللغات'' میں اس طرح تحریر ہیں:

> ''اشاریہ:کسی کتاب کے مضامین کی تفصیلی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے (کتاب میں کوئی مضمون،موضوع یا نام ایک سے زیادہ مقام پر آئے تو تمام متعلقہ صفحات کے نمبر ایک ہی عنوان کے تحت دے دیے جاتے ہیں۔'' 1

اردو لغت (ترقی اردو بورڈ کراچی) میں اس کے معنی یوں رقم ہیں:

> ''حروف تہجی کی ترتیب سے کتاب وغیرہ کے شروع یا آخر میں دی ہوئی فہرست جس میں کتاب کے مضامین اور دوسرے جزئیات اور صفحات وغیرہ درج ہوں۔'' 2

سلیم شہزاد نے ''فرہنگ ادبیات'' میں اس کے معنی اس طرح رقم کیے ہیں:

> ''(اشاریہ:index) کسی علمی کتاب کے اختتام پر دی گئی فہرست جس میں متن کتاب میں آنے والے ناموں اور مقامات کی صفحہ وار نشاندہی کی گئی ہوتی ہے۔'' 3

اس کے علاوہ اردو انسائکلو پیڈیا میں اشاریہ کی تعریف یوں درج ہے:

''اشاریہ: مضامین اور مصنفین وغیرہ کی فہرست جو کسی کتاب یا رسالہ کے آخر میں کی جاتی ہے اور یہ ہمیشہ حروف تہجی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتاب پڑھنے والے کو ان تمام مضامین اور مصنفین کا فوراً پتہ لگ سکے جن کا کسی قدر تفصیلی ذکر اس کتاب میں ہوتا ہے۔'' 4

اشاریہ کے مذکورہ معنی و مطالب اور تعریف سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف حروف تہجی کے اعتبار سے تیار شدہ فہرست کو ہی اشاریہ کہتے ہیں جب کہ اس کے برعکس بہت سے اشاریہ تاریخی، موضوعاتی اور عددی اعتبار سے بھی تیار کیے جاتے رہے ہیں۔ اشاریہ رسالہ دل گداز کے مقدمہ میں قمر سلیم نے اس بات کی وضاحت یوں رقم کی ہے:

''عام طور پر کسی کتاب کے مضامین کی فہرست حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق تیار کرنے کو اشاریہ کہا جاتا ہے۔ کچھ اشاریہ محض حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق تیار نہیں کیے جاتے بلکہ تاریخی اور موضوعاتی ترتیب سے بھی تیار کیے جاتے ہیں۔'' 5

اردو میں اشاریہ سازی کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ جب کہ اس کے برعکس انگریزی زبان میں بہت قدیم سے رہی ہے۔ اردو میں یہ روایت اپنے عہد طفلی سے عہد شباب کی طرف بتدریج گامزن نظر آ رہی ہے۔ دیگر علوم کی طرح اشاریہ سازی بھی انگریزی ادب کی ہی رہین منت ہے۔ سب سے پہلا اشاریہ انگریزی ادب میں تیار کیا گیا ہے، جس کی طرف قمر سلیم توجہ مرکوز کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انگریزی ادب اشاریہ سازی کی ایک وقیع روایت کا حامل ہے اور اس کا چلن ایک عام رجحان کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریزی میں لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے لائبریرین جے۔ ڈی۔ پیرسن نے Index Islamics سے اشاریہ سازی کی شروعات کی۔'' 6

اردو میں اشاریہ سازی کا آغاز کس نے کیا، اس ضمن میں پورے وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے

البتہ اس زبان میں اشاریہ کی بہت قلت محسوس کی جارہی ہے، جس کا سبب اردو میں اس روایت کے قدیم نہ ہونے پر لازم آتی ہے۔ اشاریہ سازی کی طرف بالخصوص ہندوستان میں خاطر خواہ توجہ بھی بہت کم دی گئی ہے بلکہ اس کے بالمقابل پاکستان میں اس کی جانب زیادہ توجہ مرکوز نظر آتی ہیں، وہاں کثیر تعداد میں رسائل و جرائد کے اشاریے تیار کیے جا چکے ہیں۔ جن میں اشاریہ نقوش (سید جمیل احمد رضوی) اشاریہ سہ ماہی نیا دور (مصباح العثمان) اورینٹل کالج میگزین (محمد ابراہیم و محمد سید عبداللہ) اشاریہ سہ ماہی اردو (سید سرفراز علی رضوی) اشاریہ روزنامہ زمیندار (احمد سعید) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان میں اشاریہ سازی کی جانب کچھ عرصہ سے توجہ ضرور مرکوز ہوئی ہیں اور بہت سارے اشاریہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر محققین و قارئین کی پریشانیوں کو زائل کر رہے ہیں ان میں اردو اکاڈمی دہلی سے اشاریہ آجکل (ڈاکٹر جمیل اختر) انجمن ترقی اردو سے اشاریہ رسالہ اردو، اشاریہ نیا دور (محمد اظہر مسعود خاں) اشاریہ دلگداز (قمر سلیم) ماہنامہ معارف کا اشاریہ (ڈاکٹر شائستہ خاں) اشاریہ تہذیب الاخلاق (ڈاکٹر ضیاء احمد انصاری) اشاریہ مخزن (ڈاکٹر امتیاز ندیم) وغیرہ کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیاں بھی اپنے ریسرچ اسکالر کے ذریعہ اشاریہ سازی کا کام کراتی ہوئی اس فن میں اضافہ کی سعی کرتی نظر آرہی ہیں۔

اشاریہ سازی کے فن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے کیوں کہ تحقیقی نقطہ نظر سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کی مدد سے محقق کو مواد کی تلاش و جستجو میں آسانی ہوتی ہے، ساتھ ہی کم وقت میں اپنے موضوع سے متعلق مواد آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے۔

اشاریہ سازی کی اہمیت ہی کے پیش نظر یہاں نسیم اعظمی کے رسالے ''ادبی گزٹ'' کا اشاریہ شامل کیا جا رہا ہے تا کہ ان کے اس رسالہ کے سلسلے میں کسی کو تحقیق کرتے وقت مستقبل میں کوئی دشواری نہ ہو، آسانی سے اس اشاریئے کے ذریعے متعلقہ معلومات دستیاب ہو سکے ساتھ ہی یہ بھی پتہ چل سکے کہ ان کے اس رسالہ میں کس طرح کی تخلیقات و مضامین شائع ہوتی تھیں، اس کے معیار کا بھی اندازہ ہو سکے۔

*****

حوالے

1 جامع فیروزاللغات،مرتب فیروزالدین۔ص96

2 اردولغت (تاریخی اصول پر) جلداول۔ص115

3 سلیم شہزاد،فرہنگ ادبیات۔88

4 اردوانسائیکلوپیڈیا۔ص47

5 قمرسلیم،اشاریہ دلگداز۔ص19

6 قمرسلیم،اشاریہ دلگداز۔ص22

شمارہ نمبر(1)سن2010ء

عنوان	اسمائے تخلیق کار	صفحہ نمبر
	حصہ نثر	
اداریہ	مدیر	6
نظر اپنی اپنی خیال اپنا اپنا (خطوط)		10
حمد و نعت	م۔لئیق انصاری	13
شکست ناروا ایک عروضی و لسانی عیب	ناوک حمزہ پوری	15
افسانہ اور لاشعور	سلیم اختر	29
شعر غالب کے انگریزی تراجم	پروفیسر کوثر مظہری	39
زبان کی ترقی کے مختلف مدارج	مسز سلیم عالم	50
اردو گیت کے لیے اردو لفظیات کا استعمال کیوں نہیں؟	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	54
1990ء کے بعد اردو فکشن ہندوستان میں	مشرف عالم ذوقی	57
ایک کہانی دو عنوان	ڈاکٹر پردیپ جین	68
معاصر اردو ناول کے اسالیب	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	78
اقبال کی شاعری میں عظمت آدم کا تصور	ڈاکٹر ستار ساحرؔ	95
دبستان داغؔ کا آخری شاعر (نوح ناروی)	ڈاکٹر عزیزہ بانو	101
اردو میں تنقید و تحقیق کی روایت	ڈاکٹر راحت سلطانہ	112
تانیثیت اور معاصر اردو شاعری	حقانی القاسمی	116
1857ء مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خطوط	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	124
توانا روایتوں کا ترقی پسند شاعر (کیفی اعظمی)	ڈاکٹر شفیق ندوی	130

علامہ اقبال اور اردو زبان	کے۔ پی شمس الدین	138
اردو اخبارات اور فیچر نگاری	ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم	146
ہندوستان میں اردو سائنسی صحافت ماضی اور حال کے تناظر میں	ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی	154
ماہر عبدالحئی کا شعری مجموعہ ''ہری سنہری خاک''	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن اظہری (مرحوم)	165
اس حادثہ پہ کون نہ مرجائے اے خدا	سبط اختر (انشائیہ)	169
سفر ایک سپر سلو ٹرین سے	اسد رضا (مذاحیہ)	175
عرفان صاحب	ایس۔ ایم عباس (خاکہ)	179
سہیل احمد صدیقی سے خصوصی گفتگو	شاہدہ تبسم، کراچی (انٹرویو)	185
ذرا سا بگڑے سمندر تو بستیاں اڑ جائیں	مشاعرہ رپورٹ (ڈاکٹر شفیق ندوی)	195

حصہ نظم

غزل	مظفر حنفی	209
اقدار کا تصادم	علقمہ شبلی	210
موسم گلریز کی رعبائیاں	علقمہ شبلی	211
غزل	اسرار اکبر آبادی	212
غزل	ظفر گورکھپوری	213
رباعیات	ظہیر غازیپوری	214
کارگل کی جنگ کے بعد کی صلح کے نام	نذیر فتحپوری	215
صفر کا سفر	نذیر فتحپوری	216
رباعیات	شاہ حسین نہری	217
غزل	غلام مرتضیٰ راہی	219

مدافعت	شہپر رسول	220
دوھا غزل	ساحر شیوی	221
التجا (دوہا نظم)	ڈاکٹر فراز حامدی	223-222
دوھا گیت	ڈاکٹر ودیا ساگر آنند	224
پیکار و گریز	عبدالاحد سازؔ	226-225
نسیان	عبدالاحد سازؔ	227
غزل	ماہر عبدالحئی	229-228
غزل	سردار شفیق	230
غزل، ماہیئے	ڈاکٹر شباب للت	232-231
نفی واثبات	مشتاق شبنم	233
غزل، احساس کمتری	سیفی سرونجی	234
غزل	احمد نثار	235
غزل	درد چاپدانوی	236
غزل	مہدی پڑتاپ گڑھی	237
غزل	سعید رحمانی	238
غزل	شوکت علی ناز	239
انتظار نادیدہ، اندر باہر، اپنے اپنے چوکھٹوں پر	پرتپال سنگھ بیتاب	241-240
غزل	مناظر عاشق ہرگانوی	242
غزل	رئیس الدین رئیس	244-243
غزل	انجم عرفانی	246-245
شملہ کی ایک خنک دوپہر	راشد جمال فاروقی	247

غزل	فہیم جاوید	248
غزل	اکبر حیدر آبادی	249
غزل	اعجاز احمد اعجاز	250
غزل	شاہین فصیح ربانی	251
انکشاف	وسیم بٹ وسیم (نیروبی کینیا)	252
انوکھا گھر	پروین شیر (کنیڈا)	252
مقدر کا دکھ	شاہینہ فلک صدیقی (کراچی)	253
خواندگی	باصر سلطان کاظمی (مانچسٹر)	253
تناسب، تمہاری تکمیل چاہتا ہوں	سہیل اختر	255-254
ضرورت	سہیل اختر	256
غزل	اختر شاہ جہاں پوری	257
غزل	بی ایس جین جوہر	258
گیت	اسحاق ساجد (جرمنی)	259
ایک جیسا ڈر	عیسیٰ بلوچ	262
غزل	انس مسرور	262
غزل	حصیر نوری	263
غزل	جعفر ساہنی	265-264
غزل	گلشن کھنہ	266
غزل	امان خاں دل	266
غزل	رمضان علی سحر	267
دوبیتیاں	شارق عدیل	268

لہو کی پیاس، محبت	وشال کھلر	270
دل کا معاملہ	احمد سہیل	271
میں تمہاری ہتھیلیوں میں زندہ ہوں	احمد سہیل	272
پانیوں میں سانس	احمد سہیل	273
غزل	ڈاکٹر نیاز سلطان پوری	274
غزل	عبرت مچھلی شہری	275
زخمی پرندوں کا خواب	محمد سالم (یو ایس اے)	276
غزل	عارف برقی	279-278
غزل	گمان انصاری	280
غزل	اظہر سلیم	281
غزل	امین خیال (جاپان)	282
تعبیر، پیار کرتے ہو	عدیل زیدی	284-283
غزل	غیاث انجم	285
غزل	حنیف نجمی	287-286
غزل	سکندر عرفان	288
غزل	ڈاکٹر شفیق اعظمی	289
غزل	ابوذر انصاری	290
غزل	شائستہ جمال	291
اندر کا اطمینان	نینا جوگن	292
غزل	حنا انجم	293
غزل	ڈاکٹر بختیار نواز	294

غزل	ڈاکٹر فیاض احمد	295
غزل	ایم نسیم اعظمی	296
غزل	ظہیر حسن ظہیر	296

افسانے

سورج کی پیٹھ پر	حسین الحق	299
تماشہ	م۔ق خان	309
موج مضطرب	امتیاز فاطمی	313
نیلی بارش	محمد بشیر مالیر کوٹلوی	319
پھکڑ بابا	اقبال انصاری	329
اذان	ایم مبین	332
کوئی گناہ نہیں کیا	یٰسین احمد	339
تابوت کی کیلیں	ڈاکٹر شہناز صبیح	343
پگڈنڈی	مظہر سلیم	347
عتاب	سعید فریدی	351
اپنا خون	اشتیاق سعید	358

شمارہ نمبر (2) سن 2011ء

عنوان	اسمائے تخلیق کار	صفحہ نمبر
	حصہ نثر	
اداریہ	مدیر	4
خیال اپنا اپنا (خطوط)		8
حمد	ڈاکٹر علقمہ شبلی	30

نعت سرور کائنات	ڈاکٹر علقمہ شبلی	31
جدید اردو غزل	ڈاکٹر انس مسرور	32
اردو انشائیہ کے امکانات	ڈاکٹر حمید سہروردی	46
تخلیقی حسیت اور تنقیدی بصیرت کا نمائندہ افسانہ نگار (پروفیسر بیگ احساس)	ڈاکٹر محی الدین باشاہ	50
اردو زبان	رام پرکاش کپور	58
علامہ اقبال کے قطعات و رباعیات	ظہیر غازی پوری	76
ہے ندرت خیال تو انداز منفرد	پروفیسر افتخار اجمل شاہین	84
اختر الایمان کی شاعری میں سماجی رابطوں کا تخلیقی اظہار	ڈاکٹر صدیق محی الدین	93
غیر اخلاقی شعور ادب	ڈاکٹر محمود شیخ	100
جوش کا تصور ادب	ڈاکٹر سلیم اختر	109
غالب کا سائنسی شعور اور وہاب قیصر کی سائنٹفک تنقید	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	117
اردو گیت مختصر جائزہ	ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی	127
ڈاکٹر سلیم اختر۔ایک تہذیبی خاکہ نگار	ڈاکٹر شبیہ الحسن	136
اردو نثر میں طنز و مزاح	ڈاکٹر خان حفیظ	149
عذرا پروین کی شاعری عصر حاضر کا تخلیقی منظر نامہ	عارف حسین جونپوری	161
جمود کا نہیں زوال کا دور ہے	شاہد عزیز	169
سلمیٰ سے دل لگا کر	ڈاکٹر فیاض احمد علیگ	173
میر کی قصیدہ گوئی۔ایک اجمالی جائزہ	ڈاکٹر ایف ناظم	185

بنگلہ دیش کی چند اردو نواز بنگالی نثر اد ادیبہ و شاعرہ	ڈاکٹر لطیف احمد	190
شعر الہند اور اردو شاعری میں اسکول کی روایت	شریف احمد مبارکپوری	197
کوکن میں اردو غزل	دانش غنی	201

حصہ نظم

رباعی کے مروجہ و متداولہ چوبیسوں اوزان چھ رباعیوں میں	ناوک حمزہ پوری	206
رباعیاں	ڈاکٹر محبوب راہی	209
تمہاری پسند	ڈاکٹر جمیل دوشی	210
زندگی چہرہ	عطا عابدی	213
ٹھہر جا مری زندگی	نقشبند قمر نقوی۔ٹلسا (امریکہ)	214
باغ زیتون کا	فاخر جلال پوری	215
پتے کی بات ہے، خاطب وہی مخاطب وہی	نظام ہاتف	216
اے خدا، غم کی شبنم	نیاز جیراجپوری	217
نظم، گیت	اسحاق ساجد (جرمنی)	218
رباعیاں	عبدالمتین جامی	219
پھر ایک ہو جائیں	مشتاق شبنم	221
دوہے، ماہیا نما	راہی صدیقی	222
خدا، تو مجھکو میری چشم تر میں مل	جبیں نازاں	223
دوبیتیاں	شارق عدیل	224
زندگی کا سفر، تقدیر و تدبیر	سید عبیداللہ ہاشمی	225
روشن سوچ	اے حق (لندن)	226

شہرلندن	ڈاکٹرعنبرآفاقی	227
نذرکانپور	ضیافاروقی	228
غزل	ظفرگورکھپوری	229
غزل	سیدشکیل دسنوی	230
غزل	اسلم سہیل	231
غزل	پروفیسرسجادمرزا(پاکستان)	232
غزل	انوارفیروز(پاکستان)	232
غزل	پیام انصاری	233
غزل	سوہن راہی(انگلینڈ)	234
غزل	نورخاں نور(بنگلہ دیش)	234
غزل	پروفیسرزہیرکنجاہی(پاکستان)	235
غزل	م۔لئیق انصاری	236
غزل	شفیق ندوی(ریاض)	237
غزل	اسلم ایڈوکیٹ	238
غزل	ڈاکٹرمخمورکاکوروی	239
غزل	سیدقمرمنٹو	240
غزل	ساحرشیوی(لیوٹن برطانیہ)	241
غزل	رومانہ رومی(کراچی)	241
غزل	ڈاکٹروکیل اشہر	242
غزل	ڈاکٹرآفاق فاخری	243
غزل	مشرف حسین محضر	244

غزل	ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی	245
غزل	ارشد کمال	246
آہ! احمد فراز	نذیر اے قمر (اسپین)	247
غزل	عاصی کاشمیری (یو.کے)	247
نذر جاں نثار اختر	ڈاکٹر راہی	248
غزل	راشد ندیم	249
غزل	مدہوش بلگرامی	250
غزل	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	251
غزل	سہیل اختر	252
غزل	عادل حیات	252
غزل	رفیق جعفر	253
غزل	احسن امام احسن	254
غزل	ڈاکٹر معین الدین شاہین	254
غزل	عارف شفیق (کراچی)	255
غزل	عبدالرحیم ارمان	256
غزل	ڈاکٹر سعید سندیلوی	257
غزل	صابر فخر الدین	258
غزل	حفیظ انجم کریم نگری	259
غزل	سلیم انصاری	260
غزل	رؤف صادق	261
غزل	م.ع. باسط	262

غزل	ذکی طارق	262
غزل	ساجد غازیپوری	263
غزل	صابر عظم آبادی (کراچی)	263
غزل	محمد صدیق عالم	264
غزل	شعلہ جونپوری	265
غزل	رقیہ جمال	266

افسانے

ایک داغ	آنند لہر	268
میں تم اور وہ	نور شاہ	270
یہ کیسی صبح	شیخ بصیر احمد	276
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب	فاروق راہب	281
صبح کا بھولا	تسکین زیدی	286
ایسا بھی ہوتا ہے	نقشبند قمر نقوی	290
آخری شاپنگ	یوسف عارفی	297
اے میرے وطن	سلمیٰ صنم	304
پروفیسر احمد	ڈاکٹر عبید اللہ چودھری	306
نیم پلیٹ	وسیم حیدر ہاشمی	310
باقی سب ٹھیک ہے	احمد کلیم فیض پور	314
دو پاٹ	گردھاری لال خیال	317
ٹرننگ پوائنٹ	نیل آکاش	321
نوک جھونک	رضوان رضوی	324

بدلتے وقت کا نوحہ	شرافت حسین	329
منگلی (انشائیہ)	ڈاکٹر شکیل احمد	332
میں تو رستے کا دیا ہوں (انشائیہ)	ظہیر حسن ظہیر	336

آئینہ در آئینہ (تبصرہ)

کتاب کا نام	مصنف/مرتب	مبصر	
زاویہ نقد و نظر	ڈاکٹر محبوب راہی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	338
چاندنی تخیل کی	ڈاکٹر محبوب راہی	ڈاکٹر شکیل احمد	340
مجھ کو محسوس کر کے دیکھ	سنمن اگروال	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	343
الحمداللہ، برلب کوثر	ڈاکٹر محبوب راہی	داکٹر محمد یحییٰ جمیل	345
حرف حرف لہو	ضر وصفی	ڈاکٹر شکیل احمد	348
دوسرا بھور وخاں	نور پرکار	رفیق اشفاق	354

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے (ادباء و شعرا کی وفات) 368-360

شمارہ نمبر (3) سن 2012ء

عنوان	اسمائے تخلیق کار	صفحہ نمبر
حصہ نثر		
ابتدائیہ	مرتب	5
خیال اپنا اپنا (خطوط)		9
حمد باری تعالیٰ	سعید رحمانی	21
حمد باری تعالیٰ	مہتاب پیکر اعظمی	22
نعت	مشرف حسین محضر	23
نعت	مہتاب پیکر اعظمی	24

فانی اور معاصر شعراء	سید امین اشرف	25
انیس انصاری کی شاعری میں درد کی علامت	وارث کرمانی	45
نئے تنقیدی مسائل اور امکانات	اسلم حنیف	51
نظیر زمینی صداقتوں کا ایک بے نظیر، ہمہ گیر، تنقید گزیدہ شاعر	ڈاکٹر محبوب راہی	63
ترقی پسند اردو ناول کے اسالیب	شہاب ظفر اعظمی	70
مولانا رومی کے کلام میں اخلاقی اور اصلاحی قدریں	غضنفر اقبال	92
اردو شاعری میں لسانی، عروضی اور فنی معائب کا ناقدانہ جائزہ	مہتاب پیکر اعظمی	96
رباعی اوزان کو مختلف اصناف کا نام دینے والا شاعر (کوثر صدیقی)	مشرف حسین محضر	102
کلام اقبال میں دریاؤں کا ذکر اور استعارہ	امتیاز الدین خاں	109
تبصرہ نگاری اور تاثراتی تنقید	معراج احمد معراج	114
مولوی مہیش پرشاد کے خطوط نظام جونپوری کے نام	محمد عرفان جونپوری	117
وقعات کشمیر کی تاریخی اہمیت	ڈاکٹر محمد قیصر	123
جنگوں کے اثرات سے اردو شاعری کی نفسیاتی تشکیل	قاسم یعقوب	128
باسط نقوی بیابانی کی نعتیہ شاعری	ڈاکٹر راہی	141

حصہ نظم

گیت، دوہے	ظفر گورکھپوری	145
بے مایہ جسم وجاں	ظہیر غازی پوری	146
رباعیات	مہدی پرتاپ گڑھی	147
غزل	کرامت علی کرامت	148
غزل	اسرار اکبر آبادی	149
ماھیئے ،بکھر گیا ہے جہان میرا	احسن امام احسن	150
دھوئیں کا پیکر ،نظر چپ ہے	ڈاکٹر راہی	151
التجا	مشرف حسین محضر	152
کھڑکی میں جڑا ہوا منظر	راشد جمال	152
شمس تبریزی	سعید الظفر چغتائی	153
غزل	حماد انجم	154
غزل	انس مسرور انصاری	155
غزل	شباب للت	155
دوبیتیاں	شارق عدیل	156
مجھے برف کی قبر میں دفنا دے	حنا انجم	157
غزل	احمد نثار جونپوری	159
غزل	نیر قریشی گنگوہی	159
غزل	غلام مرتضٰی راہی	160
غزل	ظفر اقبال ظفر	161
غزل	قمر سنبھلی	162

غزل	شاہد احسن مراد آبای	162
دھشت گردی اور مسلماں	شاہد احسن مراد آبادی	163
اردو گیت	ڈاکٹر فراز حامدی	164
غزل	پرتپال سنگھ بیتاب	165
غزل	احمر جلیسری	166
رباعیات	مامون ایمن (امریکہ)	166
غزل	نظام ہاتف	167
گیت	ساحر شیوی لیوٹن	168
غزل	پیام انصاری	169
صفر سے آگے	سہیل اختر	170
غزل	شفیق ندوی۔ ریاض	171
غزل	فاخر جلال پوری	172
غزل	رؤف صادق	173
غزل	نقشبندی قمر نقوی	173
غزل	عطا عابدی	174
غزل	مدہوش بلگرامی	174
غزل	سعید رحمانی	175
غزل	اظہر سلیم	176
غزل	گمان انصاری	176
غزل	اختر شاہجہاں پوری	177
غزل	ارشد کمال	178

غزل	ضیا فاروقی	179
غزل	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	180
غزل	احمد علی برقی اعظمی	181
غزل	سید قمر منٹو	182
غزل	وشال کھلر	182
غزل	افتخار جمیل شاہین (کراچی)	183
غزل	اے حق (لندن)	183
غزل	رئیس الدین رئیس	184
غزل	ڈاکٹر وکیل اشہر	185
حوصلہ،غزل	تشنہ نگینوی	186
غزل	اکمل شاکر (بلوچستان پاکستان)	187
بیاد قمر رئیس	نیاز جیراجپوری	187
غزل	محفوظ الرحمٰن عادل	188
غزل	ذکی محفوظ ایڈوکیٹ	188
غزل	محمد اکرام اکرم (کراچی)	189
غزل	عمران عظیم (ایڈوکیٹ)	190
غزل	وسیم نادر	190
غزل	مہتاب پیکر اعظمی	191
غزل	جاوید سامر	192
غزل	امتیاز احمد ساحل	192
غزل	راز اعظمی	193

غزل	شاح انور	193
غزل	عزیز نبیل	194
غزل	قاسم یعقوب (اسلام آباد)	195
گیت	اسحاق ساجد (جرمنی)	196
غزل	حفیظ انجم	197
غزل، التجا	نینا جوگن	198
غزل	بی۔ ایس جین جوہر	199
لہو کا چراغ	ڈاکٹر آفاق فاخری	200
غزل	شائستہ جمال	201
غزل	فہیم جاوید	201
غزل	زرتاج ہاشمی	202
غزل	فرمان چودھری	202
خدا ہی جانے	سید عبیداللہ ہاشمی	203
غزل	ڈاکٹر ایم نسیم عظمی	204
غزل	ڈاکٹر بختیار نواز	205
دوہے	ڈاکٹر شمیم ہاشمی	206
غزل	انجم عرفانی	207
غزل	اسلم ایڈوکیٹ	207
قرارداد کتوں کی	محمد ہارون سیٹھ سلیم بنگلوری	208

افسانے

دشت کربلا	جیلانی بانو	209

واپس لوٹتے ہوئے	مشرف عالم ذوقی	217
انحد	حسین الحق	238
ہم آزاد ہیں	اقبال انصاری	256
لوگوں کی دعا	آنندلہر	257
ستاروں کی آنکھ مچولی	ڈاکٹر اختر سلطانہ	259
رام سیتو	رونق جمال	262
موسم کا حال	ایس ایم عباس	266
درمیان فاصلہ رہ گیا	جبیں نازاں	273
اللہ کے نام پر	سعید فریدی	279
آشرم	قاسم خورشید	283
سروش مچھلی شہری (خاکہ)	عبرت مچھلی شہری	288
عورت کل اور آج (طنزومزاح)	ڈاکٹر غافل انصاری	294
پتلی گلی	وسیم حیدر ہاشمی	298
ننھا مجرم	ظہیر حسن ظہیر	299

آئینہ در آئینہ (تبصرہ)

کتاب کا نام	مصنف رمرتب	مبصر	
ترقی پسند تحریک کی تاریخ	ڈاکٹر عبدالقیوم شمسی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	302
لینڈرا	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	303
افسانہ نگار اور افسانے	ڈاکٹر سید احمد قادری	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	304
گیسوئے تنقید	ڈاکٹر امام اعظم	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	306
عہد اسلامیہ میں دربھنگہ اور	محمد الیاس رحمانی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	309

دوسرے مضامین

خواب وخیال	بی ایس جین جوہر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	310
حنیف نقوی نمبر۔ادراک گوپال پور	مدیر اعزازی (پروفیسر سید حسن عباس)	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	313
حسن نظر	درشن کپور فلک	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	315
ادبیات محمود (تحقیقی مضامین)	ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی	ڈاکٹر شکیل احمد	317
مریخ کا سفر	وسیم حیدر ہاشمی	ڈاکٹر شکیل احمد	318
کاروان رفتگاں (مرتب ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی)	مولانا مجیب اللہ ندوی	ڈاکٹر شکیل احمد	319
سلاطین دکن کے عہد میں شادیاں	اسلم مرزا	ڈاکٹر شکیل احمد	320
ہوادشت دیار	مظفر ایرج	ظہیر حسن ظہیر	321
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے (ادباء وشعرا کی وفات)			334-324

شمارہ نمبر (4) سن 2013ء

عنوان	اسمائے تخلیق کار	صفحہ نمبر
	حصہ نثر	
ابتدائیہ	مرتب	5
خیال اپنا اپنا (خطوط)		8
حمد باری تعالیٰ	حماد انجم	17
نعت	حماد انجم	18
ادب کا متنی نظریہ	احمد سہیل	19

مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کے نظریاتی اختلافات	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	28
اشعار غزل میں عروضی وفنی معائب..... ایک تنقیدی جائزہ	ظہر غازی پوری	41
جوش ملیح آبادی کے کلام میں ہندوستانیت	ڈاکٹر نریش	55
سب بولیوں سے اچھی اردو زباں ہماری	معین الدین	60
شاہد ماہلی کے شعری امتیازات	پروفیسر علی احمد فاطمی	64
عصر حاضر کا نمائندہ افسانہ نگار....... شرافت حسین	ڈاکٹر رضوان انصاری	76
حسن چشتی دیار غیر میں اردو کا سفیر بے نظیر	ڈاکٹر راہی	80
اردو طنز ومزاح اور مصطفے کمال کی ادبی خدمات	محمد مجاہد سید	86
علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور شاعری کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر شکیل احمد	89
اردو زبان پر فورٹ ولیم کالج کے اثرات	ڈاکٹر لطیف احمد	93
عبدالرحیم نشتر کی غزل	غلام مرتضی راہی	107
علم وادب کا عظیم الشان مرکز دار المصنفین	ڈاکٹر انور ادیب	111
پیکر حسن فن ''خوفناک''	امام قاسم ساقی	115
یادوں کی بازیافت...... ایک جائزہ	ضیاء فاروقی	121
اردو کا مسئلہ...... ایک لمحہ فکر	احسن امام احسن	124
مظفر حنفی کی غزل گوئی کا جائزہ (یا اخی کے کے حوالے سے)	معراج احمد معراج	129

علامہ فاروق بانسپاری..... اقبال ثانی فکر اصلاحی کے علمبردار	پروفیسر خورشید نعمانی رودولوی	135
غزل گو شعری فکر کا آئینہ بنانے والا شاعر... ...رئیس الدین رئیس	شارق عدیل	144
پروفیسر نظیر احمد اور ان کی ادبی خدمات	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن	150

حصہ نظم

برنی نے کہا	انیس انصاری	157
اونچائی کا دکھ	ظفر گورکھپوری	159
گیت غزل	نیاز جیراجپوری	160
غزل	نیر قریشی گنگوہی	161
دھرتی ماں	ڈاکٹر طاہر سعید ہارون	162
غزل	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	162
دوبیتیاں	شارق عدیل	163
غزل	راشد جمال فاروقی	164
اے صبح نو	سید عبداللہ ہاشمی	165
غزل، میری نگاہیں	احسن امام احسن	167
بھیگتا موسم، پتھر کی مورت	ڈاکٹر راہی	168
کل اور آج آزادی کے پس منظر میں	سکندر عرفان	169
آخری منظر	عزیز نبیل	170
ترانہ اک فقیر	ڈاکٹر شفیق ندوی	171
نظم مزدور	انیس احمد خاں	172

غزل	علقمہ شبلی	173
غزل	عبدالرحیم نشتر	174
نذر غالب	ظہیر غازی پوری	175
غزل	اختر شاہجہاں پوری	176
غزل	مدہوش بلگرامی	177
غزل	م۔ لئیق انصاری	178
غزل	انجم عرفانی	179
غزل	شوکت علی ناز (دوحہ قطر)	180
غزل	افتخار راغب (دوحہ قطر)	180
غزل، بنجر خواب	فہیم جاوید (سعودی عرب)	181
غزل	محمد اسلم غازی	182
غزل	طرب صدیقی	183
غزل	کیفی سنبھلی	184
غزل	سعید رحمانی	184
غزل	جعفر ساہنی	185
غزل	مہدی پرتاپ گڑھی	186
غزل، ماھیا نما	راہی صدیقی ہردویانوی	187
غزل، انکشاف	فاطمہ تاج	188
غزل	شاہد سیانوی	189
غزل	مشرف حسین محضر	190
غزل	ڈاکٹر خاور خاں سرحدی	191

غزل	پیام انصاری	192
غزل	نظام ہاتف	193
غزل	ڈاکٹر ایم آئی ساجد	193
غزل	عبدالرحیم ارمان	194
غزل	اظہر سلیم	195
غزل	گمان انصاری	195
نوجوانوں سے خطاب،غزل	طاہرہ تبسم اعظمی	196
غزل	راز اعظمی	197
غزل	حفیظ انجم کریم نگری	197
غزل	محفوظ الرحمٰن عادل	198
سوچتی ہوں تمہیں	نینا جوگن	198

افسانے

کنارک کا مندر (منظوم ڈرامہ)	عبدالمتین جامی	199
بغیر دروازے کا گھر	مراق مرزا	235
چنگیز خاں کا انجام	وشوا ناتھ طاؤس	240
ایک لو اسٹوری	م۔ ناگ	244
میں ساری کی ساری تمہاری	دیپک بدکی	251
پھول والی	آنند لہر	257
ڈرپوک لمحے	ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی	260
کمیشن کا مشن	محمد طارق	264
غبار	شرافت حسین	271

گوری سووے سیج پر	جبیں نازاں	276
دیوار	فرحت جہاں	283
صدقہ جاریہ	ڈاکٹر قمر الزماں	290
پھر ملیں گے اگر	ظہیر حسن ظہیر	293

آئینہ در آئینہ (تبصرہ)

کتاب کا نام	مصنف/مرتب	مبصر	
ہوا کے شامیانے میں	جعفر ساہنی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	296
کلیات راہی	غلام مرتضیٰ راہی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	297
خیریات	رؤف خیر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	299
شہر آرزو	ڈاکٹر منور انجم	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	300
چراغ غزل	شیو بہادر سنگھ دلبر	م۔ لئیق انصاری	302
کتابیات شبلی	مرتب ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	304
راجستھان میں اردو تراجم	ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	306
حرف حرف معتبر	ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	308
انیسویں صدی میں اردو زبان	ناہید فاطمہ	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	310
مئو شہر ہنروراں	ڈاکٹر شکیل احمد	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	311
جون پور کے چند شعراء (ماضی قریب اور حال کے آئینے میں)	ایس ایم عباس	ظہیر حسن ظہیر	313
سلگتے خواب	زاہد ٹانڈوی	طارق فریدی	314

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے (ادباء و شعرا کی وفات) 332-316

شمارہ نمبر(5)سن 2014ء

عنوان	اسمائے تخلیق کار	صفحہ نمبر
	حصہ نثر	
ابتدائیہ	مرتب	6
خیال اپنا اپنا (خطوط)		11
حمدیہ رباعیات	شارق عدیل	18
حمد	صابر مرزا	19
نعت پاک	سعید رحمانی	19
ڈاکٹر محبوب راہیؔ: مثبت رویوں کا ناقد و محقق	ڈاکٹر عظیم راہی	20
اظہر جاوید کی غزل عشق کے متنوع موضوعات کا نگارخانہ	ڈاکٹر محبوب راہی	29
محمد علی جوہر اور تعلیم کی روشن خیالی	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	33
اردو غزل اور پاکستانی شاعرات	ڈاکٹر علیم صبا نویدی	41
فراز حامدی دربار نبوت میں	مختار ٹونکی	60
تعمیری ادب	ڈاکٹر انس مسرور ترابی	67
آغا حشر کاشمیری کے کردار	قاسم خورشید	75
ڈاکٹر علیم مسرور کا ادبی نقطہ نظر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	82
جو حرف حرف نہ پرکھے تو سخنور کیسا	شارق عدیل	88
حسیب رہبر ایک البیلا فنکار	احسن امام احسن	98
فضا ابن فیضی منفرد لہجہ کا رباعی گو شاعر	ڈاکٹر رضوان انصاری	101
روہیل کھنڈ میں ضلع بریلی کے غیر مسلم شعراء کی	محمد سلمان بلرام پوری	104

تخلیقات کا اجمالی جائزہ

پروفیسر امیر حسن عابدی: حیات و خدمات	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن	109
امام قاسم ساقی شخصیت اور فن	سعداللہ گلشن	121
اقبالؔ کے تغزل پر ایک نظر	ڈاکٹر مطیع الرحمٰن عاشقؔ	131
دہلی میں اردو صحافت	رفیق اشفاق	142
میر کی میری اور فنی شاعری	شاہانہ مریم	147
کوہ سبز کا کوہ نور: حامدی کاشمیری	شرافت حسین	152
نباتات (اگنے والی اشیاء)	عبدالمتین منیری (بھٹکل)	157

حصہ نظم

اندوختہ	ظفر گورکھپوری	162
غزل	ماہر عبدالحی	163
غزل	مظفر حنفی	164
آبنائے فکر (طویل نظم "قلم فردوس" سے ماخوذ) خاور نقیب		165
غزل	ظہیر غازی پوری	170
غزل	سردار شفیق	171
غزل	محبوب راہی	172
غزل	ڈاکٹر منور انجم	173
نظم	جمال قدوسی	174
غزل	ڈاکٹر شفیق اعظمی	174
غزل	عبدالرحیم نشتر	175
نذر اقبال	اسلم ایڈوکیٹ	176

غزل	اظہر سلیم	177
غزل	گمان انصاری	178
غزل	انس مسرور ترابی	179
سگریٹ (منور رآنا کی نذر)	وسیم فرحت کارنجوی (علیگ)	180
رباعی (ساقی نامہ)	حماد انجم	181
رباعیاں	حماد انجم	182
گیت،صفائی کرمچاری	شارق عدیل	183
غزل	مہدی پرتاپ گڑھی	184
غزل	غلام مرتضیٰ راہی	185
غزل	نیر قریشی گنگوہی	186
غزل	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	187
غزل	علیم صبا نویدی	188
غزل	مدہوش بلگرامی	189
غزل	رمضان علی سحر	190
مشہور شاعر احمد فراز کی یاد میں	منتظر احمد	191
غزل	محمد یاسین صدیقی	191
غزل	سعید رحمانی	192
غزل	ڈاکٹر مطیع الرحمٰن غاسق	192
غزل	مختار عاشقی	193
غزل	اصغر شمیم	194
غزل	راز اعظمی	195

غزل	حسن فرخ	195
غزل	ضررو صفی	196
غزل	حیرت فرخ آبادی	197
غزل	نظام ہاتف	198
غزل	حنا انجم	199
غزل	حفیظ انجم کریم نگری	200
غزل	انیس احمد خان منیری	201
غزل	سہیل اختر	202
نظم، غزل	اسحاق ساجد (جرمنی)	203
غزل	شفیق ندوی (ریاض)	204
غزل	محفوظ الرحمٰن عادل	204
غزل	جعفر ساہنی	205
غزل	وسیم نادر	206
غزل نما	مشرف حسین محضر	207
غزل	ڈاکٹر صابر مرزا (جموں کشمیر)	208
غزل	سکندر حمید عرفان	209
غزل	نیاز جیراجپوری	210
نذر جمال احسانی	عدیل زیدی	210
غزل	ڈاکٹر قمر الزماں	211
غزل	سعید اختر اعظمی	212
غزل	پیام انصاری	213

غزل	عزیز نبیل	214
غزل	شرافت حسین	214
غزل	ساجد غازی پوری	215
غزل	ڈاکٹر عنبر آفاقی	216
غزل	اختر شاہجہاں پوری	217
غزل	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	218
ایک عنوان تین نظمیں	ایم آر چشتی	219
سنو تم لوٹ آؤ نا	سید اختر اعظمی (ریاض)	220
سنو تم لوٹ آؤ نا	ذاکر خاں ذاکر	221
غزل	شمسی قریشی	222

افسانے

سلسلہ	آنند لہر	223
ناخدا	احمد رشید	225
کیسا ہے جنون	نور شاہ	228
شکریہ	جبیں نازاں	232
مجبوریاں	مقصود الٰہی شیخ	236
روشنی	رضوان رضوی	241
دیجیے اور لیجیے	ایس ایم عباس	247
کنی کا راج کمار	قاسم خورشید	252
ہمدرد	محمد الیاس ندوی	258
اظہار محبت	طارق فریدی	268

افسانچے	محمد اظہر فاضل	272
ہے نہ وہ نیتا نہ ہے نچر	ظہیر حسن ظہیر	273

آئینہ در آئینہ (تبصرہ)

کتاب کا نام	مصنف/مرتب	مبصر	
انجمن (دو جلدوں میں)	ڈاکٹر حسن الدین احمد	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	277
اردو طبی رسائل و جرائد برصغیر ہند و پاک میں	ڈاکٹر وسیم احمد اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	278
محمد بن زکریا رازی احوال و آثار	ڈاکٹر وسیم احمد اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	280
مطالعہ مخطوطات (طب یونانی کے حوالے سے)	ڈاکٹر وسیم احمد اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	281
احادیث نبوی میں پھلوں کا تذکرہ	ڈاکٹر وسیم احمد اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	282
پریمی رومانی فکر و فن	پروفیسر محمد اسد اللہ دوانی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	283
فکر و نظر	ڈاکٹر شفیق اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	284
مکتوبات مظفر حنفی بنام محبوب راہی	محبوب راہی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	285
تاویلات و تمثیلات	محبوب راہی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	286
اردو کا سفر دیر سے حرم تک	محبوب راہی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	287
سمندر شناس	احسن امام احسن	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	288
علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط	ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	289
سخن آئینہ	مظفر ایرج	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	291
دارالمصنفین کی عربی خدمات	ڈاکٹر محمد طارق عمری	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	292
انفرادیت کی تلاش	ڈاکٹر آفاق فاخری	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	293

لائف لائن (بچوں کی نظمیں)	ڈاکٹر آفاق فاخری	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	294
یاد ایام: تذکرہ ماضی وحال	حکیم محمد جنید شاداں عباسی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	295
جب تک منظر بدل نہ جائے	سید ریاض رحیم	ڈاکٹر عنبر آفاقی	297
آفتاب رسالت (نعتیہ مجموعہ)	اسحاق انور	ڈاکٹر عنبر آفاقی	298
مکتوبات مظفر حنفی بنام محبوب راہی	محبوب راہی	مفتی حبیب الرحمٰن ندوی	299
کہی ان کہی	سید آصف دسنوی	ڈاکٹر عنبر آفاقی	300
نوائے مشتاق	مشتاق احمد مشتاق	ڈاکٹر عنبر آفاقی	301
علامہ شبلی نعمانی: شخصیت اور شاعری	مطیع الرحمٰن غاسق	ڈاکٹر وکیل اشہر	302
جلتے بجھتے خواب	محفوظ الرحمٰن عادل	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن	304
اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار: ایک تجزیاتی مطالعہ	ہاجرہ بانو	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	305
اردو شاعری میں جانور	مختار بدری	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	307
احادیث نبوی میں سبزیوں کا تذکرہ	ڈاکٹر وسیم احمد اعظمی	ظہیر حسن ظہیر	309
مہک داغوں کی	علیم صبا نویدی	ڈاکٹر عنبر آفاقی	311
تعلیمی نکات	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	ابوالوفا صدیقی	313
تنقیدی اسمبلاژ	حقانی القاسمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	314
راہ طیبہ	انیس منیری	ظہیر حسن ظہیر	317
کرشن چندر کے ناولوں میں سماجی شعور	ڈاکٹر انور شفیق اعظمی	ظہیر حسن ظہیر	318

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے (ادباء وشعرا کی وفات) 334-321

شمارہ نمبر(6)سن 2015ء

عنوان	اسمائے تخلیق کار	صفحہ نمبر
	حصہ نثر	
ابتدائیہ	مرتب	4
خیال اپنا اپنا(خطوط)		8
مناجات	سعید رحمانی	12
نعت	ڈاکٹر علی عباس امید	13
نعت	ڈاکٹر صابر مرزا	13
شاد عارفی کی بازیافت	ڈاکٹر محبوب راہی	14
اردو غزل میں ردیف قوافی کے مسائل	ظہیر غازی پوری	26
زوال تحقیق کا منظر نامہ	حقانی القاسمی	37
ظہیر غازی پوری کا تنقیدی رویہ	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	49
سعادت حسن منٹو اور بچوں کی نفسیات	ڈاکٹر محمد مستمر	64
سید حامد ایک مستقل بیں شخصیت	ڈاکٹر حکیم وسیم احمد اعظمی	76
اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر سماجی اقدار	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	82
مری ہر بات کو تم لوگ دل سے باندھ کر رکھنا	شارق عدیل	98
مصحفی کی مثنوی نگاری ایک مطالعہ	ڈاکٹر الف ناظم	110
دلت سماج کا کچوٹ اور پریم چند کے افسانے	ڈاکٹر اعظم انصاری	127
لفظوں کی پرواز کا شاعر......انعام حنفی	احسن امام احسن	149
مولانا قاضی سجاد حسین.......احوال وآثار	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن	152

تعلیمی نکات: لاعلمی کے اندھیرے میں بھٹکنے والوں کے لیے مینارۂ نور	قاضی مشتاق احمد	156
علامہ شبلی کی تنقید نگاری	سلمان بلرام پوری	158
فکروفن کے آئینے میں رحمت قریشی اور ان کا گلستاں	ابوذر انصاری	163
خطوط اکبرالہ آبادی میں پردے کا ذکر	محمد عرفان جون پوری	168
علامہ اقبال کا فارسی شاعری کی طرف میلان	تنویر حسن	173
اردو میں طنزومزاح کی فنی ابتداء	شبینہ خاتون	178
رابندر ناتھ ٹیگور حیات اور علمی، سماجی خدمات	زبیرہ نیرہ	186
تحفظ حقوق نسواں اور اردو شاعری	شاہانہ مریم	202

حصہ نظم

روشنی میں	ظفر گورکھپوری	209
تم سا جو ہمسفر ہے ساتھ مرے	ظفر گورکھپوری	210
کرائے کا جنم	ظفر گورکھپوری	211
فطرت کا بلاوہ، بشارت نئی جہتوں کی	ظہیر غازی پوری	212
بستر علالت سے ایک نظم	ڈاکٹر علی عباس امید	213
دوبیتیاں	شارق عدیل	214
اے ہماری جانِ جاں، اردو زباں اردو زباں	اسلم ایڈوکیٹ	215
ایک فنکار کی آواز	اسلم ایڈوکیٹ	218
غزل	مظفر حنفی	219
غزل	غلام مرتضیٰ راہی	220

غزل	ظفر گورکھپوری	221
غزل	عبدالرحیم نشتر	222
غزل	مہدی پرتاپ گڑھی	223
چند منتخب مقطعے	ڈاکٹر محبوب راہی	224
غزل	سعید رحمانی	225
غزل	عبدالحی پیام انصاری	226
غزل	معراج احمد معراج	227
غزل	گمان انصاری	228
غزل	پرتپال سنگھ بیتاب	229
غزل	اظہر سلیم	230
غزل	محفوظ الرحمٰن عادل	231
غزل	اسلم ایڈوکیٹ	232
دوہے	ڈاکٹر معین الدین شاہین	233
غزل	سلیم اختر	234
غزل	شمسی قریشی	235
غزل	ڈاکٹر ذکی طارق	235
غزل	راز اعظمی	236
غزل	سعید اختر اعظمی (ریاض)	237
غزل	بدر محمدی	238
غزل	عارف رئیس	239
غزل	ڈاکٹر نوشاد احمد کریمی	240

غزل	شارق عدیل	241
غزل	وفانقوی	242
غزل	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	242

افسانے

گھٹی ہوئی چیخ	شاکر کریمی	243
بعد مرنے	قاضی مشتاق احمد	249
ارادہ	ایس ایم عباس	255
لوگ، لوگ ہے	آنند لہر	259
ایک ادھوری کہانی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	264
فیصلے کے بعد	احمد رشید	283
سبک دوش	وسیم حیدر ہاشمی	296
گھاٹ	شرافت حسین	300
پیار کا مندر	سراج فاروقی	307
افسانچے	صابر فخر الدین	317

آئینہ در آئینہ (تبصرہ)

کتاب کا نام	مصنف رمرتب	مبصر	
شاد عارفی: حیات وجہات	فیروز مظفر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	319
بساط سخن (رباعیات)	عبدالمتین جامی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	320
پیکر جہد و عمل: غنی غازی	ڈاکٹر محبوب راہی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	322
تازہ ہوا	عبدالحی پیام انصاری	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	324
غزلستان	سلطان اختر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	325

تنقیدی اشارات	پروفیسر مظفر حنفی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	327
تمل ناڈو میں اردو کی سمت و رفتار	ڈاکٹر علیم صبا نویدی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	329
بیاض رحمت	خاور نقیب	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	330
تحفۃ الاحباب بنارس	پروفیسر (خانم) شمیم اختر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	332
شرح انتخاب قصائد خاقانی	پروفیسر (خانم) شمیم اختر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	333
تاسیس (تحقیق و تنقید)	ڈاکٹر امام قاسم ساقی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	334
چوتھا فن کار	شبیر احمد	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	335
اکیسویں صدی کا چیلنج اور ملی تعلیمی ایجنڈا	پروفیسر احمد سجاد	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	336
کیا برصغیر کی اردو آبادی عذاب مسلس کا شکار ہے؟	پروفیسر احمد سجاد	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	337
باغ بہشت	داکٹر ہاجرہ بانو	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	338
سانس لیتا شہر	مہدی پرتاپ گڑھی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	339
سب رنگ سخن کے	مختار ٹونکی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	340
صفحۂ دشت	ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	342
تم اب بھی؟ (افسانوی مجموعہ)	سراج فاروقی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	343
اردو نامہ نمبر ۲	پروفیسر صاحب علی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	345
دل ہے آئینہ_ نقشبندی قمر نقوی بخاری کی ادبیات کا جائزہ	رئیس الدین رئیس	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	346
تنقیدی تلازمے	ڈاکٹر ہاجرہ بانو	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	348
حاضر غائب (افسانے)	اشتیاق سعید	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	349
فلک آثار	پرت پال سنگھ بیتاب	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	350

باقیات عصمت جاوید	محمد غازی، منور جہاں احمد اقبال	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	352
گپ شپ	محمد اسداللہ	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	354
مضامین بسمل	بسمل اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	355
عکس واثر	ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	356
ماہنامہ ''نیادور'' کا خمار بارہ بنکوی نمبر	ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	357
عکس حنا	لئیق خاں کوثر کمال زئی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	358
سارے موسم اس کے ہاتھ	عبدالرحیم نشتر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	359
عرش غزل (کلیات غزل)	داکٹر علیم صبانویدی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	361
آتھ آنے کی مٹھاس	سلطان اختر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	362
ارشد مینانگری_ایک جامع الکمالات قلم کار	ڈاکٹر محبوب راہی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	363
سنگاخ زمینوں کا مسافر (ڈاکٹر محمد کلیم ضیا)	لطیف ثانی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	364
شیطان کے بیٹے کی شکست	ڈاکٹر انور شفیق	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	365
مطالعہ ابوالکلام آزاد اور وہاب قیصر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	366
پونایاترا (سفرنامہ)	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	368
مطالعہ اختر شیرانی (تلاش وتجزیہ)	مختار ٹونکی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	369
ادبیات راجستھان	ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	370
سید ظفر ہاشمی: ایک نابغہ	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	371
نیر اعظمی کے سہرے	ڈاکٹر رضوانہ معین	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	372

فصیل (نظمیں)	شارق عدیل	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	373
اعمال نامے	الف احمد برقی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	375
فکر و آہنگ	محمد حبیب اللہ نیر اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	376
ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات	ظہیر حسن ظہیر	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن	378
دنیا مایا جال (دوہے)	سراج دہلوی	ڈاکٹر عنبر آفاقی	379
وجدان	اصغر حسن محبی	ڈاکٹر عنبر آفاقی	380
چراغ قربتوں کے	مشتاق سنگھ	ڈاکٹر عنبر آفاقی	381
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (بحیثیت شناس)	شائستہ ریاض	ڈاکٹر شکیل احمد	382
نامدیو	آنندلہر	ڈاکٹر شکیل احمد	382
ادبی شذرات	ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی	ڈاکٹر شکیل احمد	383
ایک دن کا لمبا سفر	شاکر کریمی	ڈاکٹر شکیل احمد	385
اردو اور اڑیا کا افسانوی ادب، ترقی پسندی کے تناظر میں	داکٹر شیخ مبین اللہ	ڈاکٹر شکیل احمد	386
الہام	احمد امام بالاپوری	ڈاکٹر عنبر آفاقی	388
روپ کی دھوپ	محفوظ الرحمٰن عادل	ظہیر حسن ظہیر	389
افکار مجیب	ڈاکٹر عبداللہ عمار رشادی	ظہیر حسن ظہیر	391
رقص بسمل	بسمل اعظمی	ظہیر حسن ظہیر	392
شعر و نغمہ	بی ایس جین جوہر	ظہیر حسن ظہیر	394
مکاں سے لامکاں تک	ڈاکٹر اختر حسین شافی	ظہیر حسن ظہیر	395

شمارہ نمبر (7) سن 2016ء

عنوان	اسمائے تخلیق کار	صفحہ نمبر
	حصہ نثر	
ابتدائیہ	مرتب	5
نظر اپنی اپنی خیال اپنا اپنا (خطوط)		13
حمد باری تعالیٰ	شارق عدیل، سعید رحمانی	21
نعت نبی	اثر انصاری (مرحوم)	22
علمی کتابوں کے ترجمے کے مسائل اور طریقہ کار	پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی	23
قرۃ العین حیدر کا افسانوی اسلوب	پروفیسر طارق چھتاری	27
مجاز کی نظم ''آوارہ'' شکست رومان کا ایک روح فرسا منظر	پروفیسر مولا بخش	33
زندگی کی تابندہ صداقتوں اور احساس کی پائندہ حرارتوں کا شاعر: ڈاکٹر راہی	ڈاکٹر محبوب راہی	54
سخن شجر پہ شاخ قندیل	حقانی القاسمی	63
لیوٹالسٹائی: ایک مطالعہ	انس مسرور انصاری	69
اکیسویں صدی میں غزل کے تیور	ڈاکٹر محمد مستمر	82
شبلی کا ذوق تاریخ نگاری	عطا عابدی	91
انجم عثمانی کی کہانی ''وہ ایک بوڑھا'' کا تجزیاتی مطالعہ	شارق عدیل	106
مہر زریں کی نظمیہ شاعری میں تخلیقی آگہی	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	110

دشت بے تمنا کا سیاح: م۔ناگ	اشتیاق سعید	123
نالۂ شب گیر: عورت کی حقیقت دور حاضر میں	رئیس فاطمہ	131
غنی اعجاز کی غزل	پروفیسر محمد دانش غنی	138
تھوڑی دیر عابد معز کے ساتھ	حکیم ڈاکٹر وسیم احمد اعظمی	142
ڈاکٹر محمد عبدالقادر احقر عزیزی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن	146
ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات	احمد رشید	152
اردو اور ہماری ذمہ داریاں	سعید رحمانی	155
اردو ذریعۂ تعلیم_ایک پہلو یہ بھی	عطا عابدی	158
مولانا حالی کی سوانح نگاری کی معنویت	محمد زبیر	161
ڈرامہ ''فسادی'' کی تصویر کشی	نیبو لال	169
اسلم ایڈوکیٹ اور ان کی شاعری	اعزاز الدین اعزاز	175

حصہ نظم

معصوم فرشتے (16/دسمبر 2014 کے آرمی پبلک اسکول پشاور سانحہ کے پس منظر میں)	سعید اختر اعظمی	179
ترانہ جمہور	مرغوب اثر فاطمی گیاوی	180
زندگی	حفیظ انجم کریم نگری	182
نہیں سکتا، دعا، حقیقت زادواھے	شارق عدیل	183
سفر، میرا کمرہ	احمد رشید (علیگ)	184
سانیٹ	اسلم ایڈوکیٹ	185
فریب آرزو	اسلم ایڈوکیٹ	186
نظم	محفوظ الرحمٰن عادل	187

غزل	ظفر گورکھپوری	188
غزل	ڈاکٹر جمیل دوشی	189
غزل	سلطان اختر	191
غزل	محبوب راہی	192
مطالعے/مقطعے یکساں غزل سے	عطا عابدی	194
غزل	اختر شاہجہاں پوری	195
قطعات، غزل	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	196
غزل	ظفر اقبال ظفر	197
نذرِ جاں نثار اختر	ڈاکٹر راہی	198
غزل	مہدی پرتاپ گڑھی	199
غزل	گمان انصاری	200
غزل	مدہوش بلگرامی	201
غزل	ڈاکٹر نوشاد احمد کریمی	202
رباعی کے اوزان میں	شارق عدیل	203
غزل	اظہر سلیم	204
غزل	محفوظ الرحمٰن عادل	205
غزل	جنوں اشرفی	206
غزل	پیام انصاری	206
دوھے، ان دنوں (سانیٹ)	نیاز جیراجپوری	207
غزل	اختر کاظمی	208
غزل	اسلم ایڈوکیٹ	209

غزل	ڈاکٹر بختیار نواز	210
غزل	ساجد غازی پوری	211
غزل	ڈاکٹر وارث انصاری	211
غزل	مرغوب اثر فاطمی	212
غزل	فضل الرحمٰن اسلم	212
غزل	فرحت حسین خوشدل	213
غزل	سعید رحمانی	214
غزل	سعید اللہ شاد	215
غزل	راز اعظمی	216
غزل	منظر جمیل عاشق	216
غزل	شاہد کلیم جاذل	217
غزل	انجنا کشش	217
غزل	حسن امام فدائی	218
غزل	محمد مختار وفا	219
غزل	آئینہ ایس کے	220

افسانے

ایسا بھی ہوتا ہے	ایس ایم عباس	221
تیاگ	آنند لہر	225
اپنی موت سے پہلے اولاد کو ورثہ نہیں دو	عبدالغنی شیخ	227
حاشیہ پر	احمد رشید	231
گھر واپسی	شرافت حسین	239

گتھی	ڈاکٹر محمد مستمر	245
قتل گاہ	جبیں نازاں	260
ایک چاقو کا فاصلہ	توصیف بریلوی	265
رنڈیاں: ہندی کہانی (رام دھاری سنگھ دیواکر) مترجم: عبدالباری ایم. کے		270
افسانچے (بوڑھے کی لاٹھی)	صابر فخرالدین	278
نالائق	سرراج فاروقی	280

آئینہ در آئینہ (تبصرہ)

کتاب کا نام	مصنف رمرتب	مبصر	
اردو کے چند فکشن نگار (تنقید و تجزیہ)	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	پروفیسر مولا بخش	285
مقال	ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	287
کاوش قلم	ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	288
تنقیص و تقریظ	ڈاکٹر محمد مستمر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	289
شبلی اور جہان شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	291
ڈاکٹر شریف احمد قریشی بحیثیت فرہنگ نویس	ڈاکٹر ناصر پرویز	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	292
متاع رفتگاں (شاہ معین الدین احمد ندوی)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	293
اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی	ڈاکٹر شکیل احمد	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	294
وحشی سعید ایک منفرد فکشن نگار	ڈاکٹر سیفی سرونجی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	295
سکندر فہمی	سلطان اختر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	297

اقبال اور دبستان شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	299
امریکہ میں اردو کے علمبردار ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی	سلطان اختر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	300
احمد امام کا رنگ سخن	قاسم عمران	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	302
ش بانو، ادیب...... یہیں کہیں	عمران عظیم، ساحر داؤد نگری	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	303
سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے (افسانے)	آنند لہر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	304
حدوں سے آگے	ڈاکٹر محمد مستمر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	305
کالے چراغوں کی روشنی میں	نسیم بن آسی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	307
کبیر احمد جائسی نمبر (بزم شبلی)	ڈاکٹر شباب الدین	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	308
سہ ماہی بھاشا سنگم (گوشۂ کلیم عاجز)	مدیر اعلا: ششر سنہا	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	309
سہ ماہی انتساب عالمی	ڈاکٹر سیفی سرونجی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	310
جو اکثر یاد آتے ہیں	ڈاکٹر محمد ارشد خاں	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	311
محراب شب سے گری روشنی (تثلیثات)	صابر فخر الدین	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	312
شعاع (رموز حیات)	عبدالرحمٰن سنبھوی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	314
مسلم سائنس دانوں کی سائنسی خدمات	جنید عبدالقیوم شیخ	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	315
یہ کائنات	انصار احمد مروفی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	316
آئینۂ سخن	احمد ندیم مورسنڈول	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	318
مکتوبات محبوب راہی بنام نذیر فتحپوری	ڈاکٹر محمد ذاکر نعمانی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	320
ایک کتاب ڈاکٹر محبوب راہی کی	ڈاکٹر عبدالوحید نظامی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	321

کثیرالکلامی کے نام			
زندگی اپنی (خودنوشت سوانح)	شفیق احمد خاں راہی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	322
یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ	ڈاکٹر محبوب راہی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	324
انشائیہ کی روایت مشرق ومغرب کے تناظر میں	محمد اسد اللہ	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	326
سخن وران اعظم گڑھ (حصہ اول الف)	قمر الزماں مبارکپوری	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	328
شہر کی انگلیاں خوں چکاں	پروفیسر حمید سہروردی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	329
مقالات ڈاکٹر محمد شکیل احمد صدیقی (سندیلوی)	ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	330
افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں (تنقیدی مضامین)	محمد بشیر مالیرکوٹلوی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	331
مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق	ڈاکٹر مختار شمیم	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	333
فکر پارہ پارہ	مختار ٹونکی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	334
اکیلا ہنس (افسانے)	شرافت حسین	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	336
سمٹتا سائبان (سوانحی خاکے)	ڈاکٹر شکیل	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	337
مضامین ہاشمی	وسیم حیدر ہاشمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	338
پرندے تو مسافر ہیں	محمد دانش غنی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	339
آبروئے فلک	عابدہ خان کہکشاں	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	340
چل مدینے کی طرف	ہنر رسول پوری	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	341
نثر پارے (نثری نگارشات کا انتخاب)	ڈاکٹر ابرار اعظمی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	342
بھیرو کبھی نہیں مرا (ہندی ناول)	ڈاکٹر گنگا رام جی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	343

چوتھی سیٹ کا مسافر (افسانے)	م. ناگ	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	345
متاع نجات (حمد ونعت)	ڈاکٹر محبوب راہی	مفتی حبیب الرحمٰن ندوی	346
ناگپور میں اردو شاعری	ڈاکٹر شرف الدین ساحل	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	347
نظیر ثانی اشکؔ امرتسری: تعارف، تنقید اور تدوین کلام	ڈاکٹر معصوم شرقی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	350
مونس سخن (رباعیات)	عبدالمتین جامیؔ	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	352
ڈبل رول	محمد اسد اللہ	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	354
ادبی جائزے	ڈاکٹر عزیز اللہ معروفی	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	356
پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں	ڈاکٹر حنیف ترین	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	357
کلیات رہبر	داکٹر ارشد اعظمی	عدیلہ نسیم	360
تابش	عمران عظیم	عدیلہ نسیم	361
گلدستہ مضامین	اسامہ ارشاد معروفی قاسمی	عدیلہ نسیم	363
دیوان سلامہائے وقار حلم (کوثر سخن)	وقار حلم سید نگلوری	عدیلہ نسیم	364
کف آب	ڈاکٹر شمشاد احمد عنبر آفاقی	ظہیر حسن ظہیر	365
اثر انصاری: شخصیت اور شاعری	محمد زبیر	ظہیر حسن ظہیر	367
راجا رام موہن رائے اور ان کے تحریکی و تعلیمی کارنامے	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن	369
اردو نامہ (ششماہی)	مدیر: پروفیسر صاحب علی	محمد زبیر	370
فیضان آگہی (شعری مجموعہ)	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن	371
رئیس المعالجات (ہومیو پیتھی)	ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی	ڈاکٹر شمشاد احمد عنبر آفاقی	373
تکمیل (شعری مجموعہ)	اختر شاہجہاں پوری	ڈاکٹر شمشاد احمد عنبر آفاقی	374

نغمات کوثر (کوثر معروفی)	اسامہ ارشاد معروفی قاسمی	عدیلہ نسیم	376
دو ملک، ایک کہانی (افسانے)	عبدالغنی شیخ	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	378

*****

اختتامیہ

اختتامیہ

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں وہ ایک شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صحافی اور مفکر تعلیم کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ بحیثیت صحافی انھوں نے رسالہ و اخبار نکالا، طباعتی پریس لگایا، سماجی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ عوام میں تعلیم کے فروغ کی کوششیں کیں، حراء پبلک اسکول اور حراء ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی کا قیام کیا۔ درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم کا بغور مطالعہ کیا، اپنی تصانیف کے ذریعہ تعلیم کی کمیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی۔ تنقید و تحقیق کے میدان میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ بھی کیا۔ جس کا گذشتہ اوراق میں تفصیل سے جائزہ پیش کیا جا چکا ہے۔

پہلے باب میں نسیم اعظمی کے عہد و ماحول کو سمجھنے کے لیے اس خطۂ ارضی یعنی مئوناتھ بھنجن کا تاریخی، معاشرتی اور تعلیمی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے تاکہ ان کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ مئوناتھ بھنجن مشرقی اتر پردیش کا مشہور اور قدیم ترین قصبہ تھا اب وہ شہر ہے۔ اسے دست کاروں، کاشت کاروں اور محنت کشوں نے اپنا مسکن بنایا اور پارچہ بافی میں اس نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ یہاں کی عمومی صنعت پارچہ بافی ہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مغل حکمراں شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا کی جاگیر میں جب یہ علاقہ آیا تو انھوں نے اپنی پسند کے مخصوص کپڑے کی تیاری کے لیے کپڑے بننے کے کارخانے لگوائے تھے، چنانچہ حکومت کی سر پرستی کی وجہ سے کپڑے کی صنعت کو خوب شہرت حاصل ہوئی۔ اس شہر کی خاصیت کی وجہ سے یہ بھی مشہور ہے کہ مہاتما گاندھی اسے ہندوستان کا جاپان اور پنڈت جواہر لعل نہرو ہندوستان کا مانچسٹر کہا کرتے تھے۔

دوسرا باب نسیم اعظمی کی ولادت اور شخصیت سے متعلق ہے۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ نسیم اعظمی کی ولادت ہندوستان کے صنعتی شہر مئوناتھ بھنجن میں 12/ جنوری 1958ء کو ہوئی۔ ان کی بنیادی تعلیم مذہبی

وروایتی انداز میں ہوئی۔ 1973ء میں انھوں نے عربی فارسی بورڈ الہ آباد کا ''منشی'' کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا، اسی بورڈ کا امتحان ''کامل'' پاس کر لینے کے بعد ان کی با قاعدہ تعلیم کا سلسلہ تقریباً منقطع ہو چکا تھا، مگر انھوں نے ذاتی مطالعہ کی بنا پر اپنے آپ کو تعلیم سے الگ نہیں کیا بلکہ پرائیوٹ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور بنارس ہندو یونیورسٹی سینٹرل اسکول کی ایوننگ کلاس میں بی۔اے میں داخلہ لے کر کامیابی حاصل کی۔ایم۔اے حلیم مسلم کالج کانپور کے توسط سے کانپور یونیورسٹی سے کیا اور 1995ء میں یو جی سی نیٹ کا امتحان پاس کیا۔ویر بہادر سنگھ پروانچل یونیورسٹی سے اپنے استاد محترم جناب ''آثر انصاری حیات اور خدمات '' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر 2000ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

نہ صرف تعلیمی مرحلات کو تسیم اعظمی نے طے کیا بلکہ طالب علمی کے زمانے سے ہی علمی وفلاحی سر گرمیوں میں حصہ لیتے رہے مثلاً درجہ پنجم کی طالب علمی کے زمانے میں ہی یہاں کی بند پڑی لائبریریوں کو اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر از سر نو زندہ کیا جو طالب علموں اور مطالعہ کے شائقین کا مرکز بنی رہی۔ہائی اسکول کے طالب علمی کے زمانہ سے ہی ماہنامہ ''نکھار'' نامی قلمی رسالہ نکالنا شروع کر دیا تھا۔نکھار پبلی کیشنز اور ادبی ایوارڈ کی نظامت بھی بحسن خوبی انجام دی۔1996ء سے 1917ء تک ''مدرسہ رفیق الاسلام'' جونپور میں بحیثیت نائب مدرس عالیہ کے خدمات انجام دی، اسی دوران انھوں نے اپنا تحریری کام بھی جاری رکھا، ان کی کل سولہ تصانیف ہیں جن میں آثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں، نوائے سروش، تعلیمی تجزیے، تعلیمی جہات، آثر انصاری حیات اور خدمات، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات، نقد سخن، میزان آگہی، تعلیم اور تعلیمی افکار، آثر انصاری پر چند تحریریں، تعلیمی نکات، تعلیمی اشارات، اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ، راجا رام موہن رائے اور ان کے تحریکی و تعلیمی کارنامے، فیضان آگہی، اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزیہ وغیرہ قابل ذکر تصانیف ہیں۔

اس کے علاوہ چند تصانیف زیر اشاعت تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا مثلاً ''نقد ریزے''، ''عکس وآئینہ (تبصروں پر مشتمل مجموعہ)''، ''نظیر اکبرآبادی شخصیت وشاعری کے چند پہلو'' جس کی ذمہ داری اب ان کی صاحبزادی کے سپرد ہے۔

نسیم اعظمی چوں کہ کثیر التصانیف ادیب ہیں اس لیے ان کی علمی ،ادبی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں مختلف اردو اکادمیوں،سوسائیٹیوں اور اداروں نے مختلف اعزاز وانعامات سے نوازا ہے۔جس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔

نسیم اعظمی کا شمار ان چند مخصوص شخصیات میں ہوتا ہے جن کے اندر مختلف کمالات اور خوبیاں تھیں، وہ کسی ایک فن پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ مزید کی تلاش میں رہتے تھے، وہ صرف ایک اچھے شاعر یا ادیب ہی نہیں تھے بلکہ اپنی محنت ولگن سے بحیثیت صحافی ،معلم ،مفکر،محقق اور ناقد کے انھوں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

بحیثیت انسان نسیم اعظمی نہایت منکسر المزاج،متواضع ،نرم گفتار ونرم دل انسان تھے۔دوسروں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے،طلباء کی حوصلہ افزائی و رہنمائی کرتے رہتے تھے۔ان کی شخصیت کی ان خوبیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا ارشاد خلیل معروفی لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بحیثیت انسان بلند مقام پر فائز ہیں،آپ نہایت ملنسار،منکسر المزاج،متواضع اور خوش خصال ہیں،نرم خو،نرم گفتار،بہی خواہ اور دل درد مند رکھنے والے انسان ہیں،حوصلہ افزائی اور دوسروں کو آگے بڑھانا آپ کے نمایاں جوہر ہیں،یہی وجہ ہے کہ ریسرچ اسکالرز،تعلیمی سفر میں رہنمائی کے طالبین اور لکھنے پڑھنے سے تعلق رکھنے والوں کا ہجوم ورجوع آپ کے پاس رہتا ہے۔''

باب سوم میں نسیم اعظمی کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل کے رموز ونکات پر اچھی دسترس رکھتے ہیں۔انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں جذبے کی شدت، گہری معنویت اور فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ سے متعلق مضامین ملتے ہیں۔ان کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت ذہن میں شعری وفنی شعور کا احساس ہوتا ہے جس میں عصری حسیت کے ساتھ کلاسکیت بھی نظر آتی ہے۔

ان کی شاعری حساس اور زندہ دل شاعر کی شاعری ہے۔ان کی شاعری میں مختلف رنگ نظر آتے ہیں، اپنے گردوپیش کے حالات ومسائل کا تجزیہ وہ آسان اور سہل انداز میں کرتے ہیں۔اپنے کلام میں انھوں نے تعلیم کی اہمیت وافادیت کا بیان بڑی کثرت سے کیا ہے۔لب ورخسار اور ہجر ووصال کی باتیں نہایت ہی مہذب اور شائستہ لہجے میں بیان کیا ہے۔انسانی زندگی اور مسائل اپنے حقیقی انداز میں ان کی غزلوں میں نظر آتے ہیں۔

ان کی غزلیں تاریخی حقائق ،جدید تعلیمی نظریات کی آگاہی اور بین الاقوامی افکار ونظریات کی جستجو کی غماز ہیں۔اس ضمن میں عبرت مچھلی شہری لکھتے ہیں:

''ان کی بیشتر غزلیں ان کی نثر کی فکری محور پر گھومتی ہیں۔ان کے زیادہ تر شعروں میں جدید تعلیمی نظریات کے عکس جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔یہ بات قابل غور ہے کہ ان کی غزلوں میں عشق وحسن اور گل وبلبل کی داستان سرائی کے بجائے علم وعمل ،سائنس اور حکمت کی جلوہ طرازیاں ہیں۔''

نسیم اعظمی نہ صرف عملی طور پر قوم وملت کی تعلیم کے تئیں بے انتہا فکرمند رہتے ہیں بلکہ اپنی شاعری میں جا بجا اس بات کا ذکر بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے اندر ایک جذبہ کارفرما ہے جس کے ذریعہ وہ تمام مسلمانوں کو ان کے ماضی کے علم کی یاد دلا کر ان کے تعلیمی شعور کو بیدار کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

تازہ نسلوں کو نئے علم سکھا کر دیکھو
اب بھی پوشیدہ ہیں اس قوم میں جوہر کتنے

***

فروغ علم و حکمت سے عروج قوم ملت ہے
یہی تقدیر ہے جاناں یہی تدبیر ہے جاناں

***

پھر لوٹ تو سائنس اور تعلیم کی جانب
گر اپنی ترقی کا طلب گار بہت ہے

ان اشعار کے ذریعہ یہی علم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی قوم کے لیے کتنا درد اور ہمدردی ہے۔انھوں نے نہ صرف فرزندان قوم کو جدید تعلیم اور ٹکنالوجی کی طرف مائل کرنے کی حتی المقدور کوششیں کرتے ہیں بلکہ اپنی شاعری کے ذریعہ تعلیم کی اہمیت وافادیت کواجاگر کرتے ہیں۔نسیم اعظمی لکھتے ہیں۔

جوعلم وفن سے رہے گا عاری سائنس وتکنک سے دور ہوگا
وہ کاروبار جہان نو میں سدا یونہی کم عیار ہوگا

***

یہ علم وحکمت یہ لعل وگوہر یہ گمشدہ ہیں متاع مومن
انھیں کو پا کے جہاں میں پھر سے تمہارا عزو وقار

نسیم اعظمی کا کلام پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ شاعر ہیں۔ان کے یہاں اظہار کی پختگی،کلاسیکی رچاؤ،گہری دردمندی،جذبات کی فراوانی اور شدت احساس نمایاں ہے۔انھوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے مثلاً تعلیمی،سماجی،تہذیبی،عشقیہ تمام موضوعات ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔

چوتھے باب میں نسیم اعظمی کی تعلیمی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں تعلیم کے معنی ومفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی تعلیمی خدمات کا تفصیل سے احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نسیم اعظمی ان محبان تعلیم میں سے ہیں جو مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے تدارک میں ہمیشہ ہمہ تن مشغول عمل رہے ہیں اور تعلیم جیسے اہم موضوع پر سات کتابیں لکھ کر ملت کے تئیں ہمدردانہ اور مشفقانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔انھوں نے عصری تعلیم ، جدید وتکنیکی و پروفیشنل کورسیز،ملک اور بیرون ملک کے اداروں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ کی شرطیں،تعلیم کی تکمیل کے بعد روزگار کیریئر کے امکانات ومواقع جیسے اہم نقطوں پر زیادہ توجہ مبذول کرائی ہیں۔تعلیمی موضوعات کے سلسلے میں ایس ایم عباس لکھتے ہیں:

''تعلیمی موضوعات کے سلسلے میں ایم نسیم اعظمی ایک شخص یا شخصیت نہیں

بلکہ ایک ادارہ ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔کون سا مضمون
کس یونیورسٹی میں ہے کہاں کیا سہولتیں ہیں کورس کی نوعیت اور مدت
تعلیم کیا ہے اور ہمیں اس کے لیے کیا کرنا ہے آپ یہ ساری معلومات
ان سے حاصل کر لیجیے۔''

یوں تو نسیم اعظمی ایک اچھے نقاد، خوش گو شاعر اور قلم کار ہیں وہیں دوسری طرف ان کی زندگی کے کار ہائے نمایاں پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ جو کام کیا وہ تعلیم کے میدان میں ہے، انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے تعلیم کے سلسلے میں نہ صرف قیمتی مشورے دیے ہیں بلکہ ان کو بروئے کار لانے کے گر بھی سکھائے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہماری قوم آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں دیگر ترقی یافتہ قوموں کے مقابل خود اعتمادی سے کھڑی ہو سکے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہو سکے۔

نسیم اعظمی کی تحقیق وتنقید پر پانچواں باب ہے، اس باب میں ان کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ انھوں نے تحقیق کے فن میں طبع آزمائی کرتے ہوئے پوری ایمانداری اور غیر جانب داری کا رویہ اختیار کیا ہے۔ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فارسی پر اچھی خاصی گرفت تو ہے ہی ساتھ ہی عربی پر بھی عبور حاصل ہے۔اودھی زبان سے بھی قدر واقف ہیں۔انھیں عہد متعلقہ کے تاریخی، معاشی ومعاشرتی حالات سے بھی واقفیت حاصل ہے۔

نسیم اعظمی حق گو ہیں۔وہ حق بات بولنے سے کتراتے نہیں۔تعصب اور صلہ وستائش سے وہ کوسوں دور ہیں۔غرض یہ کہ ایک اچھے محقق کے جتنے بھی اوصاف ہونے چاہیے تقریباً ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

نسیم اعظمی نے مشرقی اور مغربی تنقید کے سبھی دبستانوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور تنقید کے میدان میں اب تک ان کی تین تصانیف ''نقد سخن''''اردو کے چند فکشن نگار: تنقید وتجزیہ'' اور ''اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید وتجزیہ'' اہمیت کی حامل ہیں۔وہ تنقید کے اصولوں سے شعر وادب کی جانچ پرکھ کرتے ہیں مگر کسی مخصوص ادبی نظریے یا گروہ کے پابند ہوئے بغیر غیر جانب داری سے ادبی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں اور بغیر کسی تعصب وتنگ نظری کے متوازن طریقہ سے فن پارے کو جانچتے اور پرکھتے ہیں۔

نسیم اعظمی نے عمومی تنقیدی ڈگر سے ہٹ کر ان شخصیات پر تنقید لکھی جن کے یہاں عمدہ اور

پختہ افکار وخیالات ہیں۔اس ضمن میں ''حقانی القاسمی'' نے اپنے مضمون ''ایم نسیم اعظمی کی میزان نقد میں مئو کے معاصرین'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے:

''ایم نسیم اعظمی نے عمومی تنقیدی ڈگر سے ہٹ کران شخصیات پر تنقید لکھی ہے جن کے یہاں اور یجنل افکار وخیالات ہیں، ماخوذ ومستعار نہیں اور جو نام نہاد تحریکات کے دائروں میں اسیر نہیں ہیں۔جن کے پاس خودی بھی ہے اور خدا بھی ہے۔ایم نسیم اعظمی کی بیشتر تنقیدی تحریروں میں بڑی شخصیات کے ساتھ وہ حاشیائی افراد بھی ہیں جن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔''

بحیثیت صحافی بھی نسیم اعظمی نے کام کیا ہے۔آخری باب ان کی صحافت نگاری سے متعلق ہے جس میں ان کی صحافتی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے ان کا عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ کا عمومی اشاریہ پیش کیا گیا ہے۔

صحافت نگاری کے میدان میں انھوں نے اس وقت قدم رکھا تھا جب ان کی عمر صرف سترہ برس تھی۔چونکہ دوران تعلیم نصابی کتب کے علاوہ اپنے ذوق وشوق کے مطابق جی بھر کر علمی وادبی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا انھوں نے اپنے آپ کو عادی بنا لیا تھا جس کی وجہ سے ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں ہی ''نکھار'' نامی ایک قلمی ماہنامہ 1975ء میں نکالنا شروع کیا جو تین شماروں تک قلمی رسالہ رہا۔1977ء میں یہ رسالہ رجسٹرڈ ہوا اور اس کا نام بدل کر ادب نکھار رکھا گیا۔یہ رسالہ رجسٹرڈ ہونے کے بعد ترقی کرتا گیا اور پورے ہندوستان میں اس کے قارئین اور قلم کاروں کا ایک حلقہ قائم ہوگیا۔چودہ برسوں تک دنیائے شعروادب کی خدمت کرنے کے بعد 1989ء میں اس ماہ نامہ نے ہفت روزہ ادب نکھار کی شکل اختیار کرلی۔نیز نسیم اعظمی نے اس رسالہ کی کامیابی کے لیے بڑی محنت کی۔1991ء میں یہ ہفت روزہ ادب نکھار ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گیا مگر اپنے حوصلہ مند ایڈیٹر کو حیات جاودانی بخش گیا کہ تاہنوز وہ ادب کی دنیا میں متعارف ہیں۔ڈاکٹر شفیق اعظمی نے ''ادب نکھار'' کو اردو کے اچھے ادبی رسالوں میں شمار کیا ہے:

''ادب نکھار کا شمار اردو کے اچھے ادبی رسالوں میں ہوتا تھا۔کسی وجہ سے
اب وہ بند ہو چکا ہے،لیکن اردو کے ادبی رسالوں کا ذکر جب بھی کہیں
بھی ہوگا تو اسے ضرور یاد کیا جائے گا۔''

ادب نکھار کے انیس سال بعد 2010ء میں انھوں نے ایک عالمی اردو مجلّہ ''ادبی گزٹ'' کا اجراء کیا جو 2016ء تک جاری رہا، یہ عالمی اردو مجلّہ تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔اس کے کل سات شمارے منظر عام پر آئے۔عالمی پیمانے پر''ادبی گزٹ'' نے اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم کر لی تھی اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو قلم کاروں کو اس کا تعاون بھی حاصل تھا۔اس عالمی اردو مجلّہ کے بند ہونے کا سبب ان کی طبیعت کی خرابی تھی، ان کا ایک گردہ خراب ہو گیا تھا اور داکٹروں کے مشورہ پر انھیں ایک گردہ نکلوانہ پڑ گیا، جس کے سبب وہ''ادبی گزٹ'' پر زیادہ توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔

نسیم اعظمی چوں کہ بیمار رہنے لگے تھے لیکن اس بیماری کے عالم میں بھی انھیں ایک اور رسالہ نکالنے کی خواہش ہوئی لیکن خود وہ کام نہیں کر سکتے تھے اس لیے 2017ء میں ان کی زیرنگرانی میں ان کی بیٹی عدیلہ نسیم اور شاگرد ظہیر حسن ظہیر نے سہ ماہی رسالہ ''تخلیق وتنقید'' کا اجراء کیا، حالانکہ نسیم اعظمی کی زندگی نے ان کا ساتھ نہیں دیا وہ اس دنیا سے رحلت کر گئے لیکن یہ رسالہ آج بھی ان کی بیٹی نکال رہی ہیں۔

مجموعی حیثیت سے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کثیر الجہات شخصیت کے حامل ہیں۔وہ تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی اورصحافتی میدان کے علاوہ تدریسی، انتظامی، اور سماجی میدانوں کے شہسوار بھی رہے ہیں۔ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی انھوں نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ناقدانہ بصیرت، ادبی فنی اور عصری آگہی، وسیع مطالعہ، ادبی ذوق، تحقیقی لگن وجستجو سے انھوں نے کئی کتابیں لکھیں، ان کی ان خدمات کے پیش نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی خاموش و بے لوث خدمات کے ذریعہ اردو ادب کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

*****

کتابیات

کتابیات

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تصانیف

نمبر شمار	مصنف/مرتب	نام کتاب	ناشر/مطبع	سنہ اشاعت
1	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	آثر انصاری فکر و فن کے آئینے میں	نکھار پبلی کیشنز، ڈومن پورہ۔ مئوناتھ بھنجن	1998ء
2	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	نوائے سروش	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2001ء
3	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	تعلیمی تجزیے	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2002ء
4	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	تعلیمی جہات	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2006ء
5	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	آثر انصاری حیات اور خدمات	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2007ء
6	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2008ء
7	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	نقد سخن	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2010ء
8	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	میزان آگہی	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2011ء

9	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	تعلیم اور تعلیمی افکار	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2011ء
10	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	آثر انصاری پر چند تحریریں	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2011ء
11	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	تعلیمی نکات	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2013ء
12	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	تعلیمی اشارات	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2014ء
13	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2015ء
14	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	راجا رام موہن رائے اور ان کے تحریکی و تعلیمی کارنامے	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2016ء
15	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	فیضان آگہی	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2016ء
16	ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر	اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزیہ	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2017ء

دیگر تصانیف

نمبر شمار	مصنف/مرتب	نام کتاب	ناشر/مطبع	سنہ اشاعت
1	آفاق ندیم خاں ڈاکٹر سید معاذ حسین	تعلیمی نفسیات کے پہلو	ایم. کے. آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2015ء
2	آل احمد سرور، پروفیسر	اردو فکشن	لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ	1973ء

3	آل احمد سرور، پروفیسر	تنقید کیا ہے	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	1984ء
4	ابوالحسن علی الندوی، مولانا	کاروان زندگی	مکتبہ اسلام لکھنؤ	1997ء
5	اسامہ ارشاد معروفی قاسمی	اردو شاعری کے معتبر چہرے	ادارۂ فروغ اردو، پورہ معروف، مئو	2018ء
6	الطاف حسین حالی، مولانا	مسدس حالی	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	1995ء
7	الطاف حسین حالی، مولانا	مقدمہ شعر وشاعری	نیشنل پریس الہ آباد	1955ء
8	ساجد جمال عبدالرحیم، پروفیسر	ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم	شپرا پبلی کیشنز، دہلی	2012ء
9	شارب رودولوی	جدید اردو تنقید: اصول ونظریات	یوپی اردو اکادمی	1981ء
10	شکیل احمد، ڈاکٹر	مئو شہر ہنرواں	مکتبہ الفہیم مئوناتھ بھنجن یوپی	2012ء
11	ظہیر حسن ظہیر	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی شخصیت اور جہات	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن	2015ء
12	عبادت بریلوی، ڈاکٹر	تنقیدی زاویے	چمن بک ڈپو اردو بازار، دہلی	1949ء
13	عبدالرزاق قریشی	مبادیات تحقیق	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی	2014ء
14	قمر سلیم محمد	اشاریہ دلگداز	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2003ء
15	کلیم الدین احمد، پروفیسر	اردو شاعری پر ایک نظر	ایوان اردو، پٹنہ	1964ء
16	گیان چند، ڈاکٹر	تحقیق کا فن	عفیف پرنٹرس، دہلی	2014ء
17	محمد الیاس الاعظمی، ڈاکٹر	شبلی اور جہان شبلی	اصیلہ پریس، دہلی	2015ء

18	محمد بن محمد غزالی شافعی،	احیاء العلوم، پیش کش: مجلس المدینۃ العلمیہ (شعبہ تراجم کتب)	مکتبۃ المدینہ باب المدینہ کراچی	2012ء
19	محمد اقبال، علامہ	کلیات اقبال	فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ	2004ء
20	محی الدین زور کشمیری	روداد اردو	ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری R/O دار الادب	2011ء
21	نور الحسن نقوی، پروفیسر	فن تنقید اور اردو تنقید نگاری	ایم. کے. آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	2013ء

لغات اور انسائیکلوپیڈیا

اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد دوم)	دہلی	2010ء
اردو انسائیکلوپیڈیا	لاہور	1984ء
اردو لغت (تاریخی اصول پر)	کراچی	1977ء
فیروز اللغات، مرتب مولوی فیروز الدین	دہلی	2006ء
فرہنگ ادبیات، مرتب سلیم شہزاد	مالیگاؤں	1998ء
فرہنگ ادبی اصطلاحات، پروفیسر کلیم الدین احمد	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	1996ء

رسائل

ماہنامہ، اردو دنیا، دہلی	دسمبر	2019ء
ماہنامہ، ایوان اردو، دہلی	جنوری	2020ء
عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ	جنوری	2011ء
عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ	جنوری	2012ء
عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ	جنوری	2015ء
ماہنامہ، ادب نکھار، مئوناتھ بھنجن	جولائی	1977ء
سہ ماہی، تخلیق و تحقیق (مئوناتھ بھنجن)	اکتوبر تا دسمبر	2018ء
ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	ستمبر	2017ء

*****